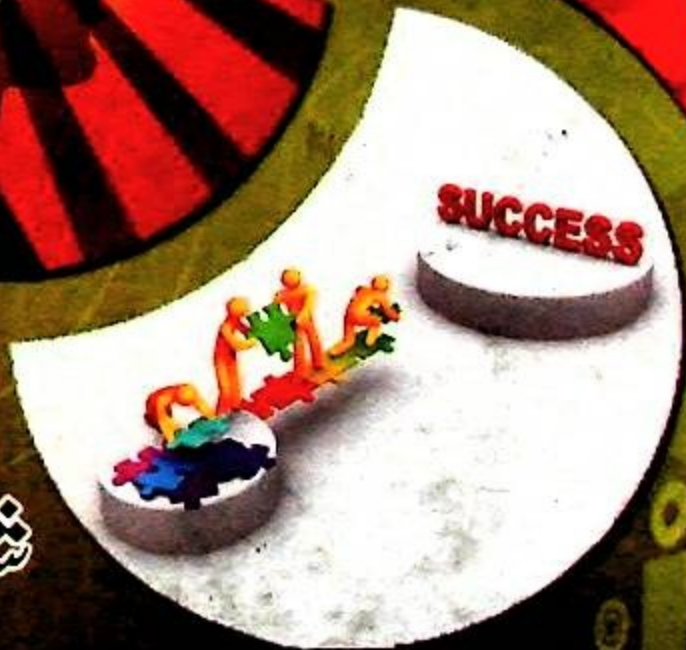


کامیاب لوگوں کی خصوصی عادات

(اسلام اور علم نفسیات کی روشنی میں)

www.KitaboSunnat.com



شفقت علی شیخ

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس
پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 library@mohaddis.com

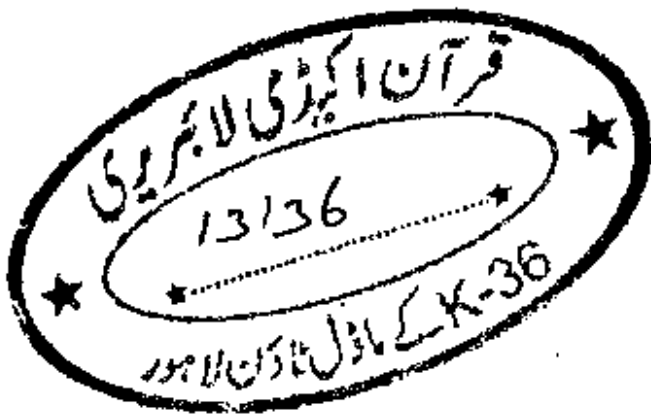
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کامیاب لوگوں کی خصوصی عادات

(اسلام اور علم نفسیات کی روشنی میں)

شفاقت علی شیخ

www.kitabosunnat.com



علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 37352332-37232336

13136

216.158
شماره 555

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	کامیاب لوگوں کی خصوصی عادات
مصنف	شفاقت علی شیخ
ناشر	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	اولیس احمد
نظر ثانی	پروفیسر عابد اسلام (دی یونیورسٹی آف لاہور)
سن اشاعت	اپریل 2015ء
قیمت	600/= روپے

بہترین کتاب چھپوانے کیلئے رابطہ کریں: 0300-9450911



اولیٰ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

کائنات کی سب سے بڑی
اور سب سے کامیاب شخصیت حضور
سید عالم ﷺ کے نام جن کی ذات سے
تعلق حقیقی کامیابی کی ضمانت ہے۔

شفاقت علی شیخ

اظہارِ شکر

سب سے پہلا شکر اللہ جل مجدہ کے لیے ہے جس نے زبان میں گویائی، آنکھوں میں بصارت، کانوں میں سماعت، دماغ میں خیالات اور قلم میں روانی عطا فرمائی اور جس کے لطف و کرم سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔

من لم يشكر الناس لم يشكر الله.

محترم ڈاکٹر علی اکبر الازہری صاحب کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں جن کی مسلسل حوصلہ افزائی اور بھرپور تعاون کے نتیجے میں قلم رواں دواں رہا اور جن کی قیمتی آراء اور مشورہ جات قدم قدم پر رہنمائی کرتے رہے۔ اور جن کو اس کام کی تکمیل کی مجھ سے زیادہ فکر تھی۔

محترم ڈاکٹر خالد ندیم صاحب (شعبہ اُردو سرگودھا یونیورسٹی) کا بہت شکریہ کہ جن سے اس حوالے سے تعاون کے لیے جب بھی رجوع کیا انہوں نے اس محبت، مروت اور خلوص کا مظاہرہ کیا کہ گویا میں تعاون حاصل کر کے ان پر کوئی احسان کر رہا ہوں۔

ان تمام اساتذہ اور مصنفین و مولفین کا شکریہ جن سے زندگی کے مختلف مراحل میں بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اور اس کام کی تکمیل میں جن کی تحریروں، تقریروں اور مشوروں سے استفادہ کیا۔ اپنے والدین، بہن بھائیوں، بیوی، بچوں، عزیز واقارب اور دوست و احباب کا شکریہ جن کی محبتوں، شفقتوں، ہمدردیوں اور پر خلوص تعاون نے قدم قدم پر سہارا دیا۔

اپنے جملہ معاونین بالخصوص محمد شفیق، عرفان شہزاد، راشد علی، حافظ محمد احمد، سلمان شہزاد، ڈاکٹر یاسر عرفان، شیخ صداقت علی، نجم الثاقب، محمد یوسف منہاجین، محمد ظلیق عامر، محمد اشفاق، محمد یامین اور راؤ آصف حبیب صاحب (منڈھیال بک ڈپو والے) کا بہت بہت شکریہ جنہوں نے کمپوزنگ، پرنٹنگ اور کمپیوٹر ورک کے سلسلے میں مکمل معاونت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاہ ہے کہ وہ ان تمام احباب کو اپنی رحمتِ واسعہ سے جزائے کاملہ عطا فرمائے اور ان کی کوششوں اور کاوشوں کو صدقہ جاریہ بنائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وصحبہ وسلم

شفاقت علی شیخ

فہرست

صفحہ نمبر	عنوانات
11	تقریظ ❁
14	پیش لفظ ❁
15	مقدمہ ❁
28	<u>باب اول:</u> ❁

ذاتی فتح کے اصول

29	فصل اول: ذمہ داری قبول کرنا ❁
29	1- عادت کی تعریف
30	2- عادت کی اہمیت
31	3- پہلی عادت کا مفہوم
32	4- محرک اور ردِ عمل کے درمیان چنناؤ کی آزادی
37	5- افراد کی دو اقسام
44	6- مسئلہ جبر و قدر
45	7- چار اثاثہ جات
48	8- مسائل کی تین اقسام
61	9- توکل کی حقیقت
64	10- ذمہ دار اور غیر ذمہ دار لوگوں میں فرق

- 65 11۔ عملی مشورہ جات
- 72 **فصل دوم: انجام پر نظر رکھنا**
- 74 1۔ دوسری عادت کا مفہوم
- 75 2۔ دوسری عادت کا اطلاق
- 78 3۔ اعمال اور نتائج کا تلازم
- 80 4۔ تمام چیزیں دوبار تخلیق کی جاتی ہیں
- 82 5۔ پہلی اور دوسری عادت کا باہمی تعلق
- 84 6۔ نصب العین پر مشتمل تحریر کیسے لکھی جائے؟
- 87 7۔ زاویہ نگاہ کی اہمیت
- 88 8۔ زندگی کے عناصر اربعہ
- 92 9۔ زندگی کے چند عمومی مراکز
- 100 10۔ عمومی مراکز کی خامیاں
- 107 11۔ حقیقی نصب العین کے فوائد
- 111 12۔ نصب العین کے حصول کا طریقہ
- 112 13۔ عبادت کا جامع مفہوم
- 115 14۔ اقدار حیات کا تعین
- 124 15۔ عملی مشورہ جات
- 130 **فصل سوم: ترجیحات کا تعین کرنا**
- 131 1۔ تیسری عادت کا مفہوم

- 132 2۔ وقت کی اہمیت
- 137 3۔ وقت کی تنظیم کا چارٹ
- 147 4۔ جرات مندی کا حلقہ
- 152 5۔ دوسرے خانے کے مطابق خود انتظامی
- 154 6۔ تنظیم الاوقات کے تین بنیادی ضابطے
- 156 7۔ عملی مشورہ جات

باب دوم:



عوامی فتح کے اصول

- 160 فصل اول: جیتنا اور جیتنے دینا
- 160 1۔ اندر سے باہر کی طرف
- 166 2۔ جذباتی اکاؤنٹ
- 168 3۔ جذباتی اکاؤنٹ کے اہم ڈیپازٹس
- 177 4۔ چوتھی عادت کا مفہوم
- 178 5۔ معاشرتی زندگی کے عمومی رویہ جات
- 181 6۔ بہترین رویہ کون سا ہے؟
- 183 7۔ جیت/جیت کا رویہ کیا ہے؟
- 184 8۔ جیت/جیت یا ”کوئی معاہدہ نہیں“ (No Deal)
- 185 9۔ جیت/جیت والی سوچ کیسے اپنائی جائے؟
- 189 10۔ خلاصہ کام

- 190 . 11۔ عملی مشورہ جات
- 194 فصل دوم: پہلے سمجھنا پھر سمجھانا
- 194 1۔ پانچویں عادت کا مفہوم
- 196 2۔ پانچویں عادت کا اہم تقاضا
- 196 3۔ سمجھ اور ادراک
- 197 4۔ ابلاغ کی اقسام
- 198 5۔ سننے کے ناقص انداز
- 201 6۔ تین اقسام کے ردِ عمل
- 202 7۔ حقیقی سماعت..... ہم نفس سماعت
- 208 8۔ ہم نفس سماعت کے تین تقاضے
- 210 9۔ ہم نفس سماعت کے فوائد
- 213 10۔ چند اشکالات اور ان کے جوابات
- 214 11۔ پھر سمجھائیں
- 216 12۔ فنِ گفتگو کے لوازمات
- 221 13۔ پانچویں عادت اور قدیم یونانی حکمت
- 224 14۔ تعلقات کی بحالی۔۔۔۔ اولین ترجیح
- 225 15۔ پانچویں عادت کی اہمیت
- 225 16۔ حرفِ آخر
- 226 17۔ عملی مشورہ جات

230	فصل سوم: تعاون کا اصول اپنانا	❁
230	1۔ چھٹی عادت کا مفہوم	
232	2۔ تعاون..... فطرت کا اہم اصول	
233	3۔ تعاون کی دو اقسام	
234	4۔ تخلیقی تعاون کیا ہے؟	
235	5۔ تعاون اور اسلام	
238	6۔ تعاون کے تقاضے	
250	7۔ تعاون کا مقصود..... بلند راستے کی تلاش	
252	8۔ تعاون کا عملی منصوبہ	
255	9۔ عملی مشورہ جات	

باب سوم:



باکمال زندگی کے اصول

259	فصل اول: صلاحیتوں کی تجدید کرنا	❁
259	1۔ ساتویں عادت کیا ہے؟	
261	2۔ پیداوار اور پیداواری صلاحیت میں توازن	
262	3۔ ساتویں عادت کا مفہوم	
263	4۔ ساتویں عادت کی اہمیت	
264	5۔ تجدید کے چار پہلو	
266	6۔ تجدید میں توازن	

269

7۔ متوازن تجدید کے اصول

295

8۔ عملی مشورہ جات

301

فصل دوم: فکری گمراہیوں کا علاج

304

1۔ فکر سلیم کے حصول کا سہ نکاتی لائحہ عمل

328

2۔ خلاصہ کلام

332

فصل سوم: عملی گمراہیوں کا علاج

336

1۔ ضبطِ نفس کے حصول کا سہ نکاتی لائحہ عمل

354

2۔ خلاصہ کلام

257

اطراف الآیات

365

اطراف الاحادیث

371

مصادر و مراجع



تقریظ

اللہ رب العزت نے انسان کے سر پر اپنی خلافت و نیابت کا تاج رکھ کر ایک طرف اُسے تمام مخلوقات پر برتری اور فضیلت عطا فرمائی اور دوسری طرف کائنات اور اُس کی جملہ طاقتوں کو انسان کے لئے مسخر کر دیا۔ لیکن اس تسخیری صلاحیت کو حقیقت کے روپ میں دھارنے کے لئے حصولِ علم اور غور و فکر کو شرط قرار دیا۔ مغربی قوموں نے اس راز کو سمجھ کر کائنات کی ہر چیز میں غور و فکر کرنا شروع کیا جس کے نتیجے میں فطرت کے سر بستہ راز اُن پر آشکار ہونا شروع ہوئے اور آج وہ لوگ سائنسی ایجادات کی بدولت ستاروں پر کسندیں ڈال رہے ہیں، پہاڑوں کا جگر کاٹ رہے ہیں، پھرے ہوئے سمندروں اور طوفانوں کا رخ موڑ رہے ہیں اور زمین کا سینہ چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں کو نکال رہے ہیں۔ الغرض وہ ترقی کے سفر میں ان تمام چیزوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال میں لا رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں بالعموم غور و فکر سے کام نہیں لیا جاتا جس کی وجہ سے اُمتِ مسلمہ فکری افلاس اور ذہنی بانچھ پن کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور ہر میدان میں غیر مسلموں کی در یوزہ گری کر رہی ہے۔

ترقی یافتہ قوموں نے صرف سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہی غور و فکر نہیں کیا بلکہ ہر معاملے کی تہہ میں اتر کر اس کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں خود انسانی شخصیت کے مختلف گوشوں اور شاہراہ حیات پر چلتے ہوئے کامیابی و کامرانی کے حصول کے اصولوں پر بھی کچھ لکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر Self Help کے نام سے دلچسپ کتابوں کا ایک سلسلہ ہے جو عوام میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ تحریر کی مقبولیت اور لوگوں میں دلچسپی کا عالم یہ ہے کہ مغرب میں اس حوالے سے دھڑا دھڑ کتابیں چھپ رہی ہیں اور تقریباً اسی رفتار سے ان کتابوں کے اردو تراجم بھی ہو رہے ہیں جن میں زندگی کے اہم گوشوں کی اصلاح سے متعلق مفید معلومات درج ہوتی ہیں۔

اسی سلسلہ تحریر کی ایک اہم کڑی ”سٹیفن آرکووے“ (Stephen R. Covey) کی کتاب

(The Seven Habits of Highly Effective People) ہے۔ یہ کتاب اپنے مندرجات کی دلچسپی اور اہمیت کے سبب مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر چکی ہے۔ جس کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے کامیاب اور موثر زندگی کی چند بنیادی عادات کو بیان کیا ہے جو بلا استثنا دنیا کے تمام موثر لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ کتاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسانی فطرت کے ایسے گوشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جن کو سمجھ کر زندگی میں انتہائی خوشگوار تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہمارے ہاں لوگوں کی اکثریت بالعموم کامیابی کے اسی مغربی تصور کو اپنائے ہوئے ہے جس کے تحت جو شخص جتنے زیادہ مادی فوائد و ثمرات اور مال و دولت کو اپنے ارد گرد جمع کر لے وہ اتنا ہی کامیاب سمجھا جاتا ہے اور جو ان چیزوں سے جتنی محروم ہو وہ اتنا ہی ناکام و نامراد تصور کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور مغرب کے درمیان پائے جانے والے دیگر اختلافات میں سے ایک نمایاں فرق کامیاب زندگی کے مقاصد اور کامیابی کے معیار کا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے کامیاب زندگی وہ ہے جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی مسرتیں حسین توازن کے ساتھ حاصل ہو جائیں۔ چنانچہ آرکوعے کی کتاب کو اسلامی تعلیمات کے اضافوں سے مزید با مقصد بنانے کی اشد ضرورت تھی جس کو عزیز القدر شفاقت علی شیخ نے احسن انداز میں پورا کیا۔

شفاقت علی شیخ جو ہمارے پاس (یونیورسٹی آف لاہور، شعبہ اسلامیات میں) Ph-D کے ریسرچ کالر ہیں اور اسی ادارے میں استاد بھی ہیں۔ علم نفسیات اور اخلاقیات ان کا خاص موضوع ہے۔ وہ خطیب جمعہ کے طور پر عملاً ایک مبلغ بھی ہیں اور گذشتہ 20 سال سے ممبر رسول ﷺ سے اظہار مافی الضمیر کر رہے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایک سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے والا دماغ اور حساس دل دیا ہے۔ دل و دماغ کی ان مثبت صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ نوجوان نسل کی معاصر تقاضوں کے مطابق تربیت کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے لائف مینجمنٹ کلب (Life Management Club) کے نام سے ایک فورم بنا رکھا ہے جہاں محدود پیمانے پر تربیت کا عمل مسلسل جاری ہے۔

ان ساری علمی فکری اور ابلاغی صلاحیتوں کے ساتھ جب وہ میرے پاس آئے تو میں نے ان کے اندر کا جو ہر دریانت کرتے ہوئے ”الحکمة ضالة المومن“ کے تحت سٹیفن آرکوعے کی کتاب کو

اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کا مشن اُن کے سپرد کیا۔ میرے کہنے پر انہوں نے ایک دلچسپ سلسلہ تحریر شروع کیا قارئین کی طرف سے جس کا فیڈ بیک بھی بہت حوصلہ افزاء تھا۔ چنانچہ ہم نے ان کے اس دلچسپ موضوع کو اسکے ایم فل کے تحقیقی مقالے کے لئے منظور کر لیا۔ انہوں نے اپنی اس ایک سالہ تحقیقی کاوش کے نتیجے میں اپنا ایم فل کا مقالہ بھی مکمل کر لیا اور اس کتاب کا ابتدائی مسودہ بھی تیار ہو گیا۔ یقیناً یہ روایتی تحقیقی مقالہ جات سے بالکل مختلف کام ہے۔

موصوف نے خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اس کتاب کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اور نہایت کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ کامیاب زندگی کا کوئی ایک اصول بھی ایسا نہیں ہے جس کا ذکر قرآن و حدیث میں کسی نہ کسی انداز میں نہ کیا گیا ہو۔ اُن کی یہ کاوش ایک طرف تو ان نوجوانوں کے لئے جو مغرب سے بہت زیادہ مرعوب ہو کر اپنی تہذیب و تمدن کے حوالے سے احساس کمتری کا شکار ہیں، ان کے لئے ایک امید کی کرن ہے اور ان کے یقین و ایمان میں اضافے کا باعث بننے والی ہے اور دوسری طرف یہ قدیم اور جدید کو ملانے کا ذریعہ بالفاظِ دیگر دانشِ رحمان اور دانشِ انسان کا ایک خوبصورت سنگم ہے جس میں مذہبی اور سیکولر ذہن رکھنے والے تمام لوگوں کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

موصوف اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں تاہم راقم الحروف اس منفرد اور اچھوتی کوشش پر مصنف کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے اس دعا کے ساتھ کہ ع

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ڈاکٹر علی اکبر الازہری

صدر شعبہ علوم اسلامیہ

یونیورسٹی آف لاہور، لاہور

25-2-2015

پیش لفظ

زیر نظر کتاب راقم الحروف کا ایم فیل کا مقالہ ہے جسے معمولی تبدیلی کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مقالہ کو لکھتے وقت ہی یہ بات پیش نظر تھی کہ اسے بعد ازاں کتابی شکل میں شائع کرنا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت زبان کو سلیس اور سادہ رکھا گیا۔ ثقیل الفاظ اور مشکل اصلاحات کے استعمال سے اسے خواجواد بچھل نہیں بنایا گیا۔

مقالہ کی تیاری کے دوران ہی نگران مقالہ محترم ڈاکٹر علی اکبر الازہری صاحب (چیف ایڈیٹر ماہنامہ منہاج القرآن) نے اس کے بعض حصوں کو ماہنامہ منہاج القرآن میں بالاقساط چھاپنا شروع کر دیا جس کے بہت شاندار نتائج ملے۔ مختلف قارئین نے ٹیلیفون اور E-MAILS کے ذریعے اسے سراہا اور بقیہ اقساط کو پڑھنے کے حوالے سے تجسس کا اظہار کیا۔ اللہ رب العزت کا شکر ہے جس کی توفیق سے ان کی خواہش پایہ تکمیل تک پہنچ رہی ہے۔

انسان بہر حال خطاؤں کا پتلا ہے اس کی کوئی کوشش بھی حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ بہتری اور اصلاح کی گنجائش بہر صورت موجود رہتی ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ جہاں کہیں کوئی کمی، خامی یا کوتاہی محسوس کریں یا جہاں بہتری کی تجویز ان کے ذہن میں ہو تو ضرور آگاہ فرمائیں۔ آپ کی طرف سے آنے والی ہر مثبت تجویز کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔

کتاب کی تیاری کے تمام مراحل میں جن جن لوگوں کا تعاون جس جس رنگ میں بھی شامل حال رہا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس تحریر کو میرے لیے اور جملہ متعلقین و معاونین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

شفاقت علی شیخ

Shafaqatali0033@gmail.com

مقدمہ

موضوع کا تعارف

اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجتے وقت ارشاد فرمایا تھا:

فَإِنَّمَا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١﴾

”پس بیشک میری طرف سے ہدایت آئے گی۔ جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا اُس پر کوئی خوف اور غم نہیں ہوگا“

چنانچہ اس وعدۃ الہی کے مطابق ہر زمانے کے لوگوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے اللہ رب العزت کی طرف سے انبیاء و رسل آتے رہے جن میں سے بعض کے ساتھ آسمانی کتابیں اور صحائف بھی نازل کیے گئے۔ یہ سارے انبیاء و رسل اپنے اپنے زمانے کے لوگوں تک اللہ رب العزت کی طرف سے ہدایت کا پیغام پہنچاتے رہے یہاں تک کہ سلسلہ نبوت و رسالت کو منتہائے کمال تک پہنچانے کے لیے تاجدار کائنات اور امام الانبیاء حضور نبی کریم ﷺ خاتم النبیین اور رحمۃ العالمین کا تاج پہن کر جلوہ گر ہوئے۔ آپ ﷺ کے آنے کے بعد نبوت و رسالت کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

حضور غلیبہ السلام سے پہلے تشریف لانے والے تمام انبیاء کرام کی نبوتیں زمان و مکان کی پابندی تھیں۔ لہذا انہیں حالات کے مطابق تعلیمات و کمالات سے نوازا گیا لیکن آقائے دو جہاں ﷺ کی نبوت چونکہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماوراء ہے یعنی آپ ﷺ قیامت تک کے لیے ہر زمانے، قوم اور ہر علاقے کی طرف نبی مبعوث ہوئے ہیں چنانچہ آپ ﷺ کی ذات مبارکہ میں گذشتہ تمام انبیاء کرام کی تعلیمات و کمالات کو انتہائی جامعیت کے ساتھ جمع کرنے کے علاوہ آپ ﷺ کو بے شمار ایسے کمالات سے نوازا گیا جن کا کوئی دوسرا تصور بھی نہ کر سکا۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری (۲)

حضور ﷺ کو جو کتاب دی گئی اُس کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ بقول قرآن مجید:

لَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿٣﴾

”تری اور خشکی میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے واضح کتاب میں بیان نہ کر دیا گیا ہو۔“

نیز فرمایا:

مَا فَرَطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ. (۱)

”ہم نے اس کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی۔“

اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ

لَوْ ضَاعَ لِي عَقَالٌ بَعِيرٌ لَوْ جَدْتَهُ فِي كِتَابِ اللَّهِ. (۲)

”اگر میرے اونٹ کی ٹیل بھی گم ہو جاتی تو میں اُسے بھی قرآن میں تلاش کر لیتا۔“

اس کے ساتھ حضور ﷺ کو جو اُسوہ حسنہ اور سیرت مبارکہ دی گئی وہ بھی ہر لحاظ سے کامل اور جامع ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا۔

۶. لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (۳)

”بے شک تمہارے لیے اس رسول ﷺ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔“

لہذا اب قیامت تک کے لیے جو شخص بھی ہدایت و راہنمائی کا طلب گار ہو اُسے قرآن و سنت کی دہلیز پر آنا پڑے گا اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا۔

تَرَكَتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمْسُكْتُمَا بَهَمَا كِتَابِ اللَّهِ وَسُنَّةِ نَبِيِّهِ. (۴)

”بے شک میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں جب تک ان دونوں کو تھامے رکھو گے کبھی

گمراہ نہ ہو گے۔ اور یہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہیں۔“

دوسری طرف اللہ رب العزت نے انسان کو اپنی قدرتِ کاملہ کا شاہکار بناتے ہوئے اُسے بے شمار ظاہری و باطنی صلاحیتوں سے مالا مال فرمایا۔ اُسے ایک سوچنے والا دماغ اور دھڑکتا ہوا دل عطا فرمایا۔ اُسے غور و فکر کرنے کی منفرد صلاحیت عطا فرمائی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا کر حصولِ علم کے لامحدود دروازے کھول دیئے۔ فرشتوں کے مقابلے میں حضرت آدم علیہ السلام کی برتری کی بنیاد بھی علم کو ہی قرار دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ علمی ورثہ اگلی نسلوں کو منتقل ہوتا رہا اور ہر زمانے میں غور و فکر کے ذریعے سے اس ذخیرے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

(۱) الانعام ۳۸:۶ جلال الدین سیوطی، علامہ، الاقنان، ۱۲۶/۳

(۲) موطا امام مالک، رقم، ۱۵۹۳/۳، ۸۸۹

(۳) الانعام ۳۸:۶

(۴) البقرہ ۲:۱۲۹

میں غور و فکر کے ذریعے سے اس ذخیرے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

صدیوں پہلے انسان نے اللہ رب العزت کی دی ہوئی فطری صلاحیتوں کو استعمال میں لاتے ہوئے کائنات کے حقائق پر غور و فکر کرنا شروع کیا۔ کائنات کی تخلیق، اس کے مختلف مظاہر اور خود انسانی وجود کے حوالے سے بے شمار سوالات تھے جو انسان کو غور و فکر کی دعوت دے رہے تھے۔ انسان نے ان پر غور کرنا شروع کیا اور سوچ و بچار کے نتیجے میں نئے نئے علوم و فنون معرض وجود میں آتے گئے۔ پچھلی نسلوں کے تجربات و مشاہدات اگلی نسلوں کو منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ ہر آنے والے دن میں علم کے نئے نئے زاویے آشکار ہوتے چلے گئے۔ ان تمام انسانی کوششوں اور کاوشوں کے نتیجے میں جو علم معرض وجود میں آیا اسے سائنس کا نام دے دیا گیا۔

جیسے جیسے علم میں پھیلاؤ آیا تو پھر علم کی تقسیم (Classification) شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے علم کی سینکڑوں شاخیں (Branches) معرض وجود میں آگئیں ان شاخوں میں سے ہی ایک کا نام فلسفہ ہے جس کا مقصد بطور خاص حقائق حیات پر غور کرنا ہے۔ فلسفہ صدیوں تک زندگی کے حقائق پر غور و فکر کرتا رہا اور اپنی دانست میں حقائق کی گتھیوں کو سلجھاتا رہا۔ اس سفر میں بے شمار نشیب و فراز بھی آئے۔ ٹھوکریں بھی کھائیں مگر بہر حال فلسفے کا سفر جاری رہا۔ فلسفہ میں سے ہی چلتے چلتے علم کی ایک اور شاخ نکل آئی جس کا نام نفسیات رکھا گیا۔ علم نفسیات کا مقصد خاص طور پر انسانی شخصیت اور کردار کو زیر بحث لانا تھا تاکہ انسانی رویہ جات کو سمجھ کر شخصیت کی بہتری کے اصول وضع کیے جاسکیں۔

علم نفسیات کی تاریخ بحیثیت ایک علم اور سائنس کے تو بہت قدیم نہیں ہے تاہم دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو یہ علم اتنا ہی قدیم ہے جتنی خود یہ کائنات۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب سے کسی انسان نے اپنے متعلق سوچنا شروع کیا تب سے ہی یہ علم معرض وجود میں آ گیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس علم کی باقاعدہ شکل بنی، اس کے اندر وقتاً فوقتاً مختلف تجربات اور مشاہدات ہوتے رہے۔ نئی نئی تحقیقات اس کے ذخیرے میں اضافہ کرتی رہیں اور اب یہ علم اتنا پھیل چکا ہے کہ خود اس کے اندر کئی ضمنی شاخیں معرض وجود میں آچکی ہیں۔

معروف سائنس دان البرٹ آئن سٹائن کا ایک مشہور قول ہے

Science without religion is lame, religion without science is blind.(1)

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ سائنس کو اپنی تحقیقات آگے بڑھانے کے لیے مذہب کی بیساکھیوں کی ضرورت ہے کہ وحی کے ذریعے منکشف ہونے والے حقائق کو لے کر وہ اُس پر تجربات کر کے نئے نئے نتائج اخذ کرتی ہے۔ دوسری طرف مذہب کو آگے بڑھنے کے لیے سائنس کی ضرورت ہے کہ مذہب نے جو تھیوری پیش کی ہوتی ہے سائنس اُس کو عملی طور پر صحیح ثابت کر کے اُس کے لیے تقویت کا ذریعہ بنتی ہے۔

ضروری نہیں کہ ہم اس قول کے دوسرے حصے سے بھی کلیئاً اتفاق کر لیں۔ تاہم اتنی بات ماننی ہی پڑے گی کہ مذہب نے صدیوں پہلے جن حقائق کا انکشاف کیا تھا سائنس کی تحقیقات و ایجادات اُن کی تصدیق کرتی چلی جا رہی ہیں اور ہر آنے والا دن مذہب (بالخصوص دین اسلام) کی صداقت کو روزِ روشن کی طرح عیاں کرتا چلا جا رہا ہے۔ انسانی زندگی اور کائنات کے متعلق کتنی ہی باتیں ہیں جو قرآن مجید نے مدتوں پہلے بیان کر دیں۔ آج سائنس صدیوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُن تمام باتوں کو من و عن تسلیم کرتی چلی جا رہی ہے۔

یوں تو تمام علوم کا مذہب کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہے لیکن علمِ نفسیات کا تعلق مذہب کے ساتھ بطورِ خاص اس طرح ہے کہ مذہب کی تعلیمات کا مرکز و محور بھی انسان ہے کہ انسان کس طرح اپنی شخصیت کو بہتر بنا کر ترقی و عروج کی طرف جا سکتا ہے۔ دوسری طرف علمِ نفسیات کا موضوع بھی انسان ہی ہے کہ اُس کی سیرت و کردار اور رویہ جات کے اندر کس طرح بہتری لائی جا سکتی ہے۔ لیکن دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ایک طرف دانشِ رحمانی ہے جو ہر قسم کی غلطی و سہو سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی کے محدود مفادات سے آگے بڑھ کر آخری سعادت و فلاح کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ جب کہ دوسری طرف دانشِ انسانی ہے جس کے اندر غلطی و سہو کا امکان بھی پوری طرح موجود ہے اور جس کا مطمح نظر عموماً دنیوی زندگی کو بہتر انداز میں گزارنے تک محدود رہتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَةٌ الْمُؤْمِنِ اخْتِذْ مِنْ حَيْثُ وَجَدَ. (۱)

”حکمت کی بات مومن کی گمشدہ میراث ہوتی ہے۔ جہاں سے بھی اُسے ملتی ہے وہ لے لیتا ہے۔“

لیکن اس میں ایک شرط رکھی گئی ہے کہ

خدا صفا و دع ما کدر.

”جو صاف ہے وہ لے لو اور جو گدلا ہے اُسے چھوڑ دو“

صاف اور گدلے کو پرکھنے کا پیمانہ پھر مذہب کو ہی قرار دیا جائے گا جو چیز قرآن و حدیث کی کسوٹی پر پوری اترے گی اُسے قبول کر لیا جائے گا۔ اور جو چیز کسی بھی درجے میں متضاد ہوگی اُسے رد کر دیا جائے گا اگرچہ بظاہر دیکھنے میں کتنی ہی خوبصورت دکھائی دے۔

عربی زبان میں کہا جاتا ہے۔

کلام الملوک ملک الکلام.

”بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔“

اور بقول حضرت واصف علی واصفؑ

”حضور ﷺ کی بات پر کسی اور بات کو فوقیت دینا ایسے ہے جیسے شرک“ (۱)

لہذا اسلام اور ایمان اس چیز کا نام ہے کہ قرآن اور صاحب قرآن کی بارگاہ میں آکر اپنی عقل و فکر کے چراغوں کو بجھا دیا جائے۔ اور یہاں سے نلنے والی ہر چیز کو آنکھیں بند کر کے من و عن تسلیم کر لیا جائے۔ تاہم جب انسانی فکر ہزار ہا سال تک ٹھوکریں کھانے کے بعد ایسے نتیجے پر پہنچتی ہے جو نبوت کی بارگاہ سے صدیوں پہلے بیان ہو چکا ہوتا ہے تو ایمان میں مضبوطی کے ساتھ ساتھ ایمان کا لطف بھی دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب جس نکتے کو بیان کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ علم نفسیات کے اندر کچھلی چند دہائیوں میں Self Help کے حوالے سے کافی ساری کتابیں منظر عام پر آئی ہیں جن کا مقصد ان کتابوں میں دیئے گئے اصولوں کو استعمال کرتے ہوئے شخصیت کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ کامیابی و کامرانی کو حاصل کرنا ہے۔ اسی سلسلے میں امریکہ کے ایک مشہور و معروف مصنف ”سٹیفن آرکووے“ نے بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے۔

”Seven Habits of Highly Effective people“

”پڑ اثر لوگوں کی سات عادات۔“

”پڑا اثر لوگوں کی سات عادات۔“

چند ہی سالوں میں یہ کتاب دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر کروڑوں کی تعداد میں بک چکی ہے۔ ”نیو یارک ٹائمز“ نے اس کتاب کو بیسویں صدی کی دو اہم ترین کتابوں میں سے ایک قرار دیا۔ ”ٹائمز میگزین“ نے اس کتاب کے مصنف ”سٹیفن آرکووے“ کو پچیس موثر ترین امریکیوں میں شامل کیا۔ دنیا کے کئی ممالک بشمول پاکستان میں اچھے ادارے اور کمپنیاں اپنے ملازمین (Employes) کی تربیت سازی کے لئے اس کتاب کے حوالے سے سیمینارز کر رہی ہیں اور یہ کتاب مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

تقریباً ایک صدی پہلے امریکہ کے ہی ایک نامور مصنف ”ڈیل کارنیگی“ نے شخصیت سازی، زندگی میں کامیابی و کامرانی حاصل کرنے، پریشانیوں اور الجھنوں پر غالب آنے اور لوگوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار کرنے سے متعلق موضوعات پر کتابیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں اور آج تک پڑھی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ بات بلا مبالغہ کی جا سکتی ہے کہ ”ڈیل کارنیگی“ کی کتابوں نے شہرت و مقبولیت کا جو سفر ایک صدی میں طے کیا ہے ”کووے“ کی کتاب نے وہ سفر چند سالوں میں ہی طے کر لیا ہے اور کتاب کا بظہر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ کتاب بجا طور پر اس مقام و مرتبے کی اہل دکھائی دیتی ہے۔ یہ کتاب ان کتابوں میں سے ہے جنہیں سرسری نظر سے پڑھ کر گزر نہیں جانا چاہیے بلکہ اچھی طرح اور بار بار پڑھ کر بضم کرنا چاہیے، ذہن کا جزو بنانا چاہیے، قلب و باطن میں نقش کرنا چاہیے اور پھر اسے اپنی زندگی میں نافذ کرتے ہوئے عمل کا حصہ بنا لینا چاہیے تب اس سے بہترین استفادہ کیا جا سکتا ہے اور یہی بات دنیا کے ہر فلسفے اور نسخے پر صادق آتی ہے کہ اس کا حقیقی فائدہ اسی وقت ہوتا ہے جب اسے عملی استعمال میں لایا جاتا ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں کامیاب اور موثر ترین لوگوں کی سات عادات کا ذکر کیا ہے جن کو فطرت کے قوانین (Laws of Nature) کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ مصنف کے بقول یہ سات عادات دراصل عام سمجھ یعنی کامن سینس کی باتیں ہیں۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کامن سینس عام طور پر کامن پریکٹس بن نہیں پاتی۔ اور پھر کامن سینس کی پیش کاری بھی تو کوئی آسان کام نہیں۔ علاوہ ازیں زندگی کی سادہ اور گہری حقیقتوں کو جس منفرد اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ علم نفسیات کا دامن اس سے

پہلے ایسی کاوش سے تقریباً خالی دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کے دامن کو حقیقی خوشیوں اور مسرتوں سے بھرنے، اپنی شخصیت کو مثبت، تعمیری اور صحت مند بنیادوں پر تعمیر کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں سے مضبوط، پائیدار اور پُر خلوص تعلقات استوار کرنے کے لئے اس کتاب میں جو اصول دیئے گئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اُن کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس کتاب کا مرکزی خیال اصولوں پر مبنی ذاتی ترقی، رہنمائی اور تنظیم ہے۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تسخیر کائنات کی اولین شرط تسخیر ذات ہے۔ ”کووے“ کے خیال میں بیرونی فتح سے پہلے اندرونی فتح ضروری ہوتی ہے اور اس کے لئے وہ ”اندر سے باہر کی طرف“ کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جس کی تصدیق اور تائید ہر زمانے کے دانشور اپنے اپنے انداز میں کرتے چلے آئے ہیں۔ عام لوگ ہر زمانے میں یہ غلطی کرتے ہیں کہ ذاتی ترقی کے بغیر بیرونی فتح کی خواہش کرتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاریخ کا تجربہ اور مشاہدہ یہی بتاتا ہے کہ ہر زمانے میں جن لوگوں نے ماحول اور معاشرے پر گہرے اثرات ڈالے وہ سب کے سب اعلیٰ درجے کا ذاتی نظم و ضبط (Self Discipline) رکھتے تھے۔

پہلی تین عادات کا تعلق اندرونی فتح کے ساتھ ہے جن پر عمل کیے بغیر اپنی ذات کو مسخر نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ اگلی تین عادات کا تعلق بیرونی فتح سے ہے۔ اور بیرونی فتح سے مراد اردگرد کے ماحول پر اثرات مرتب کرنا اور لوگوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنا ہے۔ ساتویں عادت کا تعلق صلاحیتوں کی تجدید سے ہے کہ کس طرح جسمانی، ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کی متوازن انداز میں تجدید کرنی ہے۔ یہ شخصیت میں مسلسل بہتری اور نکھار پیدا کرنے کی عادت ہے اور اس کا دائرہ باقی تمام عادات کا احاطہ کرتا ہے۔

اس تحقیق کا مقصد ان عادات کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لینا ہے جس کی دو اہم

وجوہات درج ذیل ہیں۔

(الف) پہلی وجہ

قرآن و حدیث جو کہ علم و حکمت کے حقیقی سرچشمے ہیں، اُس کسوٹی پر پرکھنے سے ان سات عادات کی کوئی بات بھی قرآن و حدیث کے خلاف دکھائی نہیں دیتی، بلکہ جا بجا وہاں سے اُن اصولوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اسلام کے گلستان میں رنگ برنگ کے جو پھول مہک رہے ہیں اُن

میں سے ہی چند ایک کو لے کر مصنف نے علمِ نفسیات کا پیرہن پہنا کر بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ تحریر ہذا کا پہلا مقصد یہ دکھانا ہے کہ علم و حکمت صدیوں کا فاصلہ طے کر کے جہاں تک پہنچی ہے وہ سب کچھ اسلام نے بہت پہلے ہی بیان کر دیا ہوا ہے

(ب) دوسری وجہ

اس جائزہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان سات عادات کی تشریح قرآن و حدیث کی روشنی میں عام فہم انداز میں کر دی جائے تاکہ ہمارے لوگوں کے لئے ان سے استفادہ کرنا اور ان کی روشنی میں اپنی زندگی کو سنوارنا آسان ہو جائے۔

ضرورت و اہمیت

انسانی زندگی اتنی زیادہ قیمتی اور انمول چیز ہے کہ دنیا کی کوئی بھی دوسری چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی اور اس پر مستزاد یہ کہ ہر شخص کو یہ نعمت صرف ایک ہی بار ملتی ہے دوسرا موقع (Change) کوئی نہیں ہے۔ اس سے بھی بہت زیادہ اہمیت کی بات یہ ہے کہ یہ زندگی ہمارے سفر کا آغاز اور اختتام نہیں ہے بلکہ زندگی کے طویل سفر کا ایک مرحلہ ہے۔ زندگی اس سے پہلے بھی طویل مسافت طے کر چکی ہے اور اس کے بعد بھی زندگی کا سفر جاری رہنا ہے۔ موت نے آ کر زندگی کے اس دور کو ختم کر دینا ہے اور ہم نے ایک غیر مختتم زندگی (Endless Life) کے دور میں داخل ہو جانا ہے۔ دنیا کی اس مختصر سی زندگی کو اس ابدی زندگی کا دیباچہ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس دائمی زندگی میں ہمارے اچھے یا بُرے انجام کا تمام تر دار و مدار اس زندگی میں گزرنے والے ایک ایک لمحے پر ہے کہ ہم اُسے کس طرح گزارتے ہیں۔ یہ صورتِ حال خاصی حساسیت (Sensitivity) کا تقاضا کرتی ہے۔ ہر شخص کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے زندگی کی قدر و قیمت کو جانے اور زندگی کی صورت میں ملنے والے اس پہلے اور آخری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیوی زندگی کو خوشگوار بنانے کے ساتھ ساتھ آخرت کی دائمی اور حقیقی کامیابیوں کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ اس مقصد کے لیے زندگی گزارنے کے قوانین کا جاننا بہت ضروری ہے۔ لوگوں کی اکثریت کی ناکامی کی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ زندگی کے قوانین کو جانے بغیر زندگی کو گزار رہے ہوتے ہیں بظاہر تو زندگی گزر رہی ہوتی ہے مگر حقیقتاً ضائع ہو رہی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے یہ موضوع انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ جس کا مقصد لوگوں کو زندگی کے قوانین سے آشنا کرانا ہے تاکہ وہ زندگی کے ضابطوں کو سمجھ کر اپنے آپ کو اُن سے ہم آہنگ کر کے زندگی کے دامن کو حقیقی کامیابیوں

اور کامرائیوں سے بھر سکیں۔

لہذا یہ کام ہر خاص و عام کے لیے ہے راقم کو اُمید ہی نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ جو شخص بھی اسے پڑھے گا۔ وہ علم کے جس بھی درجے پر ہو اور جتنی بھی کامیاب زندگی گزار رہا ہو (چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر) اسے یہاں سے چند باتیں ایسی ضرور مل جائیں گے جو اُس کے لیے نئی ہوں گی اور جن پر عمل پیرا ہو کر زندگی کے معیار کو پہلے سے مزید بہتر بنایا جاسکتا ہوگا۔

سابقہ کام کا جائزہ

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک جتنے بھی انبیائے کرام دنیا میں تشریف لائے ان سب کا مقصد لوگوں کو کامیاب زندگی کے گر سکھانا ہی تھا۔ چنانچہ انبیائے کرام اس کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے جو الہامی تعلیمات لوگوں کے سامنے رکھیں ان کی غرض و غایت اور منتہائے مقصود انسانی شخصیت کو سنوارنا، نکھارنا اور اُس میں وہ مضبوطی و استحکام پیدا کرنا تھا کہ ایک طرف تو وہ دنیوی زندگی کی سٹیج پر اپنا کردار بھرپور، فعال اور موثر انداز میں سرانجام دے سکے۔ اور دوسری طرف مرنے کے بعد جنت کی حسین اور معیاری دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہو سکے۔ یوں دنیوی زندگی میں سرخرو ہونے کے ساتھ ساتھ آخرت کی حقیقی زندگی کی کامیابیوں اور کامرائیوں سے اپنے دامن کو بھر سکے۔ یہی انسان کا مقصد حیات ہے۔

انبیائے کرام کی اتباع میں ہر زمانے کے علماء و صلحا یہی کام کرتے رہے دوسری طرف علم نفسیات پر آج تک جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ان سب کا مرکز و محور بھی یہی نکتہ رہا ہے۔ جہاں تک زیر نظر کتاب کا تعلق ہے۔ اس میں بھی کامیاب شخصیت کے لوازمات کی حیثیت سے سات عادات کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کو شخصیت کا حصہ بنا لینے سے اُس میں بہتری اور نکھار آنا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ شخصیت عادات کے مجموعے ہی کا دوسرا نام ہے اور اُس کے بگڑنے یا سنورنے کا دار و مدار عادات پر ہی ہوتا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے پاکستان سمیت دنیا بھر میں ورکشاپس ہوتی رہتی ہیں جن میں نامور مقررین اپنے اپنے انداز میں ان عادات کی تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا اس کتاب کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے تاہم ابھی تک اس کا اسلامی تعلیمات کے تناظر میں بھرپور جائزہ نہیں لیا جاسکا۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے اس موضوع کو منتخب کیا گیا۔

چند وضاحتیں

چند بنیادی باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو تحریر ہذا کے حوالے سے پیدا ہونے والے بعض اشکالات کا جواب ملنے کے ساتھ ساتھ اسے بہتر انداز میں سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ یہ اہم نکات درج ذیل ہیں۔

۱: علم نفسیات بحیثیت ایک سائنس کے اپنے اندر بہت ساری پیچیدہ اصطلاحات کو سموبے ہوئے ہے جو ایک عام آدمی کے لیے کسی گورکھ دھندے سے کم نہیں ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس علم میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اسے باقاعدہ علم کی حیثیت سے پڑھتے ہیں وہ تو اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اس کے ذریعے دوسروں کو بھی نفع پہنچانے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں لیکن لوگوں کی اکثریت کے نزدیک یہ ایک خشک اور مشکل مضمون ہے جس کی بنا پر عام لوگ نہ تو اس کی طرف مائل ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنی شخصیت کی بہتری کے حوالے سے اسے استعمال میں لا سکتے ہیں۔ زیر نظر تحریر میں نہ تو اس علم کی اصطلاحات کو لا کر خواہ مخواہ اسے نقل بنایا گیا ہے اور نہ علم نفسیات کی تاریخ اور مختلف قسموں پر بحث کی گئی ہے کہ ان چیزوں کے حوالے سے ہزار ہا صفحات پہلے ہی سیاہ ہو چکے ہیں اس تحریر کا مقصد تو اکیسویں صدی کے انسان کو بالکل سادہ اور فطری انداز میں زندگی کی اہم حقیقتوں سے آشنا کروانا ہے جن کو ملحوظ خاطر رکھ کر زندگی کے معیار کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا بھی قطعاً بے جا اور مبالغہ آرائی نہیں ہوگا کہ ایم۔ فل کی ڈگری کا حصول اس تحریر کا ثانوی مقصد تو ہو سکتا ہے اولین مقصد ہرگز نہیں۔ اولین مقصد وہی ہے جو سطور بالا میں بیان ہوا۔

۲: عام طور پر اس طرح کے موضوعات میں تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے۔ مقالہ کے عنوان سے بھی بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ زیر بحث موضوع کی مناسبت سے اسلامی تعلیمات اور علم نفسیات کو ایک دوسرے کے روبرو کر کے موازنہ کیا گیا ہوگا۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہاں تقابلی جائزے کا کوئی مثل دخل نہیں ہے۔ اس تحریر کا مقصد تو یہ ہے کہ کامیاب شخصیت کی تشکیل کے حوالے سے دونوں جگہوں سے جو بھی اچھے اچھے نکات میسر آئیں اور آپس میں موافقت رکھتے ہوں انہیں افادۂ عام کے لیے یکجا کر دیا جائے۔ تقابلی جائزوں والی بہت ساری تحریریں اور تحقیقی کام ہیں۔ جن کے مصنفین اور مولفین ڈگریاں لے چکے ہیں مگر ان سے فائدہ اٹھانے والے گنتی کے وہ چند لوگ ہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے ان سے ملتے جلتے موضوعات پر تحقیق کرنی ہو۔ نتیجہ یہ

نکلتا ہے کہ ایسی تحریریں اکثر و بیشتر لائبریریوں کی زینت بنی رہتی ہیں اور ان سے استفادہ کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ تحریر ہذا کا مقصد ہر خاص و عام کو زندگی کے گہرے رازوں سے آشنا کرنا ہے۔ گویا یہ تحریر فقط خواص کے لیے نہیں ہے بلکہ عوام کے لیے بھی ہے۔ لہذا یہاں بالکل بے ساختہ اور فطری انداز میں اسلام اور علمِ نفسیات سے خوبصورت اور خوشنما پھولوں کو چن کر ایک گلہستہ بنا دیا گیا ہے۔

۳: ایک اور بات جسے ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ چونکہ یہ کام عام لوگوں کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے جس کا مقصد انہیں زندگی کے چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کے طریقے اور کامیاب زندگی کے گر بتانا تھا لہذا اس کے اندر خواہ مخواہ کتابیات کی فہرست کو بڑھانے کے لیے حوالہ جات کو تکلفاً شامل نہیں کیا گیا۔ بلکہ اسے حتی الوسع سادہ اور عام فہم بنانے کے لیے نیز قارئین کو بوریت اور اکتاہٹ سے بچانے کیلئے بے ساختہ اور فطری انداز میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک حوالہ جات اور کتابیات کے حوالے سے یہ بہت زیادہ معیاری نہ ہوتا ہم افادہ عام کے لحاظ سے انشاء اللہ العزیز بہت کارآمد ہوگی۔ بعض حوالہ جات ثانوی ماخذ سے لیے گئے ہیں۔

۴: یہ سوال آسکتا ہے کہ اس طرح تو قرآن و حدیث کو علمِ نفسیات کے تابع کر دیا گیا ہے کہ ایک کتاب کے اندر لکھی گئی باتوں کو کوشش بسیار سے قرآن و حدیث سے تلاش کر کے ان پر منطبق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر بات کو دیکھنے کے دوزخ ہوتے ہیں۔ ایک منہی اور دوسرا مثبت۔ مندرجہ بالا اعتراض تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی تاریخ چودہ سو سالہ پرانی ہے جب کہ علمِ نفسیات کل کی بات ہے تو اس بات کو ہم اس طرح بھی لے سکتے ہیں کہ خود علمِ نفسیات کو قرآن و حدیث کے تابع کر دیا گیا ہے کہ جو بات علمِ نفسیات آج کہہ رہا ہے وہ قرآن و حدیث میں اپنے مخصوص انداز میں صدیوں پہلے آچکی ہے۔

۵: ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا کامیاب شخصیت یا کامیاب زندگی صرف سات عادات میں ہی منحصر ہے۔ آٹھ، نو یا اس سے زیادہ کیوں نہیں ہو سکتیں۔ جواب یہ ہے کہ کامیاب زندگی صرف سات عادات تک محدود نہیں ہے اور بھی بہت ساری عادات ہیں خود مصنف (سٹیفن آرکویے) کی طرف سے آٹھویں عادت (Fight Habit) بھی منظرِ عام پر آچکی ہے۔ لیکن تحقیق کے اندر تحدید

موضوع بھی تو کسی چیز کا نام ہے۔ سو یہاں تحدیدِ موضوع سے کام لیتے ہوئے اپنے موضوع کو سات عادات تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اور وجہ اس تحدید کی یہ ہے کہ راقم کے خیال میں ان سات عادات میں اتنی وسعت اور جامعیت پائی جاتی ہے کہ ان پر کامیاب زندگی کی شاندار عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ باقی اس عمارت کی تزئین و آرائش کے اندر اور بہت ساری عادات خود بخود ہی شامل ہوتی چلی جائیں گی۔

۶: ایک اور سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک کتاب چھپ چکی ہے اور اس کے اندر من و عن یہی سات عادات شامل ہیں تو اب اس میں تحقیق والی کون سی بات ہے اور انہیں ایک نئے رنگ میں بیان کر کے کون سا تیر مار لیا گیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس کتاب کے حوالے سے پاکستان سمیت دنیا بھر میں سیمینارز ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں لیکن راقم کے علم کی حد تک ابھی تک اس کو قرآن و حدیث کی روشنی میں نہیں پرکھا گیا ہے اور اس کا بھرپور جائزہ نہیں لیا گیا ہے سو تحریرِ ہذا کا مقصد اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لے کر یہ دیکھنا ہے کہ کامیاب زندگی کے یہ اصول کس حد تک اسلامی تعلیمات کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ لہذا اب ان تمام لوگوں کے لیے جو مذہبی ذہن رکھتے ہیں اور بالعموم غیر مسلموں کی تحریروں کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے ہیں ان کے لیے شرح صدر کے ساتھ ان اصولوں سے فائدہ اٹھانا آسان اور ممکن ہو جائے گا۔

۷: اس تحقیقی کام میں کتاب مذکورہ کا مکمل متن یا ترجمہ شامل نہیں کیا گیا ہے۔ نہ ہی اس کے تمام مندرجات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ بعض غیر ضروری یا نسبتاً کم اہم چیزوں کو چھوڑتے ہوئے تمام اہم اور بنیادی نوعیت کے مباحث کو لیتے ہوئے جو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر مکمل طور پر پورا اترتی تھیں انہیں ایک نیا پیرھن پہنا کر اسلامی تعلیمات اور مشرقی روایات کے تناظر میں بیان کر دیا گیا ہے۔ جہاں کہیں کتاب سے اقتباسات لیے گئے وہاں حوالہ درج کر دیا گیا ہے اور جہاں محض کوئی خیال یا نظریہ لے کر اسے اپنے انداز اور اپنے الفاظ میں بیان کیا گیا وہاں نہ حوالے کی ضرورت تھی اور ہی ایسا کرنا مناسب سمجھا گیا۔

۸: تیسرے باب کی دوسری اور تیسری فصل مذکورہ بالا کتاب سے ہٹ کر ہے۔ راقم کے خیال میں دنیا بھر کی تمام برائیوں اور گمراہیوں کی بنیاد دو چیزیں ہیں۔

(۱) فکری گمراہیاں (۲) ضبطِ نفس کا فقدان

اگر انسان فکری گمراہیوں سے بچ کر فکرِ سلیم تک پہنچ جائے اور اُس کو اپنی طبیعت، جذبات، خیالات اور عادات و اطوار پر مکمل قابو (Control) حاصل ہو جائے تو پھر اُس کا کامیابی اور کامرانی کے راستے پر چلتے جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ اور بھٹکنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں چنانچہ دوسری فصل کا عنوان ”فکری گمراہیوں کا علاج“ ہے۔ ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر انسان فکری گمراہیوں سے بچ کر فکرِ سلیم تک پہنچ سکتا ہے جبکہ تیسری فصل کا عنوان ”عملی گمراہیوں کا علاج“ ہے۔ یہاں جو اصول دیئے گئے ہیں اُن کا مقصد ضبطِ نفس کا حصول ہے تاکہ انسان اپنی طبیعت، مزاج اور عادات و اطوار کے ہاتھوں میں کھلونا بننے کی بجائے اُن کا آقا بن سکے۔ دوسری اور تیسری فصل میں بیان ہونے والی بعض باتیں سات عادات کے ضمن میں بھی آچکی ہیں۔ تاہم اُن کی مخصوص اہمیت کے پیش نظر اُن کو الگ عنوانات کے تحت بیان کر دیا گیا اور ان کا مقصد سات عادات پر عمل پیرا ہونے کے لیے اپنے اندر مضبوطی اور استحکام پیدا کرنا ہے۔ انسان کی کوئی بھی کاوش حرفِ آخر نہیں ہو سکتی۔ ہر سطح پر اصلاح کی گنجائش اور بہتری کا امکان موجود رہتا ہے۔ پیری اس تحریر کے اندر اگر کوئی حسن و خوبی ہے تو وہ اُسی ذات کا کرم ہے جو زبان میں گویائی، آنکھوں میں بصارت، کانوں میں سماعت، دماغ میں خیالات اور قلم میں روانی پیدا کرتا ہے اور اس میں جو کمیاں اور خامیاں ہیں وہ میری کوتاہیوں اور کم علمی کا نتیجہ ہیں جن کے لیے میں اللہ رب العزت کی بارگاہ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اہل علم و فضل سے گزارش ہے کہ وہ جہاں کوئی غلطی محسوس کریں تو نشان دہی فرما کر مشکور فرمائیں۔

امید ہے کہ تحریرِ ہذا کو پڑھتے ہوئے اور اس کے متعلق کسی بھی قسم کا کوئی فیصلہ یا رائے قائم کرتے وقت مندرجہ بالا معروضات کو پیش نظر رکھا جائے گا اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا اور التجا ہے کہ وہ اس تحریر کو راقم اور پڑھنے والوں کے لیے نفع اور برکت کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ اور ہم سب کو زندگی کے چراغ کے گل ہونے سے پہلے پہلے اس ملی ہوئی مہلت کے ایک ایک لمحے کو اپنی شخصیت اور کردار کی تعمیر و تشکیل میں صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور دنیا کی سٹیج پر ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مخصوص اور منفرد کردار خلوص نیت کے ساتھ اور بھرپور طریقے سے عطا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہم سب کو دنیا اور آخرت کی جملہ بھلائیاں اور سعادتیں عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

کامیاب لوگوں کی خصوصی عادات

باب اول

ذاتی فتح کے اصول

فصل اول: ذمہ داری قبول کرنا

فصل دوم: انجام پر نظر رکھنا

فصل سوم: ترجیحات کا تعین کرنا

فصل اول:

ذمہ داری قبول کرنا

- کامیاب شخصیت کی تشکیل کے ضمن میں جن سات عادات کو یہاں بیان کیا گیا ہے ان کی تشریح سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کو جانا جائے کہ ”عادت“ کسے کہتے ہیں اور اس کی انسانی زندگی میں کیا اہمیت ہے؟

عادت کی تعریف

”سٹیفن آرکوڈے“ نے عادت کی تعریف یوں کی ہے:

"We will define a habit as the intersection of knowledge, skill, and desire." (1)

”جب علم، ہنر اور خواہش ملتے ہیں تو عادت بنتی ہے۔“

علم سے مراد ہے ”کیا کرنا چاہیے اور کیوں کرنا چاہیے؟“ ہنر کا مطلب ہے ”کیسے کرنا چاہیے؟“ اور خواہش سے مراد اندرونی تحریک ہے جس کا مطلب ہے ”ضرور کرنا چاہیے۔“

مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی کے بقول:

”کوئی کام اچھا ہو یا بُرا دو چیزوں سے عادت بن جاتا ہے۔ نفس کا اُس کی طرف میلان اور اس کو وجود میں لانے کے لئے میلان کی پزیرائی۔ بشرطیکہ یہ دونوں چیزیں کافی حد تک بار بار ہوتی رہیں۔“ (۲)

سادہ لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہر وہ کام جسے طبیعت کی رغبت یا خواہش کے تحت بار بار کیا جائے یہاں تک کہ اُس کا کرنا آسان ہو جائے، اُس کو عادت کہتے ہیں۔ اور انسان کے اکثر اعمال

عادت کے زمرے میں آتے ہیں۔ مثلاً کھانا، پینا، سونا، جاگنا، گاڑی چلانا وغیرہ۔

عادت کی اہمیت

علم نفسیات کا کہنا ہے کہ ہم زندگی میں جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں کم از کم %80 کا انحصار عادتوں پر ہوتا ہے۔ ہمارا کردار بنیادی طور پر ہماری عادات کا مرکب ہے۔ ایک کہاوت ہے کہ ”ایک سوچ بوؤ اور عمل کاٹو، ایک عمل بوؤ اور ایک عادت کاٹو، ایک عادت بوؤ اور کردار کاٹو، کردار بوؤ اور قسمت کاٹو“

صدیوں پہلے ارسطو نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"We are what we repeatedly do. Excellence is than, not an act, but a habit" (۳)

”ہم جو کچھ بھی ہیں یہ نتیجہ ہے اُن اعمال کا جنہیں ہم بار بار کرتے ہیں۔ لہذا عمدگی (بہتر کارکردگی کا حامل ہونا) ایک عمل نہیں بلکہ ایک عادت ہے۔“

حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان چند عادات کے مجموعے کا نام ہے۔ اچھی یا بُری جیسی عادات بھی وہ اپنالیتا ہے اسی سانچے میں اس کی زندگی ڈھلنا شروع ہو جاتی ہے۔ کامیاب اور ناکام لوگوں میں بڑا فرق یہی ہے کہ کامیاب لوگ اچھی عادات رکھتے ہیں جبکہ ناکام لوگ بُری عادات کا شکار ہوتے ہیں۔ اچھی عادات اپنانا مشکل ہے مگر اچھی عادات کے ساتھ زندگی گزارنا بہت آسان ہے۔ اسکے برعکس بُری عادات اپنانا آسان ہے مگر اُن کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ اس وقت ہم جو بھی عادات رکھتے ہیں ہماری موجودہ زندگی اُنہی عادات کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح مستقبل کی زندگی کا دارومدار بھی ہماری عادات پر ہی ہے۔ گویا پوری زندگی کا تانا بانا عادات سے ہی عبارت ہے جیسی عادات ہوں گی ویسی ہی زندگی ہو گی۔

انسانی زندگی کا ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ انسان بچپن کے زمانے میں بعض اوقات ایسی عادات کا شکار ہو جاتا ہے جس کی شخصیت کے لئے نقصان دہ اور اس کی ترقی میں رکاوٹ ہوتی ہیں۔ پھر بڑے ہونے پر بھی بعض اوقات تو لائسنس اور جہالت کی وجہ سے ان کی برائی کا احساس ہی نہیں ہوتا اور کبھی

ہوتا ہے تو وہ اتنی پختہ ہو چکی ہوتی ہیں کہ اُن کو بدلنا انسان کو ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور دکھائی دے رہا ہوتا ہے۔ تاہم خوشی کی بات یہ ہے کہ کسی بھی بُری عادت کو اچھی عادت میں تبدیل کرنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ علمِ نفسیات کا دعویٰ ہے کہ ہم زندگی کی کسی بھی سٹیج پر کسی بھی بُری عادت کو چھوڑ سکتے ہیں اور کوئی بھی نئی عادت اپنا سکتے ہیں۔ (۴)

یہی مذہب کی تعلیم بھی ہے۔ اسلام کی جملہ تعلیمات کا مقصد سیرت و کردار کی اصلاح ہے۔ اب اگر انسان کو اپنی عادتوں کے سامنے مجبور اور بے بس مان لیا جائے تو پھر ساری تعلیمات بے مقصد دکھائی دیتی ہیں۔ یوں تو اسلام کی جملہ عبادات انسان کے اندر نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں۔ مگر بالخصوص نماز اور روزہ دو ایسی عبادات ہیں جو بطور خاص ضبطِ نفس (Self Control) کو پیدا کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ بشرطیکہ ان کی روح کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ان کو عمل میں لایا جائے۔

مندرجہ بالا ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی ہیں اپنی عادات کا مجموعہ ہی ہیں۔ اگر ہم کامیابی و کامرانی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو لازماً ہمیں اچھی عادات کو اپنانا ہوگا اور بُری عادات کو ترک کرنا ہوگا۔ اس میں ابتدائی طور پر کچھ محنت تو کرنی پڑے گی مگر اُس کے بعد یہی اچھی عادات مستقل طور پر ہماری طبیعت اور جبلت کا حصہ بن جائیں گی اور پھر اُن کے ثمرات زندگی بھر حاصل ہوتے رہیں گے۔ اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم اُن سات عادات کا جائزہ لیتے ہیں جو ہماری شخصیت کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں بھی ہمیں ایک جاندار اور مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل بناتی ہیں اور دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی کامیابیوں اور کامرانیوں کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔

پہلی عادت کا مفہوم

کامیاب اور پُر اثر لوگوں کی پہلی عادت جو بقیہ عادات کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے ”ذمہ داری قبول کرنا“۔

اس کے لئے انگریزی میں "Proactive" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جب ہم انگریزی لغت کو دیکھتے ہیں تو اُس میں "Proactive" کے یہ معنی ملتے ہیں۔

”پیش قدمی کے ذریعے صورتِ حال پر قابو پانے والا“ (۵)

”سٹیفن آرکووے“ نے اس لفظ کو بطور خاص مندرجہ ذیل دو معنوں میں استعمال کیا ہے۔ (۶)

(۱) محرک اور ردِ عمل کے پُٹاؤ کی آزادی کو استعمال کرنا

(۱۱) قدم اٹھانا

محرک اور ردِ عمل کے درمیان پُٹاؤ کی آزادی

جب ہمارے ساتھ کوئی صورتِ حال پیش آتی ہے تو وہ ہمیں کسی ردِ عمل پر اکساتی ہے سمجھنے والی بات یہ ہے کہ ہم ہر قسم کی صورتِ حال میں اپنے ردِ عمل کے انتخاب میں آزاد ہیں اس تصور کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل باتوں پر غور کریں:

۱۔ انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اثر انداز ہونے والے عوامل کے حوالے سے عموماً تین قسم کے مفروضات پائے جاتے ہیں۔ (۷)

(i) موروثیت (Genetic determanism)

(ii) والدین کی تربیت

(iii) ماحول، مدرسے اور معاشرے کے اثرات

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مندرجہ بالا عوامل اکیلے اکیلے یا ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں اور انسانی شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتے ہیں۔

جہاں تک موروثیت کا تعلق ہے اس نظریے کی رو سے انسان کے مزاج میں بہت ساری چیزیں والدین کی طرف سے بذریعہ DNA منتقل ہوتی ہیں۔ اور اس طرح کئی خصوصیات خون کے ذریعے سے نسل در نسل چلتی رہتی ہیں۔

دوسرا نکتہ نظر یہ ہے کہ والدین کی تربیت ہی اولاد کے رجحانات، میلانات اور کردار کو تشکیل دینے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ جس قسم کی تربیت والدین کی طرف سے بچے کو میسر آتی ہے اسی طرح کی شخصیت معرض وجود میں آنا شروع ہو جاتی ہے۔

تیسرا مفروضہ ماحول، معاشرے اور مدرسے وغیرہ کے اثرات کے حوالے سے ہے جس کی رو

سے انسان کے ارد گرد کے حالات، ماحول اور صحبتوں کے اثرات اُس کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مندرجہ بالا عوامل اپنی اپنی جگہ پر انسان کے مزاج، رجحانات اور عادات و اطوار کی تشکیل میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً غلط ہے کہ انسان کی شخصیت انہی مندرجہ بالا عوامل کے رحم و کرم پر ہے۔ اور اس میں اُس کا اپنا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اگر اس تصور کو ہی درست مان لیا جائے تو پھر انسان کے پاس کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ اور مایوسی اور پست ہمتی اُس کا مقدر بن جاتی ہے۔ پھر عملی مشاہدہ بھی اس کے خلاف ہے۔ ایک ہی والدین کی اولادوں میں بعض اوقات زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی مدرسے میں پڑھنے والے، ایک ہی ماحول میں پروان چڑھنے والے افراد بھی ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کفر و شرک کے ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود اُس ماحول سے متاثر نہ ہو سکے۔ حضرت آسیہ علیہا السلام فرعون کے محل میں رہنے کے باوجود جنتی بن گئیں۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا نبی کی اولاد ہونے اور اُن کے گھر تربیت پانے کے باوجود ایمان کی روشنی نہ اپنا سکا۔

یہ مثالیں اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ مندرجہ بالا تینوں عوامل شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جزوی کردار رکھنے کے باوجود بھی فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتے۔

۲۔ بعض اوقات انسان کسی غریب اور معمولی خاندان میں پیدا ہوتا ہے۔ یا کوئی جسمانی نقص ہوتا ہے یا اُس کی شکل و صورت معمولی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اب میرے لئے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ اپنی کسی ایک آدھ کی یا خامی کو لے کر ہی بیٹھ جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ خامی اس کی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

یہ سوچ بھی غلط ہے اگر یہ صحیح ہوتی تو پھر ”ابراہام لنگن“ کے لئے جھونپڑی میں آنکھ کھولنے

کے باوجود امریکہ کا صدر بن جانا اور ”ہیلن کیلر“ کا اندھی، بہری اور گونگی ہونے کے باوجود

لوگوں کی بھلائی کیلئے عظیم الشان کام کر جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوتا۔

۳۔ بعض اوقات زندگی میں مختلف قسم کے حادثات پیش آتے ہیں جس کی وجہ سے اُسے اچھے بُرے تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کئی قسم کی محرومیاں اور نا کامیاں زندگی میں آجاتی ہیں۔ نتیجہً انسان

احساسِ محرومی، مایوسی اور بے یقینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ پر ترس کھانا شروع کر دیتا ہے اور حالات کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ اس کی سوچ تخریبی رُخ پر چل پڑتی ہے جس کے نتیجے میں کوئی انتہائی قدم اٹھا کر دنیا اور آخرت کی تباہیوں اور بربادیوں کا مستحق بن جاتا ہے۔

یہاں بھی ہمیں لوگوں کی اکثریت کے برعکس ایسے لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں جو بڑے بڑے طوفانوں میں سے گزرنے کے بعد بھی اپنے حوصلے اور تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔

۴۔ بعض اوقات دوسرے لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ انتہائی غیر مناسب اور نامعقول ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہمارے اندر ناخوشگوار قسم کے احساسات اور جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جلتے اور کڑھتے ہیں اور دوسروں سے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور کئی مرتبہ غصے میں آ کر کوئی ایسا قدم اٹھا لیتے ہیں کہ لمحوں کی خطا ہوتی ہے اور صدیوں کو سزا بھگتنا پڑتی ہے۔

دوسری طرف ایسی بے شمار مثالیں بھی ہیں جہاں لوگوں کے انتہائی غلط طرزِ عمل کے باوجود مثبت سوچ کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے ساتھ تیرہ سال تک ظالمانہ رویہ رکھا گیا۔ اور طائف والے دن تو انتہا کر دی گئی مگر ایک لمحے کے لئے بھی پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور نہ ہی آپ ﷺ منفی نفسیات کا شکار ہوئے۔ حضرت یوسفؑ کو اپنے ہی بھائیوں کی طرف سے کنویں میں ڈالا گیا۔ مصر کے بازاروں میں فروخت ہوئے، پھر مکمل طور پر بے قصور ہونے کے باوجود کئی سال کے لئے جیل میں ڈال دیے گئے۔ مگر کسی بھی موقع پر وہ ہمیں شکوہ و شکایت کرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جو کربلا میں ہوا، وہ رہتی دنیا تک انسانی تاریخ کی داستانِ خونچکاں ہے۔ مگر ہر موقع پر امام حسینؑ صبر و استقامت کا پیکر دکھائی دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا چاروں قسم کی مثالوں میں ہمیں واضح طور پر افراد کی دو قسمیں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک وہ جو حالات سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کا طرزِ فکر و طرزِ عمل اسی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو حالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں اور ہر قسم کے حالات میں اپنا مخصوص طرزِ فکر و طرزِ عمل اپناتے ہیں۔ دونوں قسموں کے افراد میں جو فرق ہے اسی کو یہاں ردِ عمل کے چناؤ کی آزادی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہمیں اپنے والدین کے انتخاب کے سلسلے میں کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ ہی ماحول اور معاشرہ

ہماری پسند کا ہو سکتا ہے۔ نہ یہ ضروری ہے کہ دوسرے لوگوں کا طرزِ عمل ہماری مرضی کے مطابق ہو اور نہ ہی ہم زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات اور حادثات کو روک سکتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ مگر ان تمام معاملات میں ایک اور صرف ایک چیز ہے جو ہمارے اختیار میں ہے اور وہ ہے۔ ”ردِ عمل کے چناؤ کی آزادی“

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کس قسم کے حالات میں کیا ردِ عمل اختیار کرتے ہیں؟ یہی وہ چیز ہے جو ہماری شخصیت کی تعمیر و تخریب، ترقی و تنزل، عروج و زوال حتیٰ کہ ہماری قسمت کا فیصلہ کرتی ہے اور ہمارا ردِ عمل بہر حال ہمارے اپنے ہی اختیار میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وکٹر فرینکل کہتا ہے

"There are three central values in life---the experimental , or that which happens to us; the creative, or that which we bring into existence and the attitudinal , or our response in difficult circumstances such as terminal illness. The highest of the three values is attitudinal."^(۸)

”زندگی میں تین مرکزی اقدار ہوتی ہیں تجرباتی یعنی جو ہمارے ساتھ زندگی میں ہوتا ہے۔ تخلیقاتی وہ جو زندگی میں ہمارے ہونے کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔ اور رویے یا مشکل حالات مثلاً بسترِ علالت پر ہونا، میں ہمارا ردِ عمل۔ ان تمام اقدار میں سے ہمارا رویہ (یعنی ردِ عمل) سب سے بڑی اور اہم قدر ہے۔“

اندھی، بہری اور گونگی ہیلن کیلر کا خوبصورت قول ہے کہ

"So much has been given to me. I have no time to ponder that which has been denied."^(۹)

”قدرت نے مجھے بہت کچھ عطا کیا ہے اور میرے پاس یہ سوچنے کے لئے وقت نہیں کہ مجھے کیا کچھ نہیں ملا۔“

فرانسیسی فلسفی مائین نے ان الفاظ کو اپنا ماٹو قرار دیا:

A man is not hurt so much by what happens, as by his

opinion of what happens. And our opinion of what happens is entirely up to us. (۱۰)

”انسان کو کسی حادثہ میں اس قدر ضرر نہیں پہنچتا جس قدر اُس رائے سے جو وہ اُس حادثے کے متعلق قائم کرتا ہے۔ اور حادثے کے متعلق اپنی رائے ہم خود ہی قائم کرتے ہیں“

ڈیل کارنیگی لکھتا ہے

our peace of mind and the joy we get out of living depends not on where we are, or what we have, or who we are, but solely upon our mental attitude. Outward conditions have very little to do with it. (۱۱)

”ہمارا ذہنی آرام و سکون جو ہمیں زندگی سے میسر آتا ہے وہ اس بات پر منحصر نہیں ہے کہ ہم کہاں ہیں یا ہمارے پاس کیا ہے یا ہم کون ہیں بلکہ اس کا انحصار سراسر ہمارے ذہنی رویے پر ہوتا ہے۔ خارجی حالات کا اس میں بہت کم عمل دخل ہوتا ہے۔“

ایلیئر روز ویلٹ کا مشاہدہ ہے

"No one can hurt you without your consent." (۱۲)

”کوئی شخص آپ کو آپ کی اجازت کے بغیر تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔“

مندرجہ بالا ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے ساتھ حالات و واقعات اور حادثات کی صورت میں پیش آ رہا ہے وہ اہم نہیں ہے بلکہ اہم چیز وہ ردِ عمل ہے جو ہم اس کے مقابلے میں ظاہر کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہماری شخصیت کے بنانے یا بگاڑنے میں غیر اختیاری حالات و واقعات سے کہیں زیادہ عمل دخل اس چیز کا ہے کہ ہم انہیں کس انداز میں اپنے آپ پر اثر انداز ہونے دیتے ہیں اور ان کا سامنا کرنے کے لئے مثبت یا منفی میں سے کون سا طرزِ فکر و عمل اختیار کرتے ہیں۔

ہمیں اصل تکلیف اپنے ساتھ ہونے والی برائی کی نہیں ہوتی بلکہ اس برائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اپنے ردِ عمل کی ہوتی ہے۔ یقیناً چیزیں، حالات اور واقعات ہمیں طبعی طور پر یا معاشی طور پر

گزند پہنچا سکتے ہیں اور ہم اس سلسلے میں دکھ اور غم کو محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا بنیادی تشخص اور ہمارا کردار اس سے قطعاً متاثر نہیں ہونے چاہئیں۔ بلکہ درحقیقت ہمارے مشکل ترین تجربات ہماری کسوٹی ہوتے ہیں جو کہ ہمارے کردار کو مضبوط بناتے ہیں اور ہمارے اندر ایک قوت پیدا کرتے ہیں۔ اور آئندہ ہمیں ایسے مشکل حالات سے نمٹنے کا اہل بناتے ہیں بشرطیکہ ان کا سامنا حوصلہ مندی سے کیا جائے۔

افراد کی دو اقسام

مسائل، مصائب، مشغلات اور غیر اختیاری حالات و واقعات کا سامنا کرنے کے حوالے سے افراد کی دو قسمیں بن جاتی ہیں:

(i) ذمہ دار لوگ (ii) غیر ذمہ دار لوگ

(i) ذمہ دار لوگ

ذمہ دار لوگ وہ ہوتے ہیں جو کہ اس بات سے مکمل طور پر آگاہ ہوتے ہیں کہ ہمارے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات پر تو بے شک ہمارا اختیار نہیں ہے لیکن ان کے مقابلے میں کس قسم کا رد عمل اختیار کرنا ہے یہ مکمل طور پر ہمارے اختیار میں ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اس اختیار کو بھرپور طریقے سے استعمال میں لاتے ہیں۔ وہ حالات کا رونا روئے، دوسروں کو الزام دینے اور ماحول اور معاشرے کو کوسنے کی بجائے ہر معاملے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں اور اصلاح احوال کے لئے دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی ذہانت و قابلیت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مسائل کو حل کرنے کی طرف پیش رفت کرتے ہیں۔ وہ مسائل کی بجائے مواقع کو دیکھتے ہیں اور اپنی کمیوں اور کمزوریوں کو دیکھنے کی بجائے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو دیکھتے ہیں اور ان سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

(ii) غیر ذمہ دار لوگ

ذمہ دار لوگوں کے برعکس غیر ذمہ دار لوگ کسی بھی معاملے کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ ہر معاملے میں اور ہر جگہ دوسروں کو قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ ہر وقت حالات کا رونا روتے رہتے ہیں۔ ہر وقت مسائل اور محرومیوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ آگے بڑھ کر حالات کو تبدیل کرنے کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی دوسرا آ کر ان کے مسائل کو حل کرے گا۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں تباہ ہوتی رہتی ہیں۔ اور وہ سکڑتے اور محدود ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر کیڑوں مکوڑوں کی سی حقیر زندگی گزار کر بالآخر گنہگار کے قبرستان میں دفن ہو جاتے ہیں۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ اسلام اس حوالے سے کیا کہتا ہے؟

جب ہم قرآن و سنت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر یہ ہدایات ملتی ہیں کہ انسان کو ہر قسم کے حالات میں اپنے اندرونی سکون و قرار کو برقرار رکھنا چاہیے۔ اور کسی بھی قسم کی صورت حال میں اپنے آپ کو منفی سوچ سے بچاتے ہوئے اپنی طے شدہ اقدار کے مطابق طرز فکر و عمل اپنانا چاہیے۔ وضاحت کے لئے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) زندگی میں پیش آنے والے غیر اختیاری حالات و واقعات اور حادثات کے مقابلے میں انسان کو صبر کا ہتھیار دیا گیا ہے۔

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ط
وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ (۱۳)

”اور ہم ضرور تمہیں مختلف چیزوں کے ذریعے سے آزمائیں گے، کبھی خوف اور بھوک میں مبتلا کر کے اور کبھی مال، جان اور رزق میں کمی کے ذریعے سے۔ اور (اے حبیب ﷺ) بشارت دے دیں ان لوگوں کو کہ جنہیں جب بھی کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ عزوجل کی ملکیت ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

یہاں زندگی کے چند امتحانوں کا ذکر کر کے بتایا جا رہا ہے کہ تمہیں مختلف قسم کے نقصانات، حادثات اور ناخوشگوار حالات و واقعات کا سامنا لازماً کرنا پڑے گا۔ اور ان سب کے مقابلے میں صبر کی روش اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور صبر کا مطلب یہی ہے کہ اپنے اندر پیدا ہونے والے منفی خیالات، جذبات اور احساسات کو اپنے کنٹرول میں رکھنا اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس پر اجر و ثواب کا وعدہ بھی کیا جا رہا ہے۔ گویا ایک طرف تو صبر کر کے انسان نے اپنی شخصیت کو منفی اور تخریبی اثرات سے بچا لیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اللہ عزوجل کی بارگاہ سے اجر و ثواب کا مستحق بھی بن گیا۔ ایک اور مقام

پر فرمایا:

لَكَيْلًا تَأْسُوا عَلَىٰ مَا قَاتَكُمُ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمُ. (۱۴)

”جو چیز تم سے چھین جائے اس پر افسردہ اور مایوس نہیں ہونا ہے اور جو کچھ مل جائے اس پر گھمنڈ نہیں کرنا ہے۔“

کسی چیز کے چھیننے پر دل میں غم و اندوہ اور مایوسی کی کیفیت پیدا ہونا اور کسی چیز کے ملنے پر فخر اور گھمنڈ کے جذبات ہونا دونوں ہی نقصان دہ ہیں اور حقیقت پسندی کی روش کے خلاف ہیں۔ لہذا حکم دیا گیا ہے کہ ان دونوں قسم کے جذبات سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

عجبالا امر المؤمن ان امره كله له خير وليس ذالك لاحدا لا للمؤمن ان اصابته سراة شکر و كان خيرا له وان اصابته ضراء صبر و كان خيرا له. (۱۵)

”مومن کا حال عجیب ہے اس کا ہر معاملہ ہی اس کے لئے خیر ہے۔ اور یہ چیز سوائے مومن کے اور کسی کے لئے نہیں ہے۔ اگر اسے کوئی خوشی میسر آتی ہے (یعنی دل پسند معاملہ پیش آتا ہے) تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ شکر کرنا اس کے لئے مزید بہتری لاتا ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور صبر کرنا بھی اس کے لئے بہتر ہوتا ہے۔“

زندگی میں انسان کو ہمیشہ دو حالتوں میں سے کسی ایک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یا تو صورتِ حال اُس کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے یا کسی جگہ مرضی کے مطابق نہیں ہوتی۔ دونوں جگہوں پر انسان کو اپنے اندرونی توازن اور سکون و اطمینان کو برقرار رکھتے ہوئے حقیقت پسندی کی روش اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اور اس پر بہتری اور بھلائی کے حصول کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ یعنی معاملے کو فقط دنیوی نہیں رہنے دیا گیا۔ بلکہ اس کو دینی اور آخری فوائد کے حصول کا ذریعہ بھی بنا دیا گیا۔

(ب) دوسروں کے غلط رویے، ناروا سلوک اور ظلم و زیادتی کے مقابلے میں عفو و درگزر کی تعلیم دی گئی۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ. (۱۶)

”(اے حبیب ﷺ) آپ معاف کرنے والی روش کو اپنائیں اور بھلائی کا حکم دیتے رہیں اور

جاہلوں سے درگزر فرماتے رہیں“

یہاں کس خوبصورتی کے ساتھ دوسرے کے طرزِ عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی سوچی سمجھی روش پر چلنے کا حکم دیا گیا۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ. (۱۷)

”نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ برائی کا ازالہ نیکی سے کر دو“

اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہی شخص جو تمہارا دشمن تھا، دلی دوست بن جائے گا۔

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ. (۱۸)

”برائی کا بدلہ اسی کی مثل ہے (یعنی جتنی زیادتی کسی نے کی ہو اس کے بقدر بدلہ لیا جاسکتا ہے) پس (اس کے باوجود) جو معاف کر دے اور اصلاح والی روش اپنائے تو اس کا اجر اللہ عزوجل کے ذمہ ہے (یعنی اللہ تعالیٰ خود اس کا اچھا بدلہ دے گا)“

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۱۹)

”اور (اللہ کے پسندیدہ بندے) غصے کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ ایسے نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے“

مندرجہ بالا چاروں آیات میں اہل ایمان کو دوسروں کی زیادتیوں اور غلط طرزِ عمل کے باوجود اپنے اندر پیدا ہونے والے منفی جذبات و احساسات پر کنٹرول کرنے اور ہر حال میں اپنے آپ کو ردِ عمل کی نفسیات سے بچاتے ہوئے مثبت روش برقرار رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

یہی حضور ﷺ کی تعلیم بھی ہے اور یہی حضور کی سنت بھی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا:

صَلِّ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَاعْطُ مَنْ حَرَمَكَ. (۲۰)

”جو شخص تجھ سے قطع تعلق کرتا ہے تو اس سے مل اور جو تجھ پر ظلم کرتا ہے تو اس سے درگزر کر اور جو تجھے محروم رکھتا ہے تو اسے عطا کر۔“

کیا یہ حدیث بڑے ہی واضح انداز میں یہ نہیں بتا رہی ہے کہ ہمیں کسی حال میں بھی ردِ عمل کی

نفسیات کا شکار نہیں ہونا ہے۔ اور اپنے طرز عمل کو دوسروں کے تابع نہیں کرنا ہے۔ اس سلسلے میں حضور ﷺ کی اپنی سنت مبارکہ بھی دیکھ لیں۔

وما انتقم رسول الله ﷺ لنفسه في شيء قط (۲۱)

”حضور ﷺ نے اپنی ذات کے لئے ساری زندگی کسی سے بدلہ نہیں لیا“

یہی نہیں کہ بدلہ نہیں لیتے تھے بلکہ ذہن و دماغ کو بھی ہر قسم کے منفی احساسات پاک رکھتے تھے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کو تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

لا يبلغني احدكم عن اصحابي شيئاً فاني احب ان اخرج اليكم وانا سليم
الصدر. (۲۲)

”تم میں سے کوئی شخص میرے کسی صحابی کے بارے میں کوئی (منفی) بات مجھ تک نہ پہنچائے۔ اس لئے کہ میں چاہتا ہوں کہ جب تمہارے پاس آؤں تو میرا سینہ سب کی طرف سے (ہر قسم کے منفی جذبات و خیالات سے) پاک ہو“

حضور ﷺ اس مثبت روش پر قائم رہنے کے لئے ہر قسم کی قیمت ادا کرنے کے لئے بھی تیار تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

فانا احب ان اكون كريماً مغلوباً ولا احب ان اكون لئيماً غالباً. (۲۳)

”میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ نرمی اور ملائمت کی روش پر برقرار رہتے ہوئے فریق مخالف سے مغلوب ہو جاؤں۔ لیکن مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میں ترش روی اور سختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرے پر غالب آ جاؤں۔“

حضور ﷺ سے ایک شخص نے نصیحت مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”لا تغضب“ غصہ نہ کر۔ (۲۴)

اُس کے دوسری اور تیسری مرتبہ پوچھنے کے جواب میں بھی آپ نے یہی بات دہرائی۔ اب غصہ کیا چیز ہے؟ نا خوشگوار اور ناپسندیدہ صورت حال کے پیش آنے پر قلب و ذہن میں منفی احساسات کا پیدا ہونا۔ اس سے روکا جا رہا ہے اور حکم دیا جا رہا ہے کہ باہر کی صورت حال جو بھی اور لوگوں کا طرز عمل

جیسا بھی ہو لیکن اس کے منفی اثرات تمہارے دل و دماغ میں پیدا نہیں ہونے چاہئیں۔ اور تمہیں ہر حال میں اپنے اندرونی سکون و اطمینان برقرار رکھتے ہوئے مثبت روش پر قائم رہنا چاہیے۔

سیدنا فاروق اعظمؓ کا ایک بہت ہی خوبصورت قول ہے:

(۲۵) مَا عَاقَبْتَ لِمَنْ عَصَى اللَّهَ فَيَكُ بِمِثْلِ أَنْ تَطِيعَ اللَّهَ فِيهِ.

”جو شخص تیرے معاملے میں اللہ عزوجل کی حدود کو پامال کر رہا ہے اس سے بدلہ لینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تو اس کے معاملے میں اللہ عزوجل کی حدود کا لحاظ رکھ“

(ج) جہاں تک غیر اختیاری معاملات مثلاً امارت و غربت، جسمانی ساخت، شکل و صورت، خاندان وغیرہ کا تعلق ہے تو اس کا حل اسلام نے ”تسلیم و رضا“ بتایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ. (۲۶)

”اللہ عزوجل نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت دی ہے تو اس کی خواہ مخواہ اپنے لئے تمنا نہ کرو (یعنی حسد میں مبتلا نہ ہوں)“

www.kitabosunnat.com

حضور ﷺ نے فرمایا:

إِذَا نَظَرَ أَحَدُكُمْ إِلَى مَنْ فَضَّلَ عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْهُ ذَلِكَ إِذْنِي لِأَنْ تَذُورَ وَأَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ. (۲۷)

”جب تم میں سے کسی کی نظر کسی ایسے شخص کی طرف پڑے جسے جسمانی حالت یا مال میں اس پر فضیلت دی گئی ہو تو اسے چاہیے کہ فوراً اپنے سے کمتر کی طرف دیکھے۔ یہ اس بات کے قریب ہے کہ اپنے پاس موجود نعمت کو حقیر نہ سمجھا جائے“

بقول حضرت واصف علی واصف:

”خوش نصیب انسان وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش رہے۔“ (۲۸)

امارت و غربت اور جسمانی شکل و شبابت وغیرہ جیسی چیزیں غیر اختیاری ہیں لیکن ان کو اپنے اوپر کس انداز میں اثر انداز ہونے دینا ہے یہ انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ اسلام کی منشاء یہ ہے کہ

انسان کسی بھی غیر اختیاری واقعہ کو اپنے اوپر منفی انداز میں اثر انداز نہ ہونے دے۔

(د) اسی طرح زندگی کے اندر ج طوفان، رکاوٹیں، مخالفتیں اور مزاحمتیں آتی ہیں اُن کا حل اسلام ثابت قدمی اور استقامت بتاتا ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۲۹﴾

”پست ہمت نہ ہونا اور نہ ہی غم کرنا اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم سچے مومن ہو۔“

ہمت ہار دینا اور خوف و غم میں مبتلا ہو جانا یہ سارے کے سارے وہ منفی تاثرات اور احساسات ہیں جو انسان کی بہترین صلاحیتوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اسلام ان کا مقابلہ صبر و استقامت کے ساتھ اور بلند حوصلگی کے ساتھ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے انسان کو امید کا پہلو دکھاتے ہوئے کہا جا رہا ہے۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۳۰﴾ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۳۰﴾

”پس بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے“

ایک اور جگہ پر ارشاد فرمایا:

سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ﴿۳۱﴾

”عقرب اللہ تعالیٰ مشکل کے بعد آسانی بھی پیدا کر دے گا“

اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أَفْضَلُ الْعِبَادَةِ أَنْتَظَارُ الْفَرْجِ ﴿۳۲﴾

”کشادگی کا انتظار بہترین عبادت ہے۔“

مندرجہ بالا چند اقتباسات جو قرآن و حدیث سے پیش کئے گئے ہیں (جو کہ دیگ میں سے چند دانوں کے برابر ہیں) کیا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں کہ دانش انسانی صدیوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جو کچھ بتا رہی ہے دانش برہانی بہت پہلے سے ہی وہ سب کچھ بتا چکی ہے۔ بلکہ اس سے بہت کچھ زیادہ بھی اور اس فرق کے ساتھ کہ دانش انسانی فقط دنیوی زندگی کی بہتری کے لئے یہ سب کچھ

بتا رہی ہے جبکہ دانش برہانی اسے صرف دنیوی زندگی تک محدود نہیں کر رہی بلکہ دنیوی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کا رشتہ و نانا تا آخری فلاح اور اجر و ثواب کے ساتھ جوڑتے ہوئے اسے عبادت قرار دے رہی ہے۔

مسئلہء جبر و قدر

ہمارے ہاں تصوف کے اندر صدیوں سے یہ مسئلہ الجھا چلا آ رہا ہے کہ انسان مجبور محض ہے یا مکمل طور پر با اختیار۔ صوفیاء کرام کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ انسان کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی سی ہے جو کسی اور کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ چنانچہ انسان کے حوالے سے اس کے بنانے والے نے جو سکرپٹ لکھ دیا ہے اس نے بس اسی کے مطابق اداکاری کرنی ہے اور اس سلسلے میں اس کا اپنا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرا نقطہء نظر یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مکمل طور پر با اختیار بنا کر بھیجا ہے۔ اور وہ اپنی اچھی بری تقدیر کا خود ہی ذمہ دار ہے۔

اول الذکر نقطہء نظر کو صحیح مان لیا جائے تو انسان کی حیثیت محض کمپیوٹر کی بن جاتی ہے۔ کہ جس کے اندر بنانے والے نے جو پروگرامنگ فیڈ کر دی ہوتی ہے وہ اسی پر عمل پیرا ہونے پر مجبور ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں انسانی عظمت کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ اس سے کہیں بلند ہے۔ بالفاظ دیگر یہ انسان کو Under-Estimate کرنے کے مترادف ہے۔ دوسری طرف اگر مؤخر الذکر نقطہء نظر کو درست مان لیا جائے اور انسان کو ہر حوالے سے مکمل طور پر با اختیار مان لیا جائے تو خدا کے مقابلے میں انسان کی جو عاجزانہ حیثیت ہے یہ تصور اس سے مطابقت رکھتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ بالفاظ دیگر یہ انسان کو Over-Estimate کرنے والی بات ہے۔

راقم کے خیال میں حقیقت ان دونوں انتہاؤں کے درمیان کہیں موجود ہے۔ اس حوالے سے حضرت علیؑ کا واقعہ بھی مشہور ہے کہ جب اسی حوالے سے ان سے سوال کیا گیا کہ انسان کتنا مجبور اور کتنا مختار ہے؟ تو انہوں نے سائل کو ایک ٹانگ اوپر اٹھانے کو کہا۔ اس نے اٹھائی تو پھر آپؑ نے دوسری اٹھانے کو کہا۔ اس کے بے بسی کا اظہار کرنے پر آپؑ نے فرمایا کہ انسان اتنا ہی مجبور اور با اختیار ہے۔ گویا معاملہ فنشٹی فنشٹی کا ہے۔ جملہ معاملات میں انسان کی مجبوری اور خود مختاری کو اس مثال سے بخوبی سمجھا جا

(۳۳)۔

ہماری گفتگو کے تناظر میں اس مسئلے کا ایک آسان حل یہ ہے کہ انسان کو بعض معاملات میں مجبور مان لیا جائے اور بعض میں با اختیار۔ تفصیل اس اجمال کی ہے کہ انسان اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات، واقعات اور حادثات کے سلسلے میں تو مجبور ہے۔ یہ ساری چیزیں اس کے اختیار سے باہر ہیں۔ لیکن ان تمام معاملات میں کیا طرز فکر اختیار کرنا ہے اور کون سا رد عمل اپنانا ہے یہ چیز بہر حال اس کے اپنے ہی اختیار میں ہے اور اسی رد عمل کے انتخاب پر ہی اس کی دنیا و آخرت کی کامیابیوں یا ناکامیوں اور نامرادیوں کا دار و مدار ہے۔

ہمیں زندگی میں جو حالات و واقعات اور حادثات پیش آتے ہیں وہ ہمارے لئے محرکات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور فکر و عمل کی سطح پر کوئی رد عمل اختیار کرنے پر اکساتے ہیں۔ عام طور پر ہم بلا سوچے سمجھے ہی رد عمل اختیار کرتے ہیں جس کی وجہ سے کئی مرتبہ ہمیں نقصان یا پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم کسی طرح اپنے رد عمل کو منظم کرنے اور اسے اپنی سوچی سمجھی اقدار کے تحت رکھنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم ہر قسم کی صورت حال کا سامنا بہترین انداز میں کر سکتے ہیں۔ اور اسے اپنی شخصیت کی تعمیر و ترقی اور ارتقاء کا ذریعہ بنانے کے ساتھ ساتھ دنیا و آخرت کی سرفرازیاں حاصل کر سکتے ہیں۔

چار اناشہ جات

رد عمل کے انتخاب اور اس کو منظم کرنے کے حوالے سے ہمیں قدرت کی طرف سے چار قسم کے اناشہ جات دیے گئے ہیں۔ جن کو انسان کے چار فطری ہتھیار بھی کہا سکتا ہے۔ جو ہر انسان کو پیدائش کے ساتھ ہی مل جاتے ہیں۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے پاس موجود ان چار انمول عطیات کی اہمیت اور قدر و قیمت کو پہچانیں، ان کی حفاظت و نگہداشت کریں، ان کی بہتری اور تعمیر و ترقی میں کوشاں رہیں اور مسائل حیات سے نبرد آزما ہونے کے سلسلے میں ان کو دانش مندی کے ساتھ استعمال میں لائیں۔ یہ مندرجہ ذیل ہیں:

(i) خود آگاہی (Self awareness)

خود آگاہی کا مطلب ہے، اپنے آپ سے آگاہ ہونا، اپنے احوال، خیالات اور حالات کا تجزیہ

رکنے کی صلاحیت۔ اپنے مقام و مرتبے کو پہچاننا، اپنا احتساب کر سکتا۔ نیز اپنی ذات کو اپنے اعمال سے الگ کر کے دیکھ سکتا وغیرہ۔

بقول قرآن مجید:

بل الانسان على نفسه بصيرة. (۳۴)

”بلکہ انسان اپنے نفسی اعمال پر خوب نظر رکھتا ہے“

(ii) تخیل (Imagination)

تخیل انسانی ذہن کی وہ صلاحیت ہے جس کی بدولت وہ موجودہ حالات سے اوپر اُٹھ کر سوچ سکتا ہے۔ ماضی و مستقبل میں جھانک سکتا ہے، نئے امکانات پر غور کر سکتا ہے اور ہر قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لئے بہتر راستے سوچ سکتا ہے۔

(iii) ضمیر (Conscience)

انسانی قلب کے اندر اچھائی اور برائی میں تمیز کا ایک پیمانہ رکھ دیا گیا ہے جسے ضمیر کہا جاتا ہے۔ یہ انسان کو بتاتا ہے کہ ذہن میں آنے والے تصورات و تخیلات میں سے کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ معاملات میں کونسی روش جائز ہے اور کون سی ناجائز ہے۔

قرآن مجید نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

فَالْهَمُّهَا فُجُورُهَا وَتَقْوَاهَا. (۳۵)

”پس اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسان میں برائی اور اچھائی دونوں کا شعور ودیعت کر دیا۔“

(iv) خود مختار ارادہ (Independent will)

مندرجہ بالا تین چیزوں کے ساتھ ساتھ چوتھی چیز انسان کو اختیار اور ارادے کی آزادی بھی دی گئی ہے۔ تاکہ وہ جس چیز کو صحیح سمجھے اس کو اپنے اختیار اور ارادے سے عمل میں لاسکے اور جس چیز کو غلط سمجھے اسے چھوڑ سکے۔ جزا و سزا کا سارا فلسفہ بھی اسی کے گرد گھومتا ہے۔

اللہ رب العزت نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ. (۳۶)

”بے شک ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔“

مندرجہ بالا چاروں منفرد انسانی اثاثے ہیں جو ہمیں عظمت و فضیلت کی مسند پر بٹھاتے ہیں اور جانوروں کی دنیا سے افضل بناتے ہیں۔ ہم جس قدر انہیں استعمال کرتے ہیں اور ان کی نشوونما پر توجہ دیتے ہیں اسی قدر ہم اپنے انسانی جوہر کو بروئے کار لانے کے قابل ہوتے ہیں۔ محرک اور رد عمل کے درمیان چناؤ کی آزادی ہی میں ہماری سب سے بڑی طاقت پنہاں ہے جو ہمیں ایک خاص مقام عطا کرتی ہے۔ ذہین ترین جانور کے پاس بھی یہ اثاثے نہیں ہیں۔ اگر ہم کمپیوٹر کا استعارہ استعمال کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جانور اپنی جبلت اور کسی حد تک تربیت کی پروگرامنگ کے مطابق چلتے ہیں۔ ان کو ذمہ داری کی تربیت دی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ اس تربیت کی ذمہ داری لے نہیں سکتے یعنی وہ خود اپنی تربیت نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں قوت فیصلہ نہیں رکھتے۔ اور نہ ہی انہیں اس کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن ہم اپنی ٹریننگ اور جبلت کے مقابل ان منفرد اثاثوں کی بدولت اپنی پروگرامنگ تبدیل کر سکنے کے اہل ہیں۔ اور اپنے بارے میں نئے نئے پروگرام تشکیل دے سکنے پر قادر ہیں۔ اسی لئے جانوروں کی اہلیت محدود ہوتی ہے اور ان کی نسبت انسانوں کی اہلیت کی کوئی انتہا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جانوروں کی تہذیب و تمدن، ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقے آج بھی وہی ہیں جو ہزاروں سال پہلے تھے۔ لیکن اس عرصہ میں انسانی تہذیب و تمدن ترقی اور ارتقاء کے کئی زینے چرھ چکی ہے اور ہر معاملے میں بے شمار تبدیلیاں آچکی ہیں۔ یہ سب کچھ نتیجہ ہے ہمارے ان فطری اثاثوں کے استعمال کا جن سے جانوروں کی دنیا محروم ہے۔

یہ بات ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ قدرت کی طرف سے ہمیں ان اثاثہ جات کی صورت میں تعمیر و ترقی کے جو بے شمار مواقع جات اور امکانات دیے گئے ہیں انہیں اپنے حق میں واقع بنانے اور ان سے بھرپور استفادہ کرنے کے لئے ان کی حفاظت کرنا، ان کی نشوونما اور ارتقاء کے لئے کوشاں رہنا

اور ان کو شعوری طور پر استعمال میں لانا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ہم جانوروں کی طرح محض اپنی جبتوں، تربیت اور ماحول کے زیرِ اثر آجاتے ہیں اور اپنے آپ کو محدود کر لیتے ہیں اور شرفِ انسانیت کے بلند ترین منصب سے اپنے آپ کو گرا کر جانوروں کی سطح پر لے آتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان سے بھی پست سطح پر جی رہے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے

أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ. (۳۷)

”یہ جانوروں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی پست ترین“

مسائل کی تین اقسام

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ زندگی کے مسائل، مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنے کا ذمہ دارانہ رویہ (Proactive Attitude) کون سا ہے۔ اس حوالے سے جاننے کے لئے پہلے اس بات کو سمجھیں کہ ہمارے مسائل تین اقسام کے ہیں۔

(i) براہِ راست کنٹرول: وہ مسائل جن کا تعلق ہمارے اپنے رویوں، عادات اور انداز و اطوار سے ہوتا ہے۔

(ii) بالواسطہ کنٹرول: وہ مسائل جن کا تعلق دوسرے لوگوں کے رویوں اور طور طریقوں سے ہوتا ہے۔

(iii) بیلا کنٹرول: وہ مسائل جو ہمارے دائرہ اختیار سے مکمل طور پر باہر ہوتے ہیں۔ اور ان سے متعلق ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہمارا رنگ، نسل، خاندان، قبیلہ، وغیرہ۔

سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر ہم ان مسائل پر غور کرنا شروع کر دیں جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے اور ان معاملات کے متعلق سوچنا، جلنا، کڑھنا اور ہر وقت خواجواہ غور و فکر کرتے رہنا شروع کر دیں جن کو ہم تبدیل ہی نہیں کر سکتے تو ہم اپنا وقت اور توانائیاں یونہی بلاوجہ ضائع کرتے چلے جائیں گے اور آخر میں ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔ مثلاً ہم نہ تو اپنے رنگ کو تبدیل کر سکتے ہیں، نہ اپنے خاندان یا قبیلے کو اسی طرح ہمارا ماضی بھی اچھا یا بُرا جیسا بھی تھا اب اسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ مستقبل میں کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا یہ بھی ہمارے بس میں نہیں ہے اگر ہم ان چیزوں پر یا ان جیسی دوسری بہت

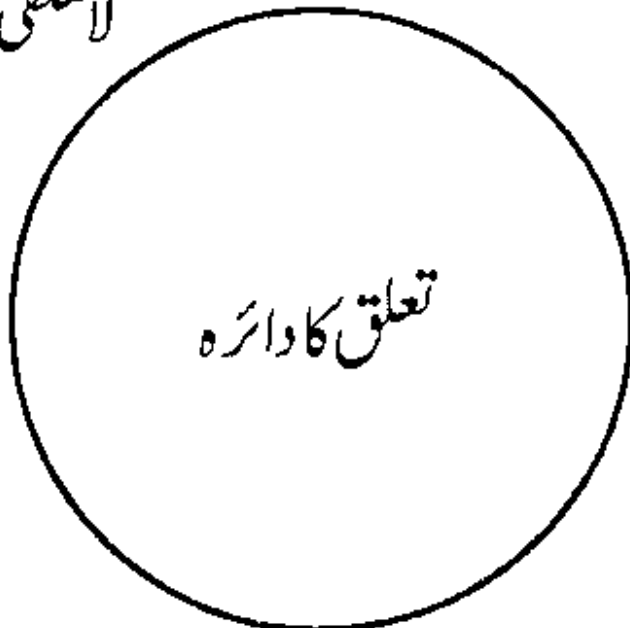
ساری چیزوں پر جو ہمارے اختیار سے باہر ہیں اپنی توجہ کو مرکوز کئے رکھیں تو ہماری زندگی ضائع ہوتی چلی جائے گی، حوصلے پست ہو جائیں گے، ہمت جواب دیتی چلی جائے گی اور ہم دنیا کی سٹیج پر اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔

جہاں تک ان مسائل کا تعلق ہے جو بلا واسطہ ہمارے کنٹرول میں ہیں۔ مثلاً دوسروں کا ہمارے ساتھ رویہ نیز ہمارے جملہ متعلقین کے طور طریقے، تو یہ بھی ایسی چیزیں ہیں کہ جن پر ہمیں سو فیصد اختیار نہیں ہے۔ لہذا اگر ہم دوسروں کے حوالے سے غور و فکر کرتے رہیں اور ان کی خامیوں پر جلتے، کڑھتے رہیں اور ہر وقت ان کو درست کرنے کے درپے رہیں تو اس طرح بھی ہم اپنے وقت اور صلاحیتوں کے استعمال کی صورت میں جو قیمت ادا کر رہے ہوں گے اُس کے مطابق ہمیں بدلہ قطعاً نہیں ملے گا بلکہ اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ ہم منفی نفسیات، مایوسی، اور پست ہمتی کا شکار ہو جائیں۔ اور ہمارے دلوں میں دوسروں کے حوالے سے نفرت اور رنجشیں پیدا ہو جائیں جو خوشگوار تعلقات کو تباہ کر دیں۔ نیز دوسروں کو ہم سے متنفر کر دیں۔

جہاں تک تیسری قسم یعنی براہ راست کنٹرول کا تعلق ہے تو یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں ہمیں سو فیصد اختیار حاصل ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق مکمل طور پر ہمارے اپنے خیالات، جذبات، احساسات، عادات و اطوار اور رویہ جات سے ہے۔ لہذا یہاں ہماری کوششیں اور کاوشیں نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ہمیں سب سے زیادہ اپنی توجہ اپنے آپ کو بہتر بنانے پر مرکوز کرنی چاہیے۔

اس تصور کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل دائرے پر غور کریں:

لا تعلق



دائرے کے اندر کا حصہ ان تمام معاملات سے متعلق ہے جو کسی نہ کسی طرح ہماری ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں ہم خود بھی شامل ہیں اور ہمارے جملہ متعلقین بھی شامل ہیں جبکہ دائرے کے باہر وہ معاملات ہیں جن پر ہمارا کنٹرول ہی نہیں ہے۔ مثلاً تیسری عالمی جنگ کب لگتی ہے؟ لگے گی یا نہیں۔ اگر لگتی ہے تو پھر کیا ہوگا؟ یہ ایک عام آدمی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کے متعلق کچھ کر سکے۔ چنانچہ اگر وہ اس حوالے سے سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہے تو یہ مفت میں اپنے وقت اور توانائیوں کو ضائع کرنا ہوگا۔ جس کا دوسرا مطلب خود اپنے آپ کو ضائع کرنا ہے۔ اس حوالے سے اسلام کا اصول یہ ہے کہ:

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا. (۳۸)

”اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا“

چنانچہ ایک بندہ مؤمن کے لئے حکم یہی ہے کہ وہ ایسے تمام امور کو جو اس کی طاقت اور استعداد سے باہر ہوں ان کو اللہ عزوجل کے حوالے کرتے ہوئے یہ کہے:

وَأَفْوِضْ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (۳۹)

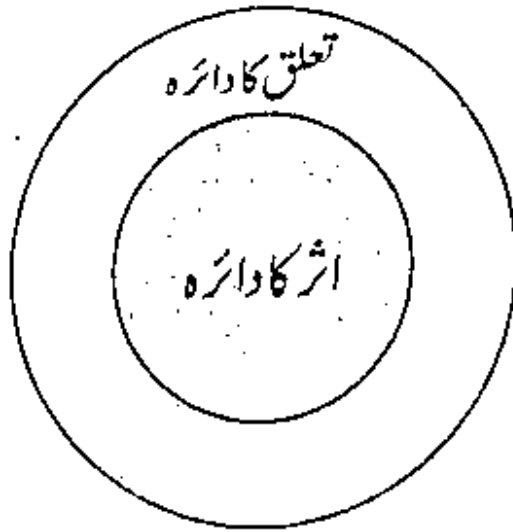
”اور میں اپنے معاملے کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں بیشک اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے“

اور اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں ایسی کارآمد جگہوں پر خرچ کرے جہاں سے مثبت نتائج کے ملنے کی توقع ہو۔ مستقبل کے حوالے سے ایسے تمام خدشوں اور اندیشوں کا حل اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا اور اس سے پناہ مانگنا ہے جیسا کہ حضور ﷺ کی بہت سی دعائیں استعاذہ کے حوالے سے منقول ہیں۔ ماضی کی غلطیوں، کوتاہیوں، لغزشوں، اور خطاؤں کو سوہان روح بنالینے کی بجائے ان کا حل استغفار ہے یعنی سچے دل سے اللہ عزوجل سے معافی مانگنا، آئندہ کے لئے ان سے بچنے کا عزم کرنا اور پھر انہیں بھول جانا۔ بقول ابوانیمس صوفی برکت علی صاحب:

”ماضی و مستقبل کوئی چیز نہیں حال کو سنبھال“، (۴۰)

اسی طرح زمانہ حال میں جن غیر اختیاری معاملات کا سامنا ہو مثلاً اپنے خاندان، قبیلے، رنگ، نسل، یا ذات وغیرہ کا ناپسندیدہ ہونا، یا ناگہانی آسمانی وزینی آفات وغیرہ کا شکار ہونا۔ ان سب کا حل

تسلیم و رضا کی روش کو اپنانا ہے۔ اور صبر و استقامت کے ساتھ ان کو برداشت کرنا ہے۔ تاکہ انسان اپنی توانائیوں اور وقت کو (جو قدرت کے انمول عطیے ہیں) ضائع ہونے سے بچا کر انہیں اپنی ترقی اور ارتقاء کے سفر میں استعمال کر سکے۔ اب مندرجہ ذیل شکل پر غور کریں:



اس شکل میں تعلق کے دائرے کے اندر ایک اور دائرہ لگایا گیا ہے جسے اثر کا دائرہ کہا جا سکتا ہے۔ تعلق کے دائرے میں انسان کے جملہ متعلقین آتے ہیں۔ مثلاً والدین، بیوی، بچے، بہن، بھائی، باس، ماتحت، دوست احباب وغیرہ۔ ان سب میں انسان ہونے کے ناطے کئی کیفیات اور خامیاں لازماً موجود ہوتی ہیں۔ اور کئی مرتبہ ان کا رویہ معقولیت سے ہٹا ہوتا ہے۔ یہ چیز قدم قدم پر انسان کے اندر منفی جذبات و احساسات ابھارتی ہے۔ اور اسے دوسروں کے ساتھ نکرانے پر آمادہ کرتی ہے۔ بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان بہت خلوص کے ساتھ ان کی اصلاح کے لئے کوششیں کر رہا ہوتا ہے لیکن مطلوبہ نتائج نظر نہ آنے کی صورت میں اس کے اندر غصہ، نفرت، جھنجلاہٹ جیسے منفی خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ جو دل اور دماغ کے سکون کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ اور اس کے ذہن کو منفی سوچوں سے بھر دیتے ہیں۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ دوسرے لوگ کسی نہ کسی درجے میں تو ہمارے زیر اثر ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ سو فیصد ہماری مرضی کے تابع نہیں۔ لہذا یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ وہ عین ہماری مرضی کے مطابق ڈھل جائیں۔ جب ہمیں ان پر مکمل طور پر اختیار نہیں ہے تو پھر ان کی مکمل اصلاح بھی ہماری ذمہ داری میں شامل نہیں ہے۔ اور ان کا بگاڑ ہمیں نقصان نہیں دے سکتا ہے۔ بقول قرآن مجید:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ. (۴۱)

”اے ایمان والو! تمہارے اوپر اپنی ہی اصلاح لازم ہے۔ تم اگر ہدایت پر آجگے تو کسی

دوسرے کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں دے گی“

ایک اور جگہ اور اشاد فرمایا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ. (۴۲)

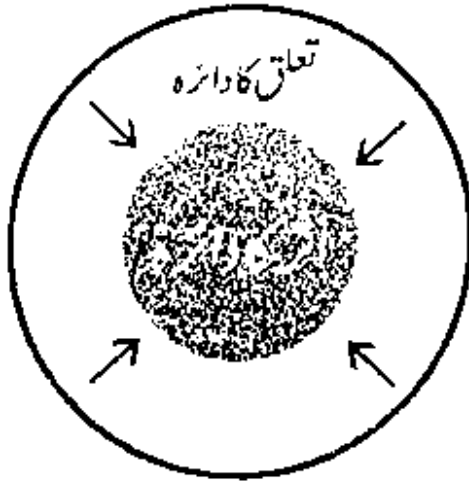
”ہر شخص کے لئے وہی بدلہ ہے جو اس نے کمایا اور اس کے برے کاموں کا وبال بھی اسی پر ہے“

اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ ہم دوسروں کی طرف سے مکمل طور پر آنکھیں بند کر لیں۔ ہمیں حکمت اور تدبیر کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو دوسروں کی صلاح کے لئے کوشش تو ضرور کرنی چاہیے۔ مگر جبر اور سختی کے ذریعے سے دوسروں کو اصلاح کی طرف لانے کی روش ترک کر دینی چاہیے۔ نیز مطلوبہ نتائج نہ ملنے کی صورت میں خواجواہ دل کو جلانا بھی نہیں چاہیے۔ اسی طرح دوسروں کے غلط رویہ جات پر اپنے دل و دماغ میں آگ لگا لینا اپنے آپ کو ہی تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ اسی لئے اسلام عفو و درگزر کی اتنی تلقین کرتا ہے۔ تاکہ انسان کا سینہ منفی جذبات و احساسات سے خالی رہے اور وہ اپنے آپ کو منفی، تخریبی، غیر صحت مند اور بیمار سوچوں میں ضائع نہ کرتا رہے۔

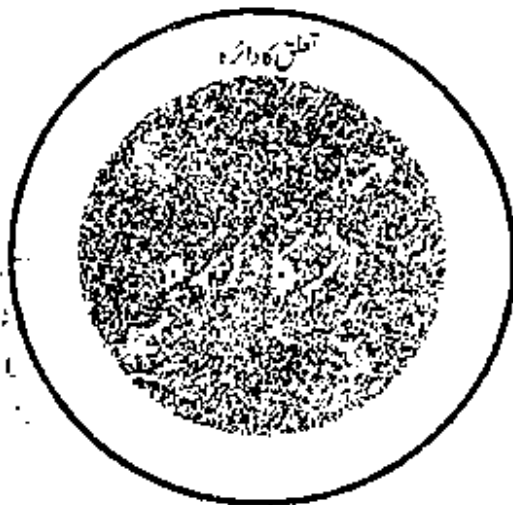
جہاں تک ہمارے اثر کے دائرے کا تعلق ہے تو یہی وہ جگہ ہے جو ہمارے مکمل اختیار میں بھی ہے اور یہاں ہماری کوششوں اور کاوشوں کا بہترین پھل ہمیں مل بھی سکتا ہے۔ نیز اس پر توجہ دینے اور اسے بہتر بنانے میں ہی ہماری دنیا اور آخرت کی بھلائیاں اور سعادتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ دائرہ مکمل طور پر ہماری اپنے ذات سے متعلق ہے۔ اس میں ہماری اپنی ذات، ہمارے خیالات، احساسات، افکار و تصورات، عادات و اطوار اور دوسروں کے ساتھ ہمارے رویہ جات وغیرہ جیسی تمام چیزیں شامل ہیں۔ ہم جتنی زیادہ ان چیزوں پر محنت کر کے انہیں بہتر سے بہتر بناتے جائیں گے اور ان کی اصلاح کرتے جائیں گے۔ اسی مناسبت سے زندگی کے دامن کو خوشیوں، مسرتوں اور کامیابیوں و کامرانیوں سے بھرتے چلے جائیں گے یہی پہلی عادت کا تقاضہ ہے اور یہی ذمہ دار لوگوں کا طریقہ ہے۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنے تعلق کے دائرے میں زیادہ وقت لگاتا ہے یعنی دوسرے لوگوں کے رویہ جات اور ان کی عادات و اطوار کے حوالے سے سوچ بچار کرتا رہتا ہے اور ان کے ناپسندیدہ طرز عمل کے متعلق غصے اور پریشانی میں مبتلا ہوتا رہتا ہے یا ان پر اپنا رد عمل ظاہر کرتا رہتا

ہے اور انہیں تبدیل کرنے کے درپے رہتا ہے تو اس کا اثر کا دائرہ سکڑتا چلا جاتا ہے اور تعلق کا دائرہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جن چیزوں کے حوالے سے وہ پریشان تھا اور انہیں تبدیل کرنا چاہتا تھا وہی چیزیں دن بدن پہلے سے زیادہ اس پر حاوی ہوتی چلی جاتی ہیں اور اس کی آزادی محدود ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ صورت حال کچھ یوں بنتی ہے:



اس کے برعکس جب انسان اپنا زیادہ وقت اثر کے دائرے میں صرف کرتا ہے۔ یعنی اپنی ذات کی اصلاح، اپنی خامیوں پر قابو پانے اور اپنے رویہ کو بہتر بنانے کے حوالے سے غور و فکر کرتا ہے اور اس سلسلے میں عملی اقدامات اٹھاتا ہے بالفاظ دیگر وہ دوسروں کے پیچھے پڑنے کی بجائے اپنے پیچھے پڑ جاتا ہے یا دوسروں کو فتح کرنے کی بجائے اپنے آپ کو فتح کرنے کے سفر پر چل پڑتا ہے ماحول کو مسخر کرنے کی بجائے اپنے آپ کو مسخر کرنے میں لگ جاتا ہے تو ہر آنے والے دن اس کے اثر کا دائرہ پھیلتا چلا جاتا ہے اور تعلق کا دائرہ سکڑتا چلا جاتا ہے اور دن بدن اس کی آزادی پھیلتی چلی جاتی ہے اور دوسرے لوگوں کے رویہ جات اور ماحول کی کئی دوسری چیزیں اور معاملات بھی اس کے زیر اثر آنے لگتے ہیں۔ اس صورت حال کو کچھ یوں ظاہر کیا جاسکتا ہے:



بعض اوقات یہ اثر کا دائرہ اتنا پھیل جاتا ہے کہ تعلق کا دائرہ مکمل طور پر اس کے اندر آ جاتا ہے

اور معاملہ یوں بن جاتا ہے:



اپنے اثر کے دائرے پر توجہ مرکوز کرنے سے یہ کس طرح پھیلتا ہے اور تعلق کا دائرہ کیسے سمٹتا ہے اس سلسلے میں تاریخ کے اندر بے شمار مثالیں ہر دور میں موجود ہیں۔ تاہم یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

(۱) حضرت یوسفؑ کے ساتھ بچپن میں جو کچھ ہوا تفصیل و صراحت سے قرآن مجید میں مذکور ہے اور قرآن مجید نے اس واقعے کو ”احسن القصص“ یعنی ”بہترین قصے“ کا عنوان دیا ہے۔ ان کو بچپن میں بھائیوں کی طرف سے بے دردی کے ساتھ کنویں میں ڈال دیا جانا، پھر ایک غلام کی حیثیت سے فروخت کیا جانا، پھر ایک بالکل غلط الزام میں کئی سال کے لئے جیل میں ڈال دیا جانا وغیرہ جیسی چیزیں وہ تھیں جو ساری کی ساری ان کے تعلق کے دائرے میں تھیں۔ یعنی ان سب باتوں کا تعلق دوسروں کے رویہ جات سے تھا۔ یہ ان کے اثر کے دائرے سے باہر تھیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پوری کہانی میں کسی بھی جگہ پر حضرت یوسفؑ دوسروں کا شکوہ شکایت کرتے یا حالات کے حوالے سے جلتے اور کڑھتے دکھائی نہیں دیتے۔ نہ اپنی بے بسی کا رونا روتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی اپنی مظلومی اور محرومی پر خود ترسی کا شکار ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا انہوں نے تعلق کے دائرے کی تمام چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ اپنے اثر کے دائرے یعنی اپنے آپ کو بہتر بنانے پر مرکوز کر لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اثر کا دائرہ پھیلتا گیا اور ایک دن وہ بھی آیا جب اثر کا دائرہ اتنا بڑا ہو گیا کہ تعلق کا دائرہ مکمل طور پر ہی اس میں ضم ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ مصر کی حکومت جو کہ بظاہر ان کے تعلق کے دائرے سے بھی باہر لا

تعلقی کے دائرے میں تھی وہ بھی ان کے اثر کے دائرے میں آگئی۔

(۲) حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ کفار مکہ تیرہ سال ظلم و ستم کرتے رہے ہر طرح سے تنگ کرتے رہے اور اس مقصد کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ اختیار کرتے رہے۔ نیز جن بتوں سے کعبہ کو پاک کرنے کے لئے اسلام کا ظہور ہوا تھا وہ بھی ابھی تک بڑے کزدفر کے ساتھ کعبہ کے صحن میں پڑے ہوئے تھے اور ان کی پوجا بھی ہو رہی تھی۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے کئی مرتبہ صحابہ کرام کا پیاناہ صبر لبریز ہونے کو آتا اور وہ اس حوالے سے کوئی قدم اٹھانے کے لئے آقا ﷺ سے اجازت بھی طلب کرتے مگر یہ ساری باتیں تعلق کے دائرے کی تھیں اور ابھی اثر کا دائرہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ صورت حال کو بدلنے کے لئے کوئی نتیجہ خیز قدم اٹھایا جاسکتا۔ چنانچہ صبر و تحمل سے یہ سب کچھ برداشت ہوتا رہا۔ قرآن بھی اترتا رہا۔ لیکن ایک آیت بھی اس حوالے سے نہ آئی بلکہ عبادات کے حوالے سے آیات آتی رہیں جن کا مقصد اثر کے دائرے پر محنت کرتے ہوئے اسے بڑھانا اور اپنے آپ کو مضبوط کرنا تھا۔ تیرہ سال بعد خاموشی سے ہجرت مدینہ عمل میں آرہی ہے۔ بعد ازاں مدینہ منورہ میں جانے کے بعد جب اہل اسلام اندرونی طور پر اتنے مضبوط ہو گئے اور ان کے اثر کا دائرہ اتنا بڑا ہو گیا کہ عملی طور پر ٹکری جاسکتی تھی تو اب قرآن کی آیت نازل ہوئی:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كَلَهُ اللَّهُ. (۳۳)

”اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ کفر و شرک کا فتنہ ختم ہو جائے اور دین سارے کا سارا اللہ عزوجل کے لئے ہو جائے (یعنی توحید کا غلبہ ہو جائے)“

چنانچہ پھر وہ وقت بھی آیا جب فتح مکہ کے موقع پر اثر کا دائرہ اتنا پھیل چکا تھا کہ تعلق کے دائرے کی ساری طاقتیں اس کے سامنے سرنگوں ہو گئیں۔ یہ سلسلہ یہاں تک ہی نہ رہا بلکہ روم و شام اس وقت کی عالمی طاقتیں (Super powers) تھیں اور بظاہر تعلق کے دائرے سے بھی باہر لا تعلق کے زمرے میں آتی تھیں ان کو بھی فتح کر کے اثر کے دائرے میں شامل کر لیا گیا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کا دریائے نیل کے نام رقعہ لکھنا اور اس کا چل پڑنا، آپ کا ہزاروں میل لڑتے ہوئے اسلامی لشکر کو دیکھنا اور اپنے غلام ساریہ کو وہیں سے رہنمائی دینا، ”حضرت آصف بن برخیا“ کا پلک جھپکتے میں ہزاروں میل دور پڑے ہوئے تخت کو حاضر کر دینا اور بے شمار اولیاء کی اسی طرح

کی کرامات اس کی واضح مثالیں ہیں کہ جہاں اثر کا دائرہ اتنا پھیل جاتا ہے کہ وہ نہ صرف تعلق کے دائرے بلکہ لاتعلقی کے دائرے کی چیزوں پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔

اس صورتِ حال کی وضاحت کے لئے ایک پادری کا قول بہت خوبصورت ہے جسے سین گودے (مصنف کا بیٹا) نے اپنی کتاب "The 7 habits of highly effective teenagers" (یہ کتاب ہماری زیر بحث کتاب سے الگ ہے) میں بیان کیا۔ اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے فقط ترجمہ پر اکتفا کیا جا رہا ہے "جب میں چھوٹا اور آزاد تھا تو میرے تصورات کی کوئی حد نہ تھی، میں دنیا کو تبدیل کرنے کا خواب دیکھتا تھا۔ جب میں بڑا اور عقلمند ہوا تو یہ جانا کہ دنیا تبدیل نہیں ہوگی۔ پھر میں نے اپنی سوچ محدود کی اور صرف اپنے ملک کو تبدیل کرنے کا سوچا تاہم یہ بھی مشکل معلوم ہوا تو آخری کوشش کے طور پر اپنے خاندان اور قریبی لوگوں میں تبدیلی لانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور اب بستر مرگ پر یہ احساس ہو رہا ہے (پہلی مرتبہ) کہ اگر میں اپنے آپ کو ہی تبدیل کرتا تو اسے مثال بنا کر اپنے اہلخانہ، دوستوں اور پھر ان کی مدد سے اپنے ملک کو تبدیل کر سکتا تھا اور کیا خبر میں دنیا کو تبدیل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا۔" (۴۴)

لفظ "ذمہ داری" انگریزی لفظ "Responsibility" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ دو لفظوں "Response" (ردِ عمل) اور "Ability" (قابلیت) سے مل کر بنا ہے۔ گویا اس لفظ کے اندر ہی یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ "اپنے ردِ عمل کے چناؤ کی اہلیت رکھنا" یہی پہلی عادت کا تقاضا ہے کہ انسان اس بات کو تسلیم کر لے کہ وہ ہر قسم کے حالات و واقعات میں اپنی مرضی کے مطابق ردِ عمل کا انتخاب کر سکتا ہے۔ لہذا کسی بھی قسم کی صورتِ حال میں اس کا ردِ عمل اس کے شعوری انتخاب پر مشتمل ہونا چاہیے۔ جو کہ اس کی سوچی سمجھی اقدار اور اصولوں کے تابع ہو۔

ہمیں جان لینا چاہیے کہ جب ہم سوچتے ہیں کہ مسئلہ کہیں باہر ہے تو یہ سوچ ہی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے جو ہمیں مایوسی اور پست ہمتی کی طرف لے جاتا ہے۔ بے شک مسئلہ باہر ہی ہو مگر اس کا سامنا کس طرح کرنا ہے یہ تو سراسر ہمارے اپنے ہی اختیار میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم حوصلہ مندانہ طریقے سے اس کا حل تلاش کر کے اٹا اس میں سے فائدہ کشید کر سکتے ہیں۔ کیونکہ فطرت کے سربستہ رازوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر مسئلے کے اندر شاندار مواقع کے بیج موجود ہوتے ہیں لیکن یہ مواقع صرف ان

کے لئے ہی ہوتے ہیں جو اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ اور ہر قسم کے حالات میں اپنے اندرونی توازن اور سکون کو برقرار رکھتے ہوئے بہترین رد عمل کے انتخاب کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

قدم اٹھانا

مصنف نے لفظ "Proactive" (ذمہ داری قبول کرنا) کا جو دوسرا مفہوم لیا ہے وہ ہے "قدم اٹھانا" یا "پیش قدمی کرنا"۔ اس کا مطلب ہے اپنے مقصد کے حصول، اپنی خواہشات اور تمناؤں کی تکمیل نیز اپنے کاموں کو ممکن بنانے کے لئے آگے بڑھ کر اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو بھرپور طریقے سے استعمال میں لانا اور اپنے خوابوں کی تعبیر کو پانے کے لئے تمام ضروری لوازمات فراہم کرنا اور اسباب کی کڑیاں ملانا۔ یہ گویا پہلے مفہوم کا ہی اگلا مرحلہ یا اسی تصویر کا دوسرا رخ ہے۔

اللہ رب العزت نے اس کائنات میں بے شمار ذی روح اور غیر ذی روح مخلوقات پیدا کی ہیں۔ لیکن انسان کو ایک منفرد مقام عطا فرمایا ہے۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ﴿۴۴﴾

”ہم نے انسان کو بہترین خلقت میں پیدا کیا“

نیز فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ﴿۴۵﴾

”بے شک ہم نے اولاد آدم کو فضیلت دی“

ایک اور مقام پر فرمایا:

خَلَقْتُ بِيَدِي ﴿۴۷﴾

”میں نے اسے (انسان کو) اپنے (قدرت کے) ہاتھوں سے تخلیق کیا“

مندرجہ بالا آیات بڑی وضاحت اور صراحت سے بتا رہی ہیں کہ پوری کائنات میں انسان کا جو مقام اور مرتبہ ہے وہ کسی اور کا نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ انسان کو اپنی خلافت و نیابت کا تاج پہنا کر اس

کے اندر لامحدود صلاحیتوں اور بے شمار امکانات کی نشاندہی فرمادی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً. (۴۸)

”اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں“

یہ بات مسلمہ ہے کہ جو کسی کا نائب یا جانشین ہوا کرتا ہے اس کے اندر اصل کے کردار اور اختیارات کی کچھ نہ کچھ جھلکیاں موجود ہوتی ہیں۔ اور یہ تو انسان کی عظمت کا ایک پہلو ہے۔ اسی تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ انسان کے علاوہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب انسان کے لیے بنایا گیا ہے۔ بقول قرآن:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا. (۴۹)

”وہی (اللہ) ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے“

صرف انسان کے لئے پیدا ہی نہیں کیا بلکہ ہر چیز کو انسان کے لئے مسخر بھی کر دیا:

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ. (۵۰)

”اور اس نے وہ سب کچھ مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے“

مندرجہ بالا آیات سے انسانی عظمت کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان معاملات میں پیش قدمی کرنے والا بنے، وہ آگے بڑھ کر حالات کی صورت گری کرے نہ کہ حالات کے ہاتھوں میں بے بس کھلونا بن کر رہ جائے۔ وہ زندگی کی گاڑی میں ڈرائیور کی حیثیت سے اسٹیئرنگ پر بیٹھے نہ کہ محض ایک مسافر بن کر پھیلی سیٹ پر بیٹھ جائے۔ وہ تاریخ کا عامل بنے نہ کہ محض ایک معمول بن کر رہ جائے۔ یہ کائنات انسان کے حوصلوں اور ولولوں کی جولانگاہ ہے جہاں اسے اپنے عزم مصمم اور جہد مسلسل سے وقت کے دھارے پر اپنے پنجنوں کے نشان ثبت کرنا ہیں اور ہمت و جرأت سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھ کر اپنے مطلوبہ نتائج کے حصول کے لئے مسلسل کوشش کرنی ہے۔

انسان کو دنیا میں احسن طریقے سے زندگی گزارنے کے لئے اور دنیا کی شیخ پر اپنے کردار کو بھرپور، فعال اور مؤثر طریقے سے ادا کرنے کے لئے جن لوازمات کی ضرورت تھی وہ اللہ رب العزت نے وافر مقدار میں فراہم کر دیے ہیں۔ بقول قرآن:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۵۱)

”اور بے شک ہم نے تم کو زمین میں تمکن و تصرف عطا کیا اور ہم نے اس میں تمہارے لئے اسباب معیشت پیدا کئے، تم بہت ہی کم شکر بجالاتے ہو۔“

لیکن یہ سب خام حالت میں ہیں۔ ان پر محنت اور مشق کر کے انہیں اپنے مقاصد کے حصول میں استعمال کرنا یہ انسان کی ذمہ داری ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے لوہا ابتدائی حالت میں پیدا کر دیا اب اس کو ضرورت کی مختلف شکلوں میں انسان نے ہی ڈھالنا ہے۔ اسی طرح اس نے زمین میں روئیدگی کی صلاحیت رکھ دی ہے اس صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے زمین میں بیج بونا اور اس کی آبیاری کرنا یہاں تک کہ مطلوبہ فصل حاصل ہو جائے، یہ سارے مراحل بہر حال انسان کو طے کرنا ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اپنی کوششیں کرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا محتاج ہے۔ اور یہ اسی کی رحمت ہے جو کبھی بھی معاملے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا کرتی ہے۔ مثلاً اگر اس کی رحمت شامل حال نہ ہو تو انسان اپنے کھیت پر تمام تقاضوں کو پورا کر کے بھی فصل حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہمیشہ اسباب کے پردے میں آیا کرتی ہے۔ جب تک انسان کسی بھی معاملے میں اسباب کی کڑیاں نہیں ملائے گا، اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم رہے گا گویا یہاں اللہ اور بندے کے درمیان معاملہ ففٹی ففٹی کا ہے۔

اللہ رب العزت نے منصب نبوت کو تمام کائنات کی اصلاح کا ذریعہ بنایا ہے اور انبیائے کرام کے ہاں ہمیں اسباب کا بھرپور استعمال دکھائی دیتا ہے۔ حضور ﷺ کے متعلق قرآن نے ارشاد فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۵۲)

”بے شک تمہارے لئے رسول ﷺ کا اخلاق بہترین نمونہ ہے۔“

حضور ﷺ کی ساری حیات طیبہ اسباب کے استعمال سے عبارت دکھائی دیتی ہے مثلاً غزوہ بدر میں حضور ﷺ اپنی ساری افرادی قوت کو میدان میں لے آتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کامیابی کی دعا مانگتے ہیں۔ اسی طرح غزوہ خندق میں صحابہ کرام ا کے ساتھ مل کر خندق کھودتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں جہاں تھوڑی چیز میں برکت آگئی۔ مثلاً حدیبیہ کے موقع پر چودہ سو صحابہ کو پانی کے ایک لوٹے سے وضو کروانا (۵۳)، دودھ کے ایک پیالے

سے ستر سے زائد اصحابِ صفہ کو سیراب کر دینا (۵۴)، حضرت جابرؓ کے گھر تھوڑے سے کھانے سے سارے لشکر کو پیٹ بھر کر کھلا دینا وغیرہ۔ (۵۵) لیکن ایسے واقعات تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں جہاں بغیر کسی سبب کو استعمال کئے مطلوبہ نتائج کو حاصل کیا گیا ہو۔ اس میں ہمارے لئے واضح سبق ہے کہ ہمیں اپنے معاملات کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے امکان کی حد تک اسباب کی کڑیوں کو ملانا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے اس سے حصولِ نتائج کی دعا کرنی چاہیے۔

قرآن و حدیث میں بڑے واضح اور دو ٹوک انداز میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی کوششوں کے مطابق ہی اسے پھل ملتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۶)

”نہیں ہے انسان کے لئے مگر وہی کچھ جس کے لئے وہ جدوجہد کرتا ہے۔“

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۵۷)

”بے شک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے آپ میں خود تبدیلی پیدا نہ کر ڈالیں“

مولانا ظفر علی خاں نے اس مفہوم کو اس انداز میں پیش کیا:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال اپنی حالت کے بدلنے کا (۵۸)

اور علامہ اقبال نے فرمایا:

تیرے دریا میں روانی کیوں نہیں ہے

خودی تیری مسماں کیوں نہیں ہے

عبث ہے شکوہ، تقدیر یزداں

تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے (۵۹)

قرآن مجید میں عمل کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

لَيْسَ بِأَمَانِيكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ
ذُرِّ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ﴿٦٠﴾

”آرزو میں نہ تمہاری پوری ہونی ہیں نہ اہل کتاب کی۔ جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا اور وہ اپنے لئے اللہ کے مقابل کوئی کارساز اور مددگار نہ پائے گا۔ اور جو نیکی کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، اور وہ مومن بھی ہے تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔“

اور حضور ﷺ نے فرمایا:

”الکيس من دان نفسه و عمل لما بعد الموت والعاجز من اتبع نفسه هواها و
تمنى على الله.“ (۶۱)

”عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کو مہذب بنائے اور موت کے بعد کے لئے عمل کرے اور عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرے اور اللہ سے بخشش و مغفرت کی امید رکھے۔“

توکل کی حقیقت

اسلام کی تعلیمات میں ایک اہم تعلیم توکل کی ہے۔ جس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا۔ ہمارے ہاں بعض اوقات اس لفظ کو غلط (Miss Use) استعمال کیا جاتا ہے اور اسے بے عملی کے جواز کے طور پر پیش کر دیا جاتا ہے۔ بعض صوفیاء کے ہاں بھی اسباب کے استعمال کی نفی کا پہلو پایا جاتا ہے۔ لیکن اسے ان کا ذاتی حال سمجھ کر صرف نظر کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ ہمارے لئے اسوۂ کامل حضور ﷺ کی حیات طیبہ ہے اور وہاں تو صورت حال یہ ہے کہ ایک آدمی اللہ عزوجل کے بھروسے پر اونٹ کھلا چھوڑ آتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ پہلے اونٹ کو باندھ کر آؤ اور پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔ بالفاظ دیگر اپنے امکان کی حد تک اسباب کو استعمال میں لانے کے بعد اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے مندرجہ ذیل تین چیزیں بیان کی ہیں:

(i) تعطل: اپنے دائرہ اختیار میں ہر قسم کی کوششوں اور کاوشوں کو ترک کرتے ہوئے اور اسباب و لوازمات کو اپنائے بغیر محض آرزوؤں اور تمناؤں کے ذریعے اپنے کاموں کی تکمیل کی امید رکھنا۔

(ii) تعقل: اپنی ذہانت و فطانت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہوئے اپنی تمام کامیابیوں کو محض اپنی قوت بازو اور کوششوں کا نتیجہ سمجھنا۔

(iii) توکل: تمام ضروری لوازمات کو پورا کرتے ہوئے اور اسباب کی کڑیوں کو ملاتے ہوئے نیز اپنے امکان کے دائرے میں حتیٰ المقدور کوششوں اور کاوشوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نتائج کے حوالے سے مکمل طور پر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا اور جملہ کامیابیوں و کامرانیوں کو اس کی مدد و نصرت سے منسوب کرنا۔ (۶۲)

پہلے دونوں تصورات افراط و تفریط پر مبنی اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں۔ تیسرا تصور ہی حقیقت پر مبنی اور اسلامی روح کے عین مطابق ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید کی اس مثال کو دیکھیں کہ جب حضرت موسیٰ کی قیادت میں بنی اسرائیل کو جہاد کا حکم دیا گیا اور ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ فتح کو اللہ تعالیٰ نے تمہارا مقدر بنا دیا ہے۔ گویا کوشش انہوں نے کرنی تھی اور مدد و نصرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی تھی۔ لیکن انہوں نے کوشش کے بغیر نتیجے کو حاصل کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر انہیں کئی سال بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسباب کی حیثیت برتن کی ہے جس میں اللہ رب العزت کی مدد و نصرت آیا کرتی ہے۔ اب جو شخص اسباب کو اپناتا ہی نہیں ہے تو گویا اس کے پاس وہ برتن ہی نہیں ہے جس میں نصرت الہی کا نزول ہونا تھا۔ لہذا انسان کو اپنے جملہ مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی استعداد کے مطابق کوششوں اور کاوشوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نتیجے کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ تاہم اس حوالے سے دو باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

(1) جو معاملات انسان کے اختیار سے باہر ہوں ان کے حوالے سے خواجواہ نکرین مارنے کی بجائے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے صبر کا دامن تھامنا ہوگا۔ تا وقتیکہ اللہ تعالیٰ خود ہی ان کا کوئی حل نکال دے۔

(2) جن معاملات میں کچھ کرنا انسان کے بس میں ہے ان میں وہ حدود شرع کے اندر رہتے ہوئے اپنی امکانی کوششوں کو استعمال میں لائے گا لیکن نتیجے پر اصرار نہیں کرے گا۔ نتیجہ مرضی کے مطابق نکل آئے تو

شکر اور مرضی کے مطابق نہ ملنے کی صورت میں صبر کرنا ہوگا۔ گویا مؤمن کوشش کے معاملے میں مجاہد اور نتیجے کے معاملے میں متوکل ہوتا ہے۔

ذمہ دار لوگ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لہذا وہ کچھ ہو جانے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی بجائے جرات مندانہ طور پر آگے بڑھتے ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی صلاحیتوں۔ توانائیوں، استعدادوں، وسائل اور مواقع کو بھرپور طریقے سے استعمال میں لایا کرتے ہیں۔ اپنی آرزوں، تمناؤں اور چاہتوں کی تکمیل کے لئے نیز اپنے سہانے خوابوں کی سنہری تعبیر کو پانے کے لئے مختلف تجاویز پر غور و فکر کرتے ہیں اور بہترین لائحہ عمل مرتب کر کے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ پھر جہاں کہیں غلطی کا احساس ہو تو حکمت عملی کو تبدیل کر لیتے ہیں لیکن پست ہمتی اور مایوسی کا ان کے ہاں گزر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں کہ اپنی زندگی کے ذمہ دار وہ خود ہی ہیں اور انہوں نے اپنے عمل سے ہی اپنے حالات کو سنوارنا ہے اور من پسند نتائج کو حاصل کرنا ہے۔

اس کے برعکس غیر ذمہ دار لوگ کسی بھی معاملے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، وہ ہر معاملے کا ذمہ دار اپنے علاوہ کسی اور کو گردانتے ہیں۔ خود بے عملی، جمود، اور تعطل کا شکار رہتے ہیں اور دوسرے لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے مقاصد کے حصول اور تمناؤں کی تکمیل کے لئے کام کریں اور بیٹھے بٹھائے مطلوبہ نتائج مل جائیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنی زندگی کی لڑائی خود ہی لڑنی پڑتی ہے۔ پھر جب دوسروں کی طرف سے مطلوبہ تعاون نہیں ملتا اور لوگ ان کی خود ساختہ توقعات پر پورا نہیں اترتے تو ان کے حوالے سے گلوں، شکووں، شکایتوں، اور نفرتوں کا انبار اپنے اندر جمع کر لیتے ہیں اور اپنے قلب و ذہن کو منفی اور تخریبی جذبات و احساسات کا قبرستان بنا لیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کی بہترین صلاحیتیں اور استعدادیں تباہ ہوتی چلی جاتی ہیں اور دنیا کی شیخ پر خالق کائنات نے جو کردار ان کے لئے متعین فرمایا تھا وہ اسے بھرپور طریقے سے ادا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

پہلی عادت کے اختتام کی طرف آتے ہوئے ذمہ دار اور غیر ذمہ دار لوگوں کے درمیان فرق کو چند نکات کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ جس میں اس عادت کے اہم نکات کا خلاصہ بھی آجائے گا اور ہمیں اس بات کا جائزہ لینے میں بھی آسانی ہوگی کہ ہمارا شمار کس زمرے میں آتا ہے۔

ذمہ دار اور غیر ذمہ دار لوگوں میں فرق

غیر ذمہ دار لوگ

ذمہ دار لوگ

زندگی کی گاڑی کے مسافر ہوتے ہیں	1	زندگی کی گاڑی کے ڈرائیور ہوتے ہیں	1
تاریخ کے معمول ہوتے ہیں	2	تاریخ کے عامل ہوتے ہیں	2
ان کا Remot خارجی حالات اور دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہی چیزیں ان کے موڈ کا تعین کرتی ہیں	3	ان کا Remot ان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لہذا وہ اپنے موڈ کے خود مالک ہوتے ہیں۔	3
ان کی مثال سوڈا واٹر کی بوتل کی سی ہوتی ہے جو ذرا سا ہلانے جلانے یا نمک ڈال دینے سے ابلنا شروع کر دیتی ہے	4	ان کی مثال سادہ پانی کی سی ہوتی ہے جس کو ہلانے جلانے سے اس میں ابال نہیں پیدا ہوتا۔	4
ان کی مثال تھرما میٹر کی ہوتی ہے جو حرارت کو فوراً ظاہر کر دیتا ہے	5	ان کی مثال تھرما سٹیٹ کی سی ہوتی ہے جو حرارت کو کنٹرول کرتا ہے	5
اپنے خیالات، جذبات، احساسات اور رویہ جات پر ان کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی زندگی میں کوئی متعینہ اقدار ہوتی ہیں	6	اپنے خیالات، جذبات، احساسات اور رویہ جات کے خود مالک ہوتے ہیں اور انہیں اپنی طے شدہ اقدار کے تابع رکھتے ہیں	6

7	اپنے حالات و واقعات کے حوالے سے دوسروں کو الزام دینے میں وقت ضائع نہیں کرتے اور ان کو بہتر بنانا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں	7	اپنے حالات و واقعات کے حوالے سے ہر وقت ماحول، معاشرے اور دوسرے لوگوں کو الزام دیتے رہتے ہیں اور اس حوالے سے اپنے اوپر کوئی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے
8	مسائل کے حل پر غور کرتے ہیں	8	مسائل کا رونا روتے رہتے ہیں
9	آسانیوں، خود مختاریوں اور مواقع کو دیکھتے ہیں	9	دشواریوں، مجبوریوں اور رکاوٹوں کو دیکھتے ہیں
10	بر قسم کے حالات میں امید کا دامن تھامے رکھتے ہیں اور صورت حال کیسی بھی ہو مایوسی اور پست ہمتی کا شکار نہیں ہوتے	10	نا موافق حالات میں فوراً مایوس ہو جاتے ہیں، امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور بے بسی، مجبوری اور لا چارگی کے احساسات میں مبتلا ہو کر ہمت ہار دیتے ہیں

عملی مشورہ جات

پہلی عادت انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ ایک طرف تو یہ تعمیر شخصیت کے حوالے سے بذات خود بہت اہم ہے اور دوسری طرف یہ بقیہ عادات کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے کہ اسے اپنائے بغیر دوسری عادات کو اپنانا ممکن ہی نہیں۔ لہذا یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اس پر خصوصی محنت کر کے اپنے اندر اتار لیں اور اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیں تاکہ ہمارے لئے اس کے ثمرات سے متمتع ہونا ممکن ہو جائے نیز دوسری عادتوں کی طرف آگے بڑھنے میں آسانی رہے۔ اس عادت کو اپنانے کے لئے مندرجہ ذیل تین ضابطوں پر عمل پیرا ہونا حوصلہ افزاء نتائج کے حصول کا باعث بن سکتا ہے:

ضابطہ نمبر ۱

امام غزالی کے نزدیک تمام اخلاقی امراض کا علاج اور اخلاقی حسنہ کو پیدا کرنے کا طریقہ دو

چیزوں سے عبارت ہے ایک علم اور دوسرا مجاہدہ، یہی معاملہ یہاں ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے علاج علمی یہ ہے کہ عادت نمبر ایک کے ضمن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے انسان اسے بار بار پڑھے اور غور و فکر کے ذریعے اسے قلب و باطن میں نقش کرنے کی کوشش کرے تاکہ اس کے اندر کا حال بدلے اور اس کے نتیجے میں اس کا عمل بھی بدلے کیونکہ ”عمل تابع حال کے ہوتا ہے اور حال تابع علم و یقین کے“ بقول حضرت واصف علی واصف:

”علم وہی ہے جو عمل میں آسکے، ورنہ ایک اضافی بوجھ ہے“ (۶۳)

جو بات بھی انسان سرسری طور پر پڑھ کر گزر جاتا ہے وہ دل و دماغ میں نقش نہیں ہو پاتی اور نتیجہ عمل کا حصہ بھی نہیں بن پاتی۔ عمل کی شکل میں وہی بات آتی ہے جسے ہم خوب غور و فکر سے من میں اتار لیتے ہیں۔ اسی لئے اسلام نے جگہ جگہ غور و فکر کا حکم دیا ہے اور اسے بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ نیز سورہ فاتحہ جسے ام الکتب بھی کہا گیا ہے اسے ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا لازمی قرار دیے جانے کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ بار بار کی تکرار سے اسلام کی اساسی تعلیمات انسان کے باطن کی گہرائیوں میں اتر جائیں تاکہ ان کو عمل میں لانا آسان ہو جائے۔

جہاں تک علاج عملی کا تعلق ہے تو یہ عادت ضبط نفس کا تقاضہ کرتی ہے کیونکہ ضبط نفس کے بغیر اپنے خیالات، جذبات، احساسات، کیفیات اور تاثرات کو کنٹرول نہیں کیا جاسکتا۔ ضبط نفس کو پیدا کرنے میں دو چیزیں اپنی مثال آپ ہیں، ایک نماز جس کے متعلق قرآن نے فرمایا:

إِذِ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ. (۶۴)

”بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے“

اور دوسرا روزہ جس کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا

عليك بالصوم فإنه لا مثل له (۶۵)

”تمہارے روزے کو اختیار کرنا لازم ہے بے شک اس کی مانند اور کوئی چیز نہیں ہے“

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے اندر رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ بھی نقلی روزوں کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اور یہ حضور ﷺ کی پرندیدہ سنت مبارکہ بھی ہے۔ لہذا انسان کو چاہیے کہ اپنے اندر ضبط نفس کی کمی

کو پورا کرنے کے لئے نماز کی حقیقی روح کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آداب و شرائط کے مطابق اسے قائم کرنے کی کوشش کرے۔ نیز اپنی عمر، صحت، موسم، کام کی نوعیت وغیرہ جیسی چیزوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نقلی روزوں سے بھی مدد لے، علاوہ ازیں دیگر عبادات مثلاً تلاوت قرآن اور اذکار و وظائف بھی کافی معاون ثابت ہو سکتے ہیں بشرطیکہ انہیں ذہنی و قلبی یکسوئی کے ساتھ پڑھا جائے۔

ضابطہ نمبر ۲

انسان اپنے اور دوسروں کے ساتھ کئے جانے والے وعدوں کی حتی الوسع پاسداری کرے۔ جوں جوں انسان اپنے وعدوں کا لحاظ رکھنا شروع کرتا ہے ویسے ویسے اس کے اندر ایک نظم و ضبط پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے، اس میں خود اعتمادی آتی ہے اور اس کا تصور ذات Self Image بہتر ہوتا چلا جاتا ہے چنانچہ ماحول اور معاشرے کی نظروں میں اس کی تصویر بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی نظروں میں بھی بہتر ہوتی جاتی ہے۔ اسی لئے اسلام میں وعدہ کی تکمیل کی بہت تاکید کی گئی بلکہ اسے ایمان کا حصہ قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لا دین لمن لا عہد لہ (۶۶)

”جو شخص اپنے وعدہ کو پورا نہیں کرتا اس کا ایمان ہی نہیں ہے“

ضابطہ نمبر ۳

انسان اپنی صلاحیتوں، وسائل، ذوق، مزاج اور رجحان وغیرہ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے لئے زندگی میں کچھ اعلیٰ اہداف کا تعین کرے اور پھر ان کے حصول کے لئے اپنی کوششوں اور کاوشوں کو مربوط انداز میں عمل میں لائے۔ ایسا کرنے سے ایک طرف تو انسان اپنے ذاتی خول سے باہر آ جاتا ہے (جو کہ بے شمار نفسیاتی الجھنوں کا باعث تھا) اور دوسری طرف زندگی کے متعلق اس کا تصور (Vision) خاصا وسیع ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کا ذہن ہر وقت مثبت، تعمیری اور صحت مند افکار و خیالات سے معمور رہتا ہے اور پست خیالات و احساسات کیلئے وہاں جگہ ہی نہیں بچتی ہے جیسا کہ انگریزی زبان کا ایک قول ہے کہ:

"One Who Wants to Conquer the Mount Everest, Never

Counts the Cost of His Shows" (۶۷)

”جس شخصیت نے ہمالیہ کی چوٹی کو سر کرنا ہو وہ اپنے جوتوں کی قیمت نہیں گنا کرتا“

اور بقول حضرت واصف علی واصف:

”جن لوگوں نے بارڈر پر بڑی جنگ لڑنی ہو وہ گلی کی لڑائی نہیں لڑتے!“ (۶۸)

مطلب یہ کہ جب بڑے اور اعلیٰ مقاصد زندگی میں آجاتے ہیں تو پھر چھوٹے چھوٹے مقاصد اور لڑائی جھگڑے خود بخود ہی زندگی سے نکل جاتے ہیں۔ لہذا انسانی زندگی کو عظمت و رفعت سے ہمکنار کرنے کے لئے اس میں کچھ اعلیٰ وارفع مقاصد کا ہونا ضروری ہے جن کا تعلق انسان کی ذاتی بہتری اور فلاح کے ساتھ ساتھ ماحول اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے ساتھ بھی ہو۔

حواشی

- (۱) Stephen R. Covey, The 7 Habits of Highly Effective People, Simon & Schuster, New York, first edition, 1990,p 47.
- (۲) سیدباروری، محمد حفظ الرحمن، مولانا، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۲۷
- (۳) Stephen R.Covey, The 7 Habits of Highly Effective People ,P46
- (۴) ارشد جاوید، پروفیسر، کامیاب شخصیت، کیلیفورینا انسٹیٹیوٹ آف سائیکالوجی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۸
- (۵) حتی، شان الحق، آکسفورڈ انگلش اوردو ڈکشنری، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۱۸
- (۶) The 7 Habits of Highly Effective People,P 70
- (۷) The 7 Habits of Highly Effective People,P 67
- (۸) Stephen R. Covey, The 7 Habits of Highly effective People, P74
- (۹) Sean. Covey, The 7 Habits of Highly Effective Teenagers, Simon & Schuster UK,2004, P 57
- (۱۰) Dale Carnegie, How To Stop Worrying And Start Living, (Net Book)
<http://esnips.com/UserProfile.Action.ns?id=ebdaac62-b650-4f30-99a4-376c11a084226>,p64
- (۱۱) Dale Carnegie, How To Stop Worrying And Start Living ,p63
- (۱۲) Stephen R. Covey, The 7-Habits of Highly effective People,P 72.
- (۱۳) البقرہ، ۲: ۱۵۵
- (۱۴) الحديد، ۵۷: ۳۲
- (۱۵) مسبلہ، ابن الحجاج قشیری (۲۰۶ - ۲۶۱/۸۲۱-۸۷۵ء)۔ الصحيح۔ داراحیاء التراث العربی، بیروت، س ن، رقم: ۲۹۹۹، ۲/۲۹۹۵
- (۱۶) آل عمران، ۳: ۱۹۹
- (۱۷) حم السجدہ، ۳۱: ۱۳۳
- (۱۸) یونس، ۱۰: ۲۷
- (۱۹) آل عمران، ۳: ۱۳۳

- (۲۰) احمد بن حنبل، ابو عبد اللہ بن محمد (۱۶۳-۱۲۴۱ھ/۷۸۰-۸۵۵ء)۔ المسند۔ مؤسسہ قرطبہ، مصر، رقم: ۱۴۳۷۲، ۱۴۸/۳
- (۲۱) بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۳-۱۲۵۶ھ/۸۱۰-۸۶۰ء)۔ الصحیح۔ دار ابن کثیر الیمامہ، بیروت، ۵۱۳۰۷، رقم: ۵۷۷۵، ۲۲۷۹/۵
- (۲۲) ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی (۲۱۰-۲۷۹ھ/۸۲۵-۸۹۲ء)۔ السنن۔ دار احیاء التراث العربی، بیروت، س ن، رقم: ۷۱۰/۵، ۳۸۹۷
- (۲۳) آلوسی، ابو الفضل شہاب الدین السید محمود (م ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء)۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی۔ دار احیاء التراث العربی، بیروت، س ن، ۱۳/۵
- (۲۴) بخاری، الصحیح، رقم: ۵۷۶۵، ۲۲۶۷/۵
- (۲۵) ہندی، حسام الدین، علاء الدین علی متقی (م ۹۷۵ھ)۔ کنز العمال۔ دار الکتب والعلمیہ، بیروت، ۵۱۳۱۹، رقم: ۲۲۳۷۲، ۱۱۰/۱۶
- (۲۶) النساء، ۳: ۳۲
- (۲۷) بخاری، الصحیح، رقم: ۶۱۶۵، ۲۳۸۰/۵
- (۲۸) واصف، واصف علی، کرن کرن سورج، کاشف پبلیکیشنز، لاہور، ص ۵۷
- (۲۹) آل عمران، ۳: ۱۳۹
- (۳۰) الانشراح، ۹۴: ۶۰۵
- (۳۱) الطلاق، ۷: ۶۵
- (۳۲) ترمذی، السنن، رقم: ۳۵۷۱، ۵۶۵/۵
- (۳۳) محمد طاہر القادری، ڈاکٹر، اسلامی تربیتی نصاب، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ۱۸۲/۱
- (۳۴) القیمہ، ۷۵: ۱۳
- (۳۵) الشمس، ۹۱: ۸
- (۳۶) الاحزاب، ۳۳: ۷۲
- (۳۷) الاعراف، ۷: ۱۷۹
- (۳۸) البقرہ، ۲: ۲۸۶
- (۳۹) المؤمن، ۳۰: ۳۳
- (۴۰) لدھیانوی، محمد نرکت علی۔ ابو انیس، مکشوفات منازل احسان، المعروف بہ مقالات حکمت۔ دہلا حیان، سالار والا، ۵۱۳۹۳، ۳۲۵/۶
- (۴۱) الحج، ۲: ۶۶

- (۴۲) البقرہ، ۲: ۲۸۶
- (۴۳) البقرہ، ۲: ۱۹۳
- (۴۵) التین، ۳: ۹۵
- (۴۴) Sean Covey, The 7 Habits of Highly effective Teenagers, P33
- (۴۶) بنی اسرائیل، ۱۷: ۷۰
- (۴۷) ص، ۳۸: ۷۵
- (۴۸) البقرہ، ۲: ۳۰
- (۴۹) البقرہ، ۲: ۲۹
- (۵۰) لقمان، ۳: ۲۰
- (۵۱) الحج، ۱۵: ۲۰
- (۵۲) الاحزاب، ۳۳: ۲۱ (۵۳) الازہری، محمد کرم شاہ، پیر، ضیاء النبی ﷺ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۲۰ھ، ص ۷۴۰ (۵۴) ایضاً، ص ۷۴۶ (۵۵) ایضاً، ص ۷۵۴
- (۵۶) النجم، ۵۳: ۳۹
- (۵۷) الرعد، ۱۳: ۱۱
- (۵۸) ظفر علی خان، مولانا، کلیات مولانا ظفر علی خان، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸۲
- (۵۹) محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۵ء، ص ۷۳۳
- (۶۰) النساء، ۴: ۱۲۳
- (۶۱) احمد بن حنبل، المسند، رقم: ۱۷۱۶۳، ۱۷۱۶۴، ۱۷۱۶۵
- (۶۲) محمد طاہر القادری، ڈاکٹر، خطاب بعنوان ”بے ارادتی اور حقیقت توکل“، آڈیو کیسٹ نمبر ۵۸-M-۸، مئی ۱۹۸۷ء
- (۶۳) وانسف، واصف علی، کرن کرن سورج، ص ۱۲۵
- (۶۴) العنکبوت، ۲۹: ۴۵
- (۶۵) ابن حبان، ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان (۲۷۰-۳۵۴/۵۸۳-۸۸۳-۹۶۵ء)۔ الصحیح۔ موسسہ الرسالہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ، رقم: ۳۳۲۶، ۳۳۲۷، ۳۳۲۸
- (۶۶) ابن حبان، الصحیح، رقم: ۱۹۳، ۳۲۲/۱
- (۶۷) وحید الدین خان، مولانا، کتاب زندگی، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۹
- (۶۸) واصف علی واصف، گفتگو، کاشف پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰

فصل دوم:

انجام پر نظر رکھنا

اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں انسان کی فطری کمزوریوں میں سے ایک کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

كَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ۝ (۱)

”انسان بڑا جلد باز ہے۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں عجلت پسندی یا جلد بازی کا مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں فوری نتائج چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ اُن کاموں کی طرف لپکتا ہے جہاں کوئی فوری فائدہ یا لذت دکھائی دے رہی ہو، خواہ اُس کا آخری انجام نقصان دہ ہی ہو لیکن اُن کاموں کی طرف آمادہ نہیں ہوتا جہاں کوئی وقتی فائدہ یا مصلحت نظر نہ آ رہی ہو یا بظاہر کوئی نقصان دکھائی دے رہا ہو اگرچہ آخر میں وہاں سے کوئی بہت بڑا فائدہ برآمد ہونا ہو۔ یہ انسان کی عجلت پسندی ہی ہے جو اُسے دنیا کے وقتی، ماضی، فانی اور ناپائیدار فائدوں کی طرف اُکساتی ہے اور آخرت کے حقیقی نفع کو جو بظاہر دکھائی نہیں دے رہا اُسے نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں انسان کی اس خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ خَيْرًا وَّأَبْقَى ۝ (۲)

”بلکہ تم دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔“

دنیا کے مقابلے میں آخرت کے زیادہ بہتر اور زیادہ پائیدار ہونے کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان ہر حال میں دنیا کے فائدوں اور مصلحتوں پر آخرت کے فائدوں اور مصلحتوں کو ترجیح دیتا اور جہاں بھی یہ دونوں ایک دوسرے کے مد مقابل ہوتے تو وہ دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف لپکتا۔ لیکن عام طور پر ہوتا اس کے برعکس ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں حضرت فضیل بن عیاض کا ایک قول نقل فرمایا

ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ ”اگر دنیا سونے کی ہوتی اور فنا ہو جاتی اور آخرت ٹھیکری ہوتی اور باقی رہتی تب بھی غفلت کو یہی چاہیے تھا کہ باقی ہی چیز کو پسند کرتے اور فانی کو چھوڑتے۔ گواہ تو یہ فانی چیز ٹھیکری ہے اور باقی سونے کی نہیں معلوم کہ کسی نے ایسی واہیات چیز کو اس عمدہ چیز کے مقابلے میں کیوں پسند کر رکھا ہے“ (۳)

اس کی وجہ یہی انسان کی عجلت پسندی ہے۔ دنیا کی رونقیں، فائدے اور لذتیں سامنے دکھائی دیتی اور محسوس ہوتی ہیں جبکہ آخرت کی تمام تر رعنائیاں، آرائشیں اور زیبائشیں پردہ کے پیچھے ہیں جو نہ آنکھوں سے دکھائی دیتی ہیں اور نہ فوراً محسوس ہوتی ہیں۔ گویا دنیا کا معاملہ نقد ہے اور آخرت کا ادھار، انسان ادھار کو چھوڑ کر نقد کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اللہ رب العزت کی ذات چونکہ اس طرح کی کمیوں اور خامیوں سے منزہ اور مبرا ہے لہذا وہ ہمارے لیے دنیوی زندگی کے عارضی فائدوں اور عیش و عشرت کے مقابلے میں اُخروی زندگی کے دائمی آرام و سکون کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ (۴)

”تم دنیوی زندگی کا فائدہ چاہتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے۔“

اور حضور ﷺ کی دعاؤں میں سے ایک دعا ہے:

اللهم لا عيش الا عيش الاخرة (۵)

”اے اللہ! عیش تو کوئی نہیں ہے سوائے آخرت کی عیش کے۔“

شاہراہ حیات پر چلتے ہوئے کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت کے تقاضے ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی ایک طرف کے مفاد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ دوسری طرف کے مفاد کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ایسے تمام مواقع پر ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان آخرت کو دنیا پر ترجیح دے وہ دنیوی نقصان گوارا کر لے مگر آخرت کا نقصان کسی قیمت پر گوارا نہ کرے۔

اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

من احب دنياہ اضر باخرته ومن احب اخرته اضر بدنياه فاثروا ما يبقی علی ما

خواہ وقتی طور پر اُس میں نقصان دکھائی دے رہا ہو یا اُس میں لذت اور راحت میسر نہ آرہی ہو یا وہ طبیعت پر ناگوار ہی گزر رہا ہو لیکن اس کے برعکس اگر کسی کام کا آخری انجام ناخوشگوار، ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہے تو اُسے ترک کر دیا جائے اگرچہ عارضی طور پر اُس میں فوری لذت، ذائقہ اور راحت و مسرت محسوس ہو رہی ہو یا نظر برفتن دکھائی دے رہا ہو۔ اصل دیکھنے والی چیز کسی بھی کام کا آخری نتیجہ ہے کیونکہ

انما العبرة بالخواتیم۔

”اعتبار ہمیشہ خاتمے کا ہی ہوتا ہے۔“

قرآن مجید میں ایک جگہ پر اہل ایمان کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۹)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر جان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کل کے لیے کیا بھیج رہی ہے۔“

اسلام دنیا کی ساری زندگی کو ایک دن قرار دیتا ہے اور یہ تلقین کرتا ہے کہ اس ایک دن کے ایک لمحے کو اس طرح گزارا جائے کہ وہ آنے والے کل (یعنی قیامت والے دن) کے لیے خوشگوار نتائج و ثمرات جمع کر رہا ہو۔ حضور ﷺ کی بارگاہ میں ایک شخص نے سوال کیا کہ

من اکیس الناس و احزم الناس

”لوگوں میں سے سب سے زیادہ عقلمند اور دوراندیش کون ہے؟“

آپ ﷺ نے فرمایا:

اکثرهم ذکرا للموت و اکثرهم استعداد الہ اولئک الاکیاس ذہبوا بشرف
الدنیا و کرامة الاخرہ۔ (۱۰)

”جو سب سے زیادہ موت کو یاد کرتا ہے اور سب سے زیادہ اُس کے لئے تیاری کرنے والا ہے

یہ لوگ سے سب زیادہ عقلمند ہیں۔ یہ لوگ دنیا و آخرت دونوں کی عزت و تکریم پا گئے۔“

دوسری عادت کا اطلاق

عادت نمبر 2 کا تقاضا ہے کہ سفر زیست کے ہر مرحلے میں انسان کے سامنے اپنی منزل کا واضح

تصور موجود ہو کہ وہ اس وقت کہاں کھڑا ہے اور اُسے بالآخر کہاں پہنچنا ہے تاکہ وہ صحیح سمت کا تعین کر کے آگے بڑھ سکے۔ اس طرح اُس کا ہر اٹھنے والا اگلا قدم اُسے منزل کے قریب سے قریب تر کرتا چلا جائے گا۔ بصورت دیگر یہ عین ممکن ہے کہ انسان روزمرہ زندگی کے کاموں اور مصروفیات میں الجھ کر رہ جائے اور اپنی دانست میں کامیابی کی سیڑھی پر بڑی محنت سے زینہ بہ زینہ بڑھتا چلا جائے لیکن آخر میں اُسے پتہ چلے کہ سیڑھی غلط دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ تو سارا سفر بیکار اور رائیگاں چلا جائے گا اور سوائے مایوسی اور پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

بہت سارے لوگوں کا یہ المیہ ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک شعبے مثلاً ڈاکٹر، ماہر تعلیم، ایکٹر، سیاست دان، کھلاڑی وغیرہ بننے اور اس میں مزید مہارت حاصل کرنے نیز اس کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ دولت اور شہرت کے حصول کی کوشش میں زندگی کا بیشتر حصہ گزار دیتے ہیں اور آخر میں انہیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی اس تمام جدوجہد نے انہیں ان چیزوں کی طرف سے اندھا کر دیا تھا جو زندگی میں دراصل کہیں زیادہ اہم تھیں اور اب کہیں کھو چکی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی حاصل کردہ کامیابیوں کو اندر سے خالی پاتے ہیں اور انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ تمام کامیابیاں ان چیزوں سے کہیں چھوٹی ہیں جن کی قیمت پر انہیں حاصل کیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان اپنے پسندیدہ شعبے میں کامیابی اور مہارت حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ جدوجہد نہ کرے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان زندگی کے کسی ایک گوشے کی طرف اتنا زیادہ نہ جھک جائے کہ دوسرے بہت سارے اہم گوشے نظر انداز ہو جائیں بالفاظ دیگر وہ زندگی کو ایک کل کے طور پر لے نہ کہ کسی ایک جز کو کل سمجھ کر اُس کے پیچھے ہی چلتا جائے۔ زندگی کے تقاضوں میں توازن رکھنا ہی اصل دانشمندی ہے۔

زندگی کس قدر بامعنی ہو سکتی ہے اگر ہمیں یہ شعور نصیب ہو جائے کہ ہمارے لیے کیا زیادہ اہم ہے اور اس آگہی کے ساتھ ہم اپنے ہر دن کو گزاریں، ہم ویسے ہی رہیں جیسے ہمیں رہنا چاہیے اور وہی کریں کہ جو ہمارے لیے زیادہ اہم ہے۔ اگر سیڑھی صحیح دیوار کے ساتھ نہیں کھڑی تو پھر ہمارا ہر اگلا قدم ہمیں غلط منزل کی طرف ہی بڑھائے گا یا مثلاً ہم نے غلطی سے بلا سوچے سمجھے اپنی منزل کے ایک سواسی ڈگری زاویے (۱۸۰°) کی سمت چلنا شروع کر دیا تو ہمارا ہر اگلا قدم ہمیں منزل کے قریب کرنے کی

بجائے دور لے جانے کا باعث بنے گا۔ چاہے ہم نے کتنی ہی کوشش اور کاوش کیوں نہ کی ہو۔ لہذا ہمارا صرف چاہنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ سمت کا درست ہونا بھی بہت ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم عادت نمبر 2 کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے چلنے سے پہلے منزل کا تعین کر لیں گے اور پھر اُس کے مطابق صحیح راستے کا انتخاب کر لیں گے۔ اسی صورت میں ہم کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

یوں تو عادت نمبر 2 کا زندگی کے مختلف حالات اور منازل پر اطلاق ہوتا ہے لیکن ”انجام پر نظر رکھنا“ کا بنیادی اور بہترین استعمال یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کا اخیر رہے اور اسی معیار کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم زندگی کی ہر چیز کو پرکھیں۔ زندگی کے ہر پہلو میں ہماری جملہ حرکات و سکنات اور رویہ جات کی پرکھ تمام تر زندگی کے نوالے سے ہونی چاہیے۔ اسی صورت میں ہم اس بات کو یقینی بنا سکتے ہیں کہ زندگی کے ہر دن میں ہم جو کچھ بھی کریں گے وہ زندگی کو با معنی بنانے کے ساتھ ساتھ اُس کے معیار کو اعلیٰ سے اعلیٰ بناتا چلا جائے گا اور زندگی کے دامن کو حقیقی خوشیوں، مسرتوں اور راحتوں سے بھرتا چلا جائے گا۔

مصنف کتاب (سٹیفن آرکووے) نے اس تصور کو واضح کرنے کے لیے قارئین کو ایک خوبصورت تجربے سے گزرنے کے لئے کہا ہے۔ قارئین سے کہا گیا ہے کہ وہ تصور کریں کہ اُن کے مرنے کے بعد اُن کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ کا انعقاد کیا گیا ہے۔ جس میں سامعین کی بہت بڑی تعداد ہے۔ مقررین کی تعداد چار ہے۔ جن میں سے ایک مرنے والے کا قریبی عزیز مثلاً بھائی یا بیٹا وغیرہ، دوسرا اُس کا کوئی قریبی دوست، تیسرا اُس کے شعبے کا قریب ترین ساتھی (Colleague) اور چوتھا اُس رفاہی ادارے کا کوئی اہم رکن ہے جس کو وہ چندہ وغیرہ دیتا رہا ہے۔ اب متوفی سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ مقررین سے اپنے بارے میں کس قسم کے خیالات سننا چاہتا ہے؟

مصنف کہتا ہے کہ جو کچھ ہم دنیا والوں سے چاہتے ہیں کہ ہمارے مرنے کے بعد وہ ہمیں ان الفاظ میں یاد رکھیں تو وہی کچھ آج ہم بننا شروع کر دیں اور اُسی رویے اور برتاؤ کو اپنالیں۔ اسی صورت میں ہماری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے، کیونکہ ہمارا ہر طرز عمل ہمارے اردگرد کے لوگوں کی آنکھوں اور کانوں سے گزر کر اُن کے دل و دماغ میں ہماری تصویر بناتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ دوسروں کے ساتھ ہمارا رویہ ناپسندیدہ اور نامعقول ہو اور لوگ ہماری غیر موجودگی میں بھی ہمارے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ اسی طرح مثلاً ہم اپنی اولادوں کو ذہین و فطین، مؤدب اور دیگر اچھی

صفات سے آراستہ و پیراستہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں اپنی ذمہ داری کا بھرپور احساس کرتے ہوئے انہیں وہ ماحول فراہم کرنا ہوگا اور ان کی تربیت کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا تا کہ ان میں ہماری مطلوبہ صفات پیدا ہو سکیں۔ اگر ہم اس حوالے سے لا پرواہی کرتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتے ہیں تو پھر اس بات کا قوی امکان ہے کہ اولاد کے حوالے سے ہماری خواہشات کا آئینہ چکنا چور ہو جائے اور اس کے برعکس ان کے کردار میں وہ ناپسندیدہ اوصاف پیدا ہو جائیں جن سے ہم ان کو پہچانا چاہتے تھے۔

اعمال اور نتائج کا تلازم

ہمیں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اعمال اور ان کے نتائج اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جس طرح سورج کے ساتھ حرارت اور روشنی لازم و ملزوم ہیں۔ ہم اعمال کے ارتکاب میں تو آزاد ہیں لیکن ان کے نتائج سے بچنے میں آزاد نہیں ہیں۔ جس طرح کے اعمال کریں گے اسی طرح کے نتائج بھی ہمیں بھگتنا پڑیں گے بالفاظِ دیگر جو کچھ بوائس گے وہی کاٹنا بھی پڑے گا۔ مثلاً یہ ہماری مرضی ہے کہ ہم ایک بلڈنگ کی دسویں منزل سے چھلانگ لگا دیں یا چلتی ہوئی ٹرین کے آگے کود جائیں یا جلتی ہوئی آگ میں ہاتھ ڈال دیں مگر ہر صورت حال میں اس سے وابستہ جو نتائج ہیں ان کا سامنا ہمیں کرنا ہی ہوگا۔

جب اعمال اور ان کے اثرات اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں تو پھر ہمیں جان لینا چاہیے کہ اچھے نتائج کے حصول کے لیے ہمیں لازماً اچھے کام بھی کرنا پڑیں گے اور بُرے نتائج سے بچنے کے لیے ہمیں لازماً بُرے کاموں سے بچنا پڑے گا۔ لہذا اس اصول کی روشنی میں ہمیں دقتِ نظر سے خوب غور و فکر کے ساتھ اس بات کا تعین کرنا ہوگا کہ ہم زندگی سے کیا نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں، کیا بننا چاہتے ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ نیز زندگی کو کس انجام تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ پھر اس کے مطابق ایک لائحہ عمل تشکیل دینا ہوگا اور پھر ثابت قدمی اور استقامت سے اس پر چلنا ہوگا۔ بالفاظِ دیگر زندگی کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے کے لیے زندگی کا نصب العین متعین کرنا اور اس کے لیے ایک نقشہ بنانا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر مندرجہ ذیل دو نقصانات ہو سکتے ہیں۔

(الف) زندگی بے کار، غیر ضروری، ادنیٰ اور پست ترین کاموں میں گزر جائے گی، کیونکہ ہمارے دل و

دماغ میں ہر وقت خواہشات، تمناؤں، آرزوؤں، چاہتوں، حسرتوں اور ارمانوں کا ایک لانتناہی سلسلہ جاری ہے۔ بقول غالب۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے (۱۱)

انسان کے من میں پیدا ہونے والی ساری خواہشات نہ تو اچھی ہوتی ہیں اور نہ ہی ہر خواہش کی تکمیل کی جاسکتی ہے۔ اب اگر انسان کے سامنے زندگی کا کوئی واضح تصور نہیں ہوگا تو وہ خواہشات کی ان تیلیوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دے گا اور نتیجہ زندگی کو فضول، لغو اور بے کار کاموں میں گزارتے ہوئے ضائع کر دے گا۔ اپنے آپ کو انسانیت کے بلند ترین مقام سے نیچے گرا کر حیوانیت کی سطح پر لے آئے گا اور ان کمالات کو پانے سے محروم رہ جائے گا جن کو پانے کی صلاحیت اور استعداد اللہ تعالیٰ نے اُس کے اندر رکھی ہوئی تھی۔

(ب) دوسرا نقصان یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی ماحول اور معاشرے کے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھل جائے۔ ہر انسان جس ماحول میں رہ رہا ہوتا ہے اُس میں بے شمار اچھی بُری رسمیں اور رواج کار فرما ہوتے ہیں۔ بہت سی حدود و قیود اور خود ساختہ ضابطے بنے ہوتے ہیں۔ معاشرے کا دباؤ ہر شخص کو مجبور کرتا ہے کہ وہ انہی ضابطوں میں ڈھلتا چلا جائے اور معاشرہ جس رو میں بہ رہا ہے اسی میں ہر فرد بہنے لگے۔ لیکن یہ بات شرفِ انسانیت کے منافی ہے اور عظمت کے معیارات پر بھی پوری نہیں اترتی۔ قرآن وحدیث ایک فرد کو اس طرح کی اندھی تقلید سے منع کرتے ہیں، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَإِنْ تَطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ. (۱۲)

”اور اگر تو نے زمین میں رہنے والے اکثر لوگوں کی پیروی کی تو یہ تجھے گمراہ کر دیں گے۔“

دوسرے مقام پر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا

إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ. (۱۳)

”وہ نہیں پیروی کرتے ہیں مگر اپنے گمان کی۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا

وَلَا تَطْعُ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ. (۱۴)

”اور ایسے شخص کی پیروی مت کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔“

اسی سلسلے میں حضور ﷺ نے فرمایا

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ (۱۵)

”خالق کی نارہنگی میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔“

حضرت واصف علی واصفؒ کے بقول

”دنیا کے عظیم راہنما وقت کے دیئے ہوئے معیار سے بلند ہوتے ہیں۔“ (۱۶)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

”سوچنے والے کی دنیا، دنیا والوں کی سوچ سے الگ ہے۔“ (۱۷)

چنانچہ ماحول اور معاشرہ ہر کسی کو اپنے رنگ میں رنگنا اور اپنی ڈگر پر چلانا چاہتا ہے۔ صرف وہی شخص اس کے اثرات سے بچ سکتا ہے جس نے عادت نمبر ۲ کو اپنے من میں اتارتے ہوئے خوب غور و فکر سے زندگی کے مقاصد کو متعین کر لیا ہو اور اُس کے لیے ایک واضح لائحہ عمل تشکیل دے لیا ہو۔ نیز جو اپنی جملہ حرکات و سکنات اور اعمال و افعال میں انجام کو ذہن میں رکھ کر شروع کرنے کی عادت اپنا چکا ہو۔ اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ وہ ہر معاملے میں زمانے کی روش کے خلاف چلے گا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ مروجہ رسوم و رواج کا دقت نظر اور باریک بینی سے جائزہ لے گا اور جو کچھ حق و صداقت اُن میں دکھائی دے گا جو قرآن و حدیث کے دیئے ہوئے معیارات کے مطابق ہو اور زندگی کے حقیقی مقاصد سے ہم آہنگ ہو اُس کو لے لے گا اور جو اس معیار پر پورا نہیں اُترے گا اُس کو چھوڑ دے گا۔

تمام چیزیں دوبار تخلیق کی جاتی ہیں

دوسری عادت ”انجام پر نظر رکھنا“ کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ تمام چیزیں دوبار تخلیق کی جاتی ہیں۔ ہر چیز پہلے پہنی سطح پر معرض وجود میں آتی ہے اور پھر طبعی سطح پر۔ گویا کسی بھی چیز کا وجود پہلے

ہمارے تخیل میں تشکیل پاتا ہے اور اُس کے بعد ہی وہ چیز عملی سطح پر وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس قانون کی مثالیں جا بجا دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً جب ہم ایک گھر تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو تعمیر کا آغاز کرنے سے پہلے اُس کا ایک مکمل نقشہ ہمارے ذہن میں بن چکا ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر صورتوں میں اُسے کاغذ پر بھی منتقل کیا جا چکا ہوتا ہے اور پھر ہی اُس کی تعمیر کے مرحلے کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی بھی سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہمارے ذہن میں منزل کا ایک واضح نقشہ موجود ہوتا ہے کہ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُس منزل تک پہنچنے کے تمام مراحل بھی پہلے تخیل یا ذہن کی سطح پر ہی ترتیب پاتے ہیں اور پھر ہی سفر کا آغاز ہوتا ہے یونہی کسی تحریر کو لکھنے سے پہلے موضوع یا عنوان کا تعین اور اُس کے خدوخال تخیل کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں اور پھر وہ تحریر کا لبادہ پہنتے چلے جاتے ہیں۔ دنیا کے اندر آج تک جتنی بھی ایجادات اور ترقیاں ہوئی ہیں۔ بغیر کسی استثنیٰ کے اُن سب کا پہلا نقشہ موجودوں کے ذہن میں بنا اور پھر دوسرے درجے میں جا کر عملی شکل میں معرض وجود میں آئیں۔

طور بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں کسی بھی کام کو خوش اُسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پہلے ذہنی منصوبہ بندی ہوتی ہے اور پھر اُس پر عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ جتنی اچھی منصوبہ بندی ہوگی اتنا ہی بہتر طریقے سے وہ کام سرانجام پائے گا۔ ترکھانوں کے ہاں ایک اصول رائج ہے کہ "دو مرتبہ ناپو اور ایک مرتبہ کاٹو" اس کا مطلب یہی ہے کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار سے لائحہ عمل بنالیا جائے تاکہ بے خبری میں غلط قدم اٹھا کر بجائے فائدہ کے الٹا نقصان نہ کر لیا جائے۔ اس طرح فوجیوں کو ایک اصول سکھایا جاتا ہے، "Maintenance of Aim" (ہدف کو برقرار رکھنا)۔ یعنی چلتے ہوئے ہر قدم پر منزل کا واضح تصور ذہن میں رکھنا تاکہ بے دھیانی میں قدم غلط سمت میں نہ اٹھنے لگیں اور انسان منزل کے قریب ہونے کی بجائے مزید دور نہ ہوتا جائے۔ حضور ﷺ نے قبیلہ عبدالقیس کے سربراہ سے فرمایا:

ان فيك لخصلتين يحبهما الله الحلم والاناة. (۱۸)

"تمہارے اندر دو خصالتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں ایک حلم (غصہ سے مغلوب نہ

ہونا) اور دوسرے جلدی نہ کرنا (بلکہ ہر کام کو سوچ سمجھ کر وقار اور شائستگی سے سرانجام دینا)۔"

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

السمت الحسن والتودة والاقتصاد جزء من اربع وعشرين جزءاً ۱ من النبوة. (۱۹)

”اچھی سیرت، اطمینان و وقار سے اپنے کام سرانجام دینا اور میانہ روی نبوت کے 24 حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔“

ایک اور مقام پر آپ ﷺ نے فرمایا:

الاناة من الله والعجلة من الشيطان. (۲۰)

”شائستگی اور متانت سے اپنے کاموں کو سرانجام دینا اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی کرنا شیطان کی طرف سے ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ غور و فکر اور سوچ و بچار کے بعد سرانجام دیئے جانے والے کاموں میں دانش رجمانی شامل ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس جو کام بھی بلا سوچے سمجھے اور انجام پر غور کئے بغیر جلد بازی میں کئے جاتے ہیں ان میں شیطانی عمل کی آمیزش شامل ہو جاتی ہے۔

پہلی اور دوسری عادت کا باہمی تعلق

☆ پہلی عادت نے بتایا کہ آپ اپنی گاڑی کے ڈرائیور ہیں نہ کہ مسافر، جب کہ دوسری عادت کہتی ہے کہ فیصلہ کریں آپ نے کہاں جانا ہے اور اُس جگہ کا نقشہ کھینچیں۔

☆ پہلی عادت نے بتایا کہ آپ تخلیق کار ہیں۔ دوسری عادت کہتی ہے کہ اپنی پہلی ”تخلیق“ خود کریں۔

☆ پہلی عادت نے بتایا کہ آپ پروگرامر ہیں۔ دوسری عادت کا مطالبہ ہے کہ اپنا پروگرام خود بنائیں۔

یہاں عام لوگ یہ غلطی کر جاتے ہیں کہ روزمرہ کی زندگی کے عام معمولات میں وہ پہلی تخلیق (یعنی ذہنی تخلیق) بالعموم شعوری طور پر یا سوچ سمجھ کر نہیں کرتے اور بلا سوچے سمجھے جو بات ذہن میں آجائے اُس پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہیں سے انسانی زندگی کی بیشتر محرومیوں اور گمراہیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان کی رائے کو ایک خاص شکل دینے میں اُس کے ارد گرد کا ماحول، معاشرتی رسوم و رواج، دوست احباب، والدین کی تربیت اور سکول و کالج کی تعلیم وغیرہ جیسے عوامل بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نتیجہً انسانی شخصیت ایک خاص سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے اور انسان دوسروں کے لکھے ہوئے

سکرپٹ پر اداکاری کرتے ہوئے ہی اپنی قیمتی اور انمول زندگی کو ضائع کرتا چلا جاتا ہے اور اپنے مخصوص جوہر کو دریافت کرنے اور اُسے بروئے کار لانے نیز اپنے اُس کردار کو بھرپور طریقے سے سرانجام دینے میں ناکام رہتا ہے جو دنیا کی اس سٹیج پر قدرت کی طرف سے اُس کے لیے ودیعت کیا گیا تھا۔

ہمیں جان لینا چاہیے کہ زندگی جیسی گر انقدر دولت صرف اور صرف ایک بار ملتی ہے۔ پھر موت زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ حیات جاودانی کا دیباچہ ہے جس کے اچھے یا بُرے ہونے کا دار و مدار مکمل طور پر اس بات پر ہے کہ ہم نے اس چند روزہ زندگی کو کیسے گزارا لہذا صورت حال کی حساسیت (Sensitivity) اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم شاہراہ حیات پر آنکھیں کھول کر چلیں اور پھونک پھونک کر قدم رکھیں۔ اس مقصد کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم قرآن و حدیث کی تعلیمات سے راہنمائی لیتے ہوئے، اپنے حالات اور ماحول کے تقاضوں اور مجبوریوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نیز اپنے ذوق، رجحان و مزاج اور اپنی منفرد خصوصیات کی گہری معرفت حاصل کرتے ہوئے خوب غور و فکر کر کے زندگی کا ایک لائحہ عمل ترتیب دیں۔ زندگی گزارنے کے کچھ راہنما اصول اور ضابطے مقرر کریں۔ جن کی بنیاد ابدی سچائیوں پر ہو اور جو فطرت کے اصولوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں۔ پھر اُن اصولوں کو دل و دماغ میں نقش کر لیں اور زندگی کے ہر لمحے میں اپنی جملہ حرکات و سکنات، تمام فیصلہ جات اور عملی اقدامات میں اُن کو حتی الوسع ملحوظ خاطر رکھیں۔ یہ گویا ہمارے لیے زندگی کا آئین ہوگا جس کی روشنی میں ہم زندگی کے معاملات کو بہتر انداز سے چلانے کے قابل ہو جائیں گے اور ادھر ادھر بھٹکنے سے بچ جائیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مہذب ملک کو چلانے کے لیے ایک آئین ضروری ہوتا ہے اور اُس کے تمام معاملات اُسی کی روشنی میں طے کیے جاتے ہیں۔ اس آئین کی موجودگی میں ایک طرف تو ہم اپنے اندر اُٹھنے والی ناجائز خواہشات کے منہ زور ریلے میں بے بس تنکوں کی مانند بننے سے بچ جائیں گے اور دوسری طرف ماحول اور معاشرے کے لکھے ہوئے سکرپٹ پر اداکاری کرنے سے بچ جائیں گے۔ ہمارا ہر قدم ہمارے طے شدہ اصولوں اور اعلیٰ اقدار کا ترجمان ہوگا۔ نتیجہً زندگی کا معیار بہتر سے بہتر ہوتا چلا جائے گا اور زندگی کا دامن سچی خوشیوں، دائمی مسرتوں اور ابدی راحتوں سے بھرتا چلا جائے گا۔ نہ صرف یہ کہ ہماری دینی زندگی خوشگوار ہوتی چلی جائے گی بلکہ اس زندگی کے اختتام پر جو ابدی زندگی آنے والی ہے اُس میں بھی ہم کامیاب اور سرخرو ہو سکیں گے۔ یہی عادت نمبر 2 کا منہائے مقصود ہے۔

نصب العین پر مشتمل تحریر کیسے لکھی جائے؟

اپنے نصب العین پر مشتمل تحریر لکھنے یا بالفاظ دیگر اپنے آئین زندگی کو مرتب کرنے کے لیے ہمیں اپنی شخصیت کے اندرونی حصے میں جھانکنا ہوگا اور اپنے من میں ڈوب کر زندگی کے سراغ کو پانا ہوگا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہمارے اصل عقائد، نظریات اور نکتہ ہائے نظر ہوتے ہیں جو ہماری جملہ حرکات و سکنات اور اعمال و افعال کی جہتوں کو متعین کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر مرحلے ہر جو کچھ بھی ہم سے سرزد ہوتا ہے اُس کی تہہ میں ہمارے یہی افکار و نظریات اور زاویہ ہائے نگاہ کارفرما ہوتے ہیں۔ بقول قرآن مجید

قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ ۖ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا ۝ (۲۱)

”(اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) فرمادیں کہ ہر کوئی اپنے طریقہ پر عمل کرتا ہے۔ پس تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے۔“

یہاں طریقہ (شاکلہ) سے مراد وہ خاص ذہنی سانچہ ہے جس کے تحت ہر آدمی سوچتا اور پھر اُس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی جگہ کو قلب کہتے ہیں جس کی اصلاح و فساد پر پوری شخصیت کے سنورنے اور بگڑنے کا دارومدار ہے۔ (۲۲) چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا:

الا ان في الجسد لمضعة اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله الا وهي القلب۔ (۲۳)

”آگاہ ہو جاؤ، انسانی جسم میں گوشت کا ایک لوتھرا ہے۔ جب یہ سنور جائے تو پورا جسم سنور جاتا ہے اور جب یہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ جان لو کہ یہ دل ہے۔“

دوسری حدیث مبارکہ میں حضور ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

التقوى ههنا ”تقویٰ یہاں ہوتا ہے“ (۲۴)

مطلب یہ کہ نیکی اور بدی کے رجحانات کا منبع و سرچشمہ انسان کا دل ہے جس طرح کے عقائد اور خیالات دل میں ہوں گے اسی طرح کے اعمال انسان سے ہم لیں گے۔ انسانی شخصیت میں دل کی حیثیت بادشاہ کی ہے باقی تمام اعضاء اُس کے تابع ہیں۔ مثلاً جب ہمارے دل نہیں کسی کے لیے محبت

ہوتی ہے تو زبان اس سے ہم کلام ہونا چاہتی ہے، کان اس کی بات سننا چاہتے ہیں آنکھیں اسے دیکھنا چاہتی ہیں اور جسم اس کے پاس بیٹھنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے وہ محبت نفرت میں بدل جائے تو تمام اعضاء کا طرز عمل یکسر بدل جاتا ہے۔ لہذا اگر ہم اپنی شخصیت میں کوئی مثبت اور پائیدار تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں اپنی شخصیت کے باطنی حصہ پر محنت کرنا ہوتی۔ اور پہلے اپنے من کو تبدیل کرنا ہوگا۔ وہی تبدیلی حقیقی اور دیر پا ہوتی ہے جس کا آغاز اندر سے ہوتا ہے۔ باطن کا بدلا ہوا حال انسان کے ظاہری اعمال کو خود بخود تبدیل کرنا شروع کر دیتا ہے۔

ہم بچپن سے جس طرح کے ماحول اور معاشرے میں پروان چڑھتے ہیں، گھر اور مدرسے سے جس طرح کی تعلیم و تربیت ہمیں میسر آتی ہے نیز جس طرح کی صحبت ہمیں میسر آتی ہے ان سب کے اثرات ہماری شخصیت کے اندرونی حصے میں جمع ہوتے چلے جاتے ہیں اور ہمارے اندر عقائد و نظریات کا ایک خاص نمونہ (Pattern) بناتے چلے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں شخصیت ایک خاص سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ یہ باطنی تحریریں جو ہمیں گھر، مدرسے، ماحول، معاشرے اور دوست احباب وغیرہ کی طرف سے ملتی ہیں ہم جوان ہونے تک ان کو من و عن قبول کر چکے ہوتے ہیں اور ان کی صداقت و حقیقت پر ایمان لا چکے ہوتے ہیں۔ ہم یہ دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے کہ آیا ہمارے باطن میں لکھی جانے والی یہ تحریریں حقیقت واقعی سے مطابقت بھی رکھتی ہیں یا نہیں۔ چنانچہ بلا سوچے سمجھے انہی کے تحت ہم اپنی زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو بندہ جس ماحول، مذہب یا عقیدے کے تحت پرورش پاتا ہے وہ ساری عمر اس کے دائرے سے نکل ہی نہیں پاتا خواہ وہ سو فی صد غلط ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام انسان کو اس طرح کی اندھی تقلید سے منع کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی درست اصولوں اور قوانین فطرت پر استوار کرنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ زندگی ٹھوس اور حقیقی بنیادوں پر پروان چڑھ سکے اور عروج سے ہمکنار ہو سکے۔ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جانے والی سورۃ فاتحہ کے اندر جو واحد دعا انسان اللہ سے مانگتا ہے وہ یہی ہے:

اٰھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۲۵﴾

”اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔“

مطلب یہ کہ زندگی گزارنے کی جو درست روش ہے ہمیں اُس روش کو سمجھنے اور اُس پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ حضور علیہ السلام کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے۔

اللهم ارنا الا شياء كماهى . (۲۶)

”اے اللہ ہمیں چیزوں کو اسی طرح دیکھنے کی توفیق عطا فرما جیسی وہ ہیں۔“

کسی بھی چیز کی حقیقت کو پانے کے لیے اُسے درست رخ سے دیکھنا ضروری ہے۔ اگر انسان اُسے غلط رخ سے دیکھ رہا ہو تو وہ اُس کی اصلیت کو پانے میں ناکام رہے گا۔ نیز آگے یہ الفاظ منقول ہیں۔

اللهم ارنا الحق حقا وار زقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وار زقنا اجتنابه . (۲۷)

”اے اللہ! ہمیں حق کو حق کی صورت میں دیکھنے اور پھر اُس کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل کے روپ میں دیکھنے اور پھر اُس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔“

حق کو حق کی صورت میں دریافت کر لینا ایک چیز ہے اور پھر اُس پر عمل پیرا ہو جانا دوسری بات ہے۔ کئی مرتبہ تو انسان کسی معاملے میں حقیقت کو پانے میں ہی ناکام رہتا ہے لیکن بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان حقیقت سے آشنا ہو جانے کے باوجود کسی وقتی مفاد، دینیوی مصلحت یا اپنی جھوٹی شان و شوکت اور پندار کو قائم رکھنے کے لیے اُس سچائی کو تسلیم کرنے اور اپنانے سے انکار کر دیتا ہے اور جانتے بوجھتے ہوئے اپنے آپ کو تباہی و بربادی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ جیسا کہ کفار مکہ کے متعلق قرآن فرماتا ہے۔

يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاهُمْ . (۲۸)

”یہ کفار میرے محبوب ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔“

اتنی واضح پہچان کے باوجود کس چیز نے انہیں تسلیم کرنے سے باز رکھا؟ محض اُن کے تکبر اور حسد نے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے تکبر کی تعریف ان الفاظ میں بیان فرمائی۔

الكبر بطر الحق و غمط الناس . (۲۹)

”تکبر یہ ہے کہ انسان حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔“

اسی طرح باطل کو باطل کے روپ میں دیکھ لینا پہلا مرحلہ ہے اور پھر اُس سے اجتناب کرنا اگلا مرحلہ ہے۔ یہاں بھی بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان پر کسی کام کا غلط ہونا واضح ہو جاتا ہے لیکن وہ محض اپنی انا کی تسکین یا کسی اور وقتی مصلحت کی خاطر اُسے ترک کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

ہمیں اس حقیقت کو ذہن نشین کرنا ہوگا کہ اگر ہم اپنی زندگی کو درست اصولوں اور ٹھوس حقائق پر استوار کرنا چاہتے ہیں اور دنیا و آخرت کی کامیابیاں حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے دامن کو حقیقی خوشیوں اور مسرتوں سے بھرنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں جرات مندانہ انداز سے کام لیتے ہوئے اپنے باطنی افکار و خیالات اور عقائد و نظریات کا تجزیہ کرنا ہوگا اور اُن کی چھانٹی کرنا ہوگی کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ ہمیں اپنے باطن میں لکھی ہوئی تحریروں کا جائزہ لینا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ اُن میں سے کون کون سی باتیں حقائق سے مطابقت رکھتی ہیں اور کون سی خلاف حقیقت اور بے بنیاد ہیں۔ ایک مرتبہ ہمت کر کے یہ کام کر لیا جائے اور زندگی کو درست اصولوں پر استوار کر لیا جائے تو پھر عمل کے زاویے خود بخود درست ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور شاہراہِ حیات پر ترقی و ارتقاء کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ بصورتِ دیگر زندگی انتشار، پراگندگی اور آوارگیوں کا شکار رہتی ہے۔

زاویہ نگاہ کی اہمیت

ہمارے اندرونی زاویہ ہائے نگاہ جہاں سے ہمارے تمام رجحانات، رویہ جات اور ظاہری اعمال جنم لیتے ہیں اُن کی مثال عینک کے شیشوں کی ہے۔ اگر ہم کسی مخصوص رنگ کے شیشوں کی عینک لگا لیتے ہیں تو پھر ہمیں ہر چیز اسی رنگ کی دکھائی دے گی۔ اور ہم ہر چیز کی تشریح اپنے مشاہدے کے مطابق ہی کریں گے۔ خواہ ہماری رائے حقیقت کے کتنی ہی برعکس ہو مگر ہمیں اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوگا۔ لہذا چیزوں کو صحیح روپ میں دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری عینک کے شیشوں کا رنگ قدرتی ہو۔ اسی طرح حالات و واقعات کا صحیح جائزہ لینے اور چیزوں کی درست حقیقت کو جاننے کے لیے ہمارے نقطہ ہائے نگاہ کا قوانینِ فطرت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ یا پھر یوں سمجھ لیں کہ ہمارے زاویہ ہائے نگاہ کی مثال منزل کے نقشہ کی ہے۔ اگر ہمارے ہاتھ میں پکڑا ہوا نقشہ ہی غلط ہو تو ہم کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے خواہ ہم کتنی ہی کوشش کرتے رہیں۔ منزل پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہمارے ہاتھ میں مطلوبہ جگہ کا درست نقشہ موجود ہو۔ اسی طرح عملی زندگی میں ہماری کوششوں اور کاوشوں کے ثمر آور ہونے کا

دارو مدار اس بات پر ہے کہ ہمارے عقائد و نظریات کے نقشے درست اور حقیقت واقعہ سے مطابقت رکھتے ہوں۔ جب تک ہماری سوچ اور فکر کے زاویے درست نہیں ہو جاتے اور زندگی کو ایک واضح جہت نہیں مل جاتی تب تک ہماری تمام تر محنتوں اور مشقتوں کے باوجود زندگی اپنے حقیقی کمال کو پانے سے محروم رہے گی۔

ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ ہمارے لیے محض چلنا اور حرکت کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ سمت کا درست ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص میں قدم مشرق کی طرف چلتا ہے اور پھر اٹنے پاؤں مڑ کر نہیں قدم مغرب کی طرف چلتا ہے بعد ازاں اپنا رخ شمال کی طرف کرتے ہوئے میں قدم اس سمت میں چل کر پھر اپنا رخ جنوب کی طرف کر کے میں قدم چل لیتا ہے تو اسی قدم چلنے کے باوجود یہ شخص حقیقت میں ایک قدم بھی نہیں چلا ہے اور جہاں پہلے کھڑا تھا اب بھی وہیں ہے۔ لہذا اس شخص کے لیے ضروری تھا کہ چلنے سے پہلے درست سمت کا تعین کر لیتا اور پھر مستقل مزاجی سے اس سمت میں چلتا۔ یہی کچھ ہماری اکثریت کے ساتھ ہو رہا ہے کہ زندگی ساری بیت جاتی ہے مگر حقیقی عروج اور ارتقاء نصیب نہیں ہوتا حضور ﷺ نے فرمایا:

من استویٰ یوماہ فہو مغبون (۳۰)

”جس شخص کے دو دن برابر ہوں وہ خسارے میں ہے۔“

مطاب یہ ہے کہ ایک بندہ مومن کے پاس دنیا میں سب سے قیمتی متاع وقت ہے لہذا ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ اس کے ایمان، تعلق باللہ اور معرفت الہی کی کیفیات میں بھی اضافہ ہونا چاہیے۔ یوں نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی زندگی کا ایک مزید دن گزر چکا ہو لیکن وہ ایمان و عرفان کی اسی سطح پر ہو جس پر گذشتہ دن میں تھا۔ ہر گزرتے دن کے ہر لمحے کے ساتھ ایک بندہ مومن کے ایمان، عرفان اور اس کی سیرت و کردار میں پختگی اور نکھار آنا چاہیے۔

زندگی کے عناصر اربعہ

ہماری شخصیت کو مضبوط اور مستحکم بنانے نیز ہمارے ہر لمحے کیے جانے والے فیصلوں پر اثر انداز ہونے والے چار انتہائی اہم عوامل درج ذیل ہیں۔

(i) تحفظ

اس سے مراد اپنی قدر و قیمت کا احساس ہے۔ یعنی بحیثیت انسان اپنے مقام و مرتبہ کو جاننا نیز اپنی انفرادیت کا شعور رکھتے ہوئے اپنی اہمیت، حیثیت سے آگاہ ہونا۔ اس سے خود اعتمادی (Self Confidence) اور عزت نفس (Self-esteem) بنم لیتے ہیں۔ علامہ اقبال نے غالباً اسی کو لفظ ”خودی“ سے تعبیر کیا ہے جو کہ علامہ کے کلام کا مرکزی نکتہ ہے۔

(ii) رہنمائی

اس سے مراد ہے زندگی میں واضح سمت کا وجود ہونا۔ نصب العین کا تعین، منزل کا شعور، اس کی حیثیت قلب نما (Compass) کی سی ہے جو ہمارے لیے سمت کا تعین کرتی ہے اور ہمیں لمحہ بہ لمحہ کیے جانے والے فیصلوں کے لیے ایک معیار فراہم کرتی ہے نیز خارج میں ہونے والے واقعات کی تشریح بھی ہم ان کے ذریعے کرتے ہیں۔

(iii) بصیرت

یہ ہمیں زندگی میں توازن کا احساس دیتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم زندگی کی مختلف جہتوں اور پہلوؤں میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ زندگی کو ایک کل کے طور پر دیکھتے ہوئے اس کے مختلف اجزاء میں رابطہ اور تناسب پیدا کرتے ہیں۔ زندگی کی مختلف سرگرمیوں میں مشغول ہوتے ہوئے ہم ہر چیز کے صحیح مقام اور مرتبے سے آگاہ ہوتے ہیں اور اسے اس کے مطابق ہی اہمیت دیتے ہیں۔

(iv) طاقت

یہ ہماری کچھ کر گزرنے کی صلاحیت اور اہلیت ہے۔ وہ قوت کہ جس کے بل بوتے پر ہم زندگی میں مختلف کام نہ انجام دیتے ہیں اور مختلف مقاصد کو حاصل کرتے ہیں۔ اسی کے ذریعے ہم اپنی پرانی اور پختہ عادات پر حاوی ہو سکتے ہیں۔ اور نئی، اعلیٰ اور موثر عادات اپنا سکتے ہیں۔ یہ ہمارا اپنے بارے میں وہ احساس ہے جو مطلوبہ مقاصد کے لیے آگے بڑھ کر ہمیں عملی جدوجہد کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام قوت ارادی (Will Power) ہے۔

ان چاروں عناصر۔۔۔ تحفظ، رہنمائی، بصیرت اور طاقت۔۔۔ کا ایک دوسرے پر انحصار ہوتا ہے۔ تحفظ اور صحیح رہنمائی سچی بصیرت عطا کرتے ہیں۔ اور بصیرت ہماری طاقت کا پیش خیمہ بھی ہوتی

ہے اور اسے جلا بھی بخشتی ہے۔ جب یہ چاروں عناصر ہم آہنگی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ بیک وقت موجود ہوں تو پھر یہ ایک متوازن کردار اور مکمل شخصیت کی عظیم طاقت میں ڈھل جاتے ہیں اور ایک انتہائی خوبصورت انداز میں مربوط شخصیت جنم لیتی ہے۔

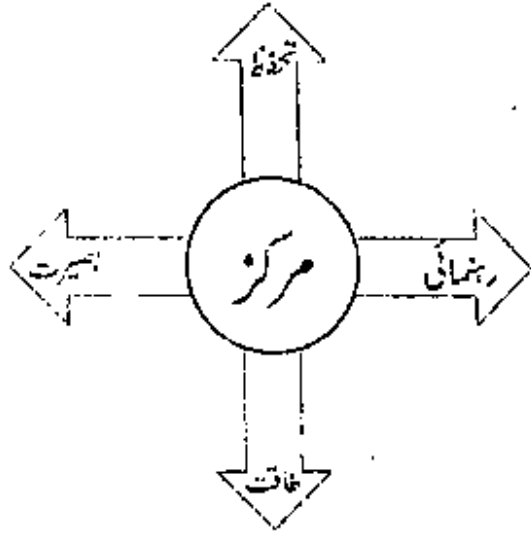
یہ زندگی کے قوت بخش عناصر زندگی کی تمام دوسری جہتوں کو بھی تقویت بخشتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نہ تو اپنے آپ میں سونی صد مکمل ہے اور نہ ہی غیر اہم ہے۔ ان میں سے جس کسی کو بھی جتنا ہم نے اپنے اندر پیدا کر لیا وہ زندگی میں پختگی اور مضبوطی کے سفر میں اسی درجے میں ہمارے کام آتا رہے گا۔ نچلی سطح پر اور ابتدائی درجے میں یہ چاروں عناصر بہت کمزور ہیں۔ اور ایسی صورت میں ہمارا انحصار بنیادی طور پر دوسرے لوگوں کے رویہ جات اور خارجی حالات کے رحم و کرم پر ہوگا۔ بالفاظ دیگر ہماری زندگی کی لگا میں ہمارے اپنے ہاتھ میں ہونے کی بجائے ان لوگوں یا چیزوں کے ہاتھوں میں ہوں گی جن پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں ہوگا۔ لیکن جب ہم ان عناصر اربعہ کو پروان چڑھا کر اور نشوونما دے کر اعلیٰ درجے میں اور اونچی سطح پر لے آتے ہیں تو ہماری شخصیت مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور اس وقت ہمارے پاس ایک اپنی طاقت ہوتی ہے اور ایک ایسی ٹھوس بنیاد موجود ہوتی ہے کہ جس پر انحصار کرتے ہوئے ہم اپنے منفرد اور جداگانہ تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے لوگوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔

ہمارے ”احساس تحفظ“ کا اعلیٰ درجہ وہ ہے۔ جہاں اپنے بارے میں گہری قدردانی اور ذاتی تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ جب کہ پست ترین درجہ وہ ہے جہاں شدید عدم تحفظ ہوتا ہے۔ اور زندگی غیر مستحکم کرنے والی معمولی خارجی قوتوں سے بھی منتشر ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح ہماری رہنمائی کی بھی دو سطحیں ہیں۔ اوپر والی سطح پر ہمارے اندر اپنی متعینہ اقدار اور واضح سمت کا مضبوط اور بھرپور احساس موجود ہوتا ہے جب کہ نچلی سطح پر ہماری رہنمائی کا انحصار مکمل طور پر معاشرتی آئینے اور دوسرے کمزور کردینے والے عناصر پر ہوتا ہے۔ یونہی ہماری بصیرت جب انتہائی اوپر والی سطح پر ہوتی ہے تو وہاں زندگی کا ایک مکمل اور درست نقشہ موجود ہوتا ہے۔ جہاں ہر چیز اور اصول کا آپس میں تعلق بڑا واضح ہوتا ہے۔ لیکن بصیرت کی انتہائی نچلی سطح پر ایک بالکل ہی غلط نقشہ ہوتا ہے جہاں ہر چیز بدنما اور بے جواز معلوم ہوتی ہے۔ یہی حال ہماری ”طاقت“ کا ہے۔ ”طاقت“ جب اعلیٰ درجے میں ہوتی ہے تو ہمیں اپنے آپ پر مکمل اور بھرپور اعتماد ہوتا ہے۔ اور ہم اپنی زندگی کی گاڑی کو خارجی حالات اور دوسرے لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ

دینے کی بجائے اپنی پسندیدہ اور طے شدہ اقدار کے مطابق خود چلاتے ہیں۔ لیکن ”طاقت“ کے پست ترین درجے میں ہم مکمل طور پر جمود کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور ہماری حیثیت ایک کٹھ پتلی کی سی ہو جاتی ہے جو دوسروں کے اشاروں پر چل رہی ہو۔

مندرجہ بالا چاروں عناصر انتہائی اعلیٰ درجے میں بہت کم لوگوں میں موجود ہوتے ہیں۔ تاہم ایسے ہی لوگ تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو حالات اور واقعات کا رخ موڑ دیا کرتے ہیں۔ اور سیلاب کی طرح اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو خس و خاشاک کی مانند بہا کر لے جایا کرتے ہیں۔ یہ لوگ حالات کی ناہمواریوں اور نشیب و فراز کو کسی بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی ڈگر پر چلتے رہتے ہیں۔ اور منزل مقصود پر پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں۔ تاریخ کے اندر جتنے بھی نمایاں نام ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سارے کے سارے وہی لوگ تھے جن کے اندر مذکورہ بالا چاروں عناصر اعلیٰ درجے میں موجود تھے۔ اس کے برعکس جن لوگوں میں یہ چاروں عناصر انتہائی نچلی سطح پر ہوتے ہیں وہ کیڑوں مکوڑوں کی طرح حقیر سی زندگی گزار کر گمنامی کے قبرستان میں دفن ہو جاتے ہیں۔ تاہم عام لوگوں میں یہ چاروں عناصر دونوں انتہاؤں کے درمیان کہیں پائے جاتے ہیں۔ کسی بھی شخصیت کی مضبوطی اور استحکام کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اُس میں یہ چاروں عناصر کس درجے میں موجود ہیں۔ جس شخص میں یہ عناصر جتنے اونچے درجے میں موجود ہوں گے۔ وہ اندرونی و بیرونی طور پر اتنا ہی مضبوط و مستحکم ہوگا اور جس میں یہ جتنے کم تر درجے میں ہوں گے اُس میں اتنی ہی کمزوری اور عدم استحکام ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی تمام جہتوں اور جملہ پہلوؤں پر زبردست طریقے سے اثر انداز ہونے والے اور شخصیت کے استحکام یا عدم استحکام میں اہم کردار ادا کرنے والے ان چاروں عناصر کا اپنا انحصار کس چیز پر ہے۔ وہ کون سی چیز ہے جو ان پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان کو عروج یا زوال سے ہم کنار کرتی ہے۔؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان چاروں عناصر کا دارومدار اُس مرکز پر ہے جس کے گرد زندگی گھوم رہی ہوگی۔ مرکز سے مراد وہ بنیادی زاویہ نظر ہے جو ہماری شخصیت کے اندرونی حصے میں رچ بس گیا ہو اور ہماری پہلی ترجیح بن چکا ہو۔ جو کچھ بھی ہم اپنی زندگی کے دائرے کا مرکز و محور بنالیں گے وہی کچھ ان چاروں عناصر پر بھی اثر انداز ہوگا اور ان کی ترقی و تنزلی میں اہم کردار ادا کرے گا۔ گو یا یہ صورت حال کچھ یوں بنتی ہے۔



زندگی کے چند عمومی مراکز

ہم میں سے ہر شخص کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مرکز ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت مرتبہ ہمیں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا نہ ہی عام طور پر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس مرکز کا ہماری زندگی کے ہر پہلو پر کس قدر گہرا اور مکمل طور پر احاطہ کر لینے والا اثر ہوتا ہے۔

اب ہم معاشرے میں عام طور پر پائے جانے والے چند ایک مراکز یا بنیادی زاویہ ہائے نظر کا جائزہ لیتے ہیں جس کے نتیجے میں ہم اس بات کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکیں گے کہ یہ مراکز کس طرح مذکورہ بالا چاروں عناصر (تحفظ - رہنمائی - بصیرت - طاقت) کو متاثر کرتے ہیں اور نتیجہً اُس طرح ہماری زندگی کا مجموعی تاثر ابھرتا ہے۔

(i) شادی کا مرکز

رشتہ ازدواج انسان کا سب سے قریبی، سب سے سکون بخش، سب سے دیر پا اور تقویت دینے والا انسانی رشتہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ اسے حکمت اور سلیقے سے منظم کیا جائے۔ قرآن مجید نے ایک مقام پر "لتسکنوا الیہا" (۳۱) (تاکہ تم اُن سے سکون حاصل کرو) کہہ کر اس رشتے کا باعث سکون ہونا بتایا ہے اور دوسرے مقام پر "هن لباس لکم وانتم لباس لهن" (۳۲) (وہ تمہارا لباس ہیں اور تم اُن کا لباس ہو) فرما کر اس رشتے کی قربت کی انتہا کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ ایک فطری سی بات ہے کہ بعض اوقات کوئی خاوند اپنی بیوی کو یا بیوی اپنے خاوند کو اپنی سوچوں کا مرکز بنالے۔ ایسے تمام معاملات میں

جہاں کسی نے اپنے ساتھی کو اپنی زندگی کا مرکز بنا رکھا ہو وہاں ایک خامی ضرور پائی جاتی ہے اور وہ ہے دوسرے پر شدید جذباتی انحصار۔

جب ہم اپنے جذبات کی قدر و قیمت کا احساس بنیادی طور پر اپنی شادی سے اخذ کرتے ہیں تو پھر ہمارے اندر اس رشتے پر شدید قسم کا انحصار پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے ساتھی کے موڈ، اس کے محسوسات، اُس کے ہمارے ساتھ رویے اور سلوک سے زبردست طریقے سے متاثر ہوتے ہیں۔ کوئی بھی بیرونی عنصر یا واقعہ ہمارے تعلقات کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ قدم قدم پر غلط فہمیاں شکوک و شبہات اور شکوے شکایات پیدا ہوتے ہیں اور بعض اوقات نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے تعلق میں بظاہر تو سب کچھ ٹھیک نظر آ رہا ہوتا ہے مگر دراصل یہ بڑا عارضی اور غیر محفوظ سا ہوتا ہے چونکہ اس میں رہنمائی وقتی جذبات سے اخذ کی گئی ہوتی ہے ایک دوسرے پر منفی انحصار اور اُس پر مبنی تعلق میں بصیرت اور طاقت کہیں کھو جاتے ہیں۔

انسان جب کسی چیز کو زندگی کا مرکز مان لیتا ہے۔ تو اُس کے کیا اثرات اُس کی سوچ پر مرتب ہوتے ہیں اور کس طرح زندگی کے دیگر پہلوؤں پر وہ نکتہ نظر حاوی ہوتا ہے اس کی ایک مثال فرائڈ جیسا مشہور ماہر نفسیات ہے جس نے زندگی کا مرکز و محور جنسی جذبہ (Sex) کو مان لیا تو وہ ساری زندگی اس کے دائرے سے باہر آ کر سوچ ہی نہ سکا۔ اُس کی تمام تر نفسیات اسی نکتے کے گرد گھومتی رہی اور وہ ہر معاملے کی تشریح اسی جذبے کے حوالے سے کرتا رہا۔

(ii) خاندان کا مرکز

انسان جس بھی خاندان سے تعلق رکھتا ہو اُس سے قدرتی طور پر ایک لگاؤ رکھتا ہے۔ اُسے بہتر اور مضبوط دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ اُس کی مضبوطی میں اُسے اپنی مضبوطی اور استحکام دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر خاندان کو اپنا مرکز بنا لیا جائے تو پھر انسان خاندانی رسم و رواج کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ باپ دادا کی طرف سے ملنے والی روایات خواہ وہ کتنی ہی فرسودہ اور خلاف حقیقت کیوں نہ ہوں انسان اُن کو سینے سے لگا کر رکھتا ہے اور یوں اُس کی زندگی ایک خاص دائرے میں بند ہو کر جمود اور تعطل کا شکار ہو جاتی ہے۔

جن لوگوں کا مرکز خاندان ہوتا ہے وہ اپنے تحفظ اور ذاتی قدر قیمت کا احساس، خاندانی روایات اور اُس کی شہرت سے اخذ کرتے ہیں (ہمارے ہاں بعض لوگوں کا بڑے فخر کے ساتھ اپنا تعارف کسی

مخصوص برادری / قبیلے / خاندان کی نسبت سے کروانا اس کی ایک واضح مثال ہے) لہذا ان میں ایک کمزوری پیدا ہو جاتی ہے جب بھی ان خاندانی روایات میں کوئی تبدیلی آئے گی یا اس کی شہرت کو کوئی نقصان پہنچے گا تو وہ بہت بُرے طریقے سے متاثر ہونگے۔ ایسے لوگ انتخابات میں ووٹ ڈالتے وقت قطعاً نہیں دیکھتے کہ صحیح کون ہے اور غلط کون ہے؟ وہ صرف اور صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے اپنے خاندان یا برادری کا بندہ کون سا ہے۔ خواہ اُس کا کردار کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو۔ ایسے لوگوں کے لیے اُن کا خاندان گویا ایک بت بن جاتا ہے جس کی وہ پوجا کر رہے ہوتے ہیں اُن کے احساس تحفظ، رہنمائی، بصیرت اور طاقت کا تمام تر دار و مدار خاندان اور اُس کی روایات پر ہوتا ہے۔

(iii) دولت کا مرکز

اللہ رب العزت نے مال و دولت کو انسانی زندگی کے قیام اور بقا کا ذریعہ بنایا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (۳۳)

”اور تم اپنے مال نادانوں کے حوالے نہ کرو جس مال کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔“

ایک اور مقام پر اسے خیر قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ (۳۴)

”بے شک انسان خیر (مال) کی محبت میں بہت سخت ہے۔“

انسانی زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے لیے مال کا ہونا بہت ضروری ہے مولانا رومؒ نے زندگی کو کشتی اور مال کو پانی کی مانند قرار دے کر زندگی میں مال کی اہمیت کو بیان فرمایا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا ہے کہ کشتی کی سلامتی اسی وقت تک ہے جب تک پانی نیچے رہے۔ اگر وہ کشتی کے اوپر آ جائے تو وہی پانی کشتی کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ () بالکل اسی طرح جب تک مال ضرورت کے درجے میں رہتا ہے تو خیر ہی خیر ہے لیکن یہی مال جب مقصدِ حیات بن جاتا ہے تو پھر انسان کے لیے بہت بڑا فتنہ بن جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۳۵)

”بے شک تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تمہارے لیے فتنہ (آزمائش) ہیں۔“

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

ان لكل أمة فتنه و فتنه أمتی المال. (۳۶)

”بے شک ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔“

جب زندگی کا مرکز و محور پیسہ بن جاتا ہے تو پھر زندگی کئی طرح کے خوفوں، خدشوں اور اندیشوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ چونکہ مال و دولت کو ثبات اور قرار نہیں ہے۔ اور اس پر منفی انداز میں اثر انداز ہونے والے خارجی عوامل بھی بہت زیادہ ہیں۔ لہذا ایسے لوگوں کو ایک طرف تو یہ فکر کھائے جا رہی ہوتی ہے کہ مزید مال و دولت کو کیسے حاصل کرنا ہے اور دوسری طرف وہ اس غم میں گھلے جا رہے ہوتے ہیں کہ حاصل شدہ سرمائے کی حفاظت کس طرح کرنی ہے اس طرح زندگی کو تقویت دینے والے چاروں عناصر (تحفظ، رہنمائی، بصیرت اور طاقت) بہت پست سطح پر چلے جاتے ہیں۔ جب ایک انسان کی ذاتی قدر و قیمت کا احساس اُس کی کل جمع شدہ پونجی ہی ہوگی تو صاف ظاہر ہے کہ اُس جمع شدہ پونجی پر اثر انداز ہونے والی کوئی بھی چیز اُسے بے چین کر دے گی۔ علاوہ ازیں مال و دولت نہ تو انسان کو صحیح رہنمائی دیتے ہیں اور نہ ہی سچی بصیرت عطا کرتے ہیں۔ بس ایک محدود سی طاقت اور احساسِ تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ مگر یہ طاقت اور تحفظ کا احساس بھی سو طرح کے اندیشوں میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

(iv) کام کا مرکز

بعض لوگ جس شعبے میں ہوتے ہیں وہ اپنے شعبے یا کام کو ہی زندگی کا مرکز و محور بنا لیتے ہیں۔ اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اتنے کام کے دہنی بن جاتے ہیں کہ پھر چاہے انہیں اپنی صحت کی قربانی دینی پڑے، قریبی رشتوں کو پس پشت ڈالنا پڑے یا زندگی کی دوسری اہم باتوں سے صرف نظر کرنا پڑے، وہ بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔ اُن کی بنیادی شناخت ہی کام کے حوالے سے ہوتی ہے۔ مثلاً ”میں ایک ڈاکٹر ہوں“ ”میں ایک ادیب ہوں“ ”میں ایک ایکٹر ہوں“ وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ ان کی شناخت اور قدر و قیمت کا احساس اُن کے کام میں لپٹا ہوتا ہے لہذا اُن کے احساس

تحفظ کو اس وقت خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ جب اُن کے کام پر کوئی اور چیز اثر انداز ہو۔ اُن کی رہنمائی بھی کام کے مطالبوں سے اخذ شدہ ہوتی ہے۔ اور اُن کی بصیرت اور طاقت بھی بس اُن کے کام کے محدود دائرے ہی میں ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں اور شعبوں میں بے اثر ہو جاتے ہیں۔

(۱۰) ملکیت کا مرکز

کچھ لوگ اپنی ملکیت میں موجود مختلف چیزوں مثلاً مکان، دوکان، جائیداد، کار، زیور وغیرہ کو اپنی زندگی کا مرکز بنا لیتے ہیں اور ان کے ذریعے سے ذہنی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ نیز اسی میں سماجی رتبہ (Social status)، عزت و شہرت اور ناموری وغیرہ جیسی غیر مرئی چیزیں بھی شامل ہیں۔ ایسے لوگوں کی تمام سرگرمیوں کا مرکز و محور مندرجہ بالا چیزیں ہی ہوتی ہیں اور اُن کی جملہ حرکات و سکنات انہی چیزوں کی بقا اور تحفظ نیز ان میں اضافے کے گرد گھومتی ہیں۔

تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ یہ بھی انتہائی کمزور مرکز ہے کیونکہ بے شمار بیرونی عناصر ان اشیاء پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اب جو لوگ ان چیزوں کے ذریعے سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کا احساس تحفظ انتہائی پست درجے پر ہوتا ہے کیونکہ انہیں ہر وقت یہ خوف اور ڈر رہتا ہے کہ کہیں یہ سب کچھ کھو نہ جائے۔ وہ جب کسی دوسرے کو ان چیزوں میں اپنے آپ سے بڑھا ہوا محسوس کرتے ہیں تو احساس کمتری اور حسد میں مبتلا ہو جاتے اور جہاں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑھا ہوا محسوس کرتے ہیں تو وہاں تکبر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اُن کی تمام کوششیں اسی ایک نکتے پر مرکوز ہوتی ہیں کہ ان چیزوں کا تحفظ کس طرح کرنا ہے اور ان میں دوسروں سے آگے کیسے بڑھنا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے کمزور اور خامیوں والے مرکز سے حاصل ہونے والی رہنمائی، بصیرت اور طاقت بھی کمزور درجے کی ہوتی ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو کاروبار میں ناکامی یا کسی اور بڑے نقصان کی صورت میں دل برداشتہ ہو کر خود کشی کر لیتے ہیں۔

(vi) لذت کا مرکز

ملکیت کے مرکز سے جڑا ہوا ایک اور مرکز لذت کا ہے۔ ہماری دنیا میں لذت کے بے شمار سامان موجود ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے۔ لذت سے مراد جسمانی اور حسی لذتیں بھی ہیں

مثلاً کھانا، پینا، جنسی تعلقات اور راحت و آسائش کے دیگر بے شمار سامان اور ذہنی لذتیں بھی مثلاً فلمیں، ڈرامے ناول اور مختلف قسم کے کھیل تماشے جن کا مقصد صرف ذہنی عیاشی ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا ساری چیزیں انسان کو وقتی طور پر ایک سکون اور راحت کا احساس دیتی ہیں لیکن یہ سب کچھ عارضی، فانی اور ناپائیدار ہوتا ہے۔ لوگ ان کے ظاہری پہلو اور وقتی نفع کو دیکھتے ہوئے ان کے دلدادہ بن جاتے ہیں اور زندگی کا مرکز و محور انہی جسمانی و ذہنی لذتوں کو بنا لیتے ہیں لیکن ان کے اندر انہماک ہی انسانی زندگی کو بے شمار پریشانیوں، محرومیوں اور مسائل میں مبتلا کر دیتا ہے اور زندگی کو کانٹوں کا بچھونا بنا دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میانہ روی اور اعتدال کے دائرے میں رہتے ہوئے بے ضرر تفریح (جس کی اسلام میں اجازت دی گئی ہو) انسان کو ذہنی و جسمانی آرام بخشتی ہے اور اُس کی صلاحیتوں کو تروتازہ اور طبیعت کو شگفتہ و شاداب رکھتے ہوئے اُسے اپنے فرائض زیادہ بہتر انداز میں سرانجام دینے کے قابل بناتی ہے نیز دوسرے لوگوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات میں بھی مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ لیکن جب زندگی کا مقصد ہی محض لذت کا حصول بنا لیا جائے تو اس سے کبھی بھی گہری اور دیرپا تسکین حاصل نہیں ہو سکتی۔ لذت و عیاشی پر مرکوز انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لذت کے موجودہ درجے سے بہت جلد اکتا جاتا ہے اور پھر اُس سے اعلیٰ درجے کی لذت چاہتا ہے۔ اس طرح اُس کی زندگی محض عیاشی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ کسی اور کام کا نہیں رہتا۔

بہت لمبی چھٹیاں گزارنا، بہت زیادہ فلمیں یا ٹی وی دیکھنا، بہت زیادہ ویڈیو گیمز کھیلنا، بہت زیادہ غیر منظم وقت گزارنا کہ جس میں انسان کا جو دل چاہے کرتا رہے وغیرہ جیسی چیزیں ایسی ہیں جو بہت جلد انسان کو بے کار بنا دیتی ہیں۔ ایسے انسان کی صلاحیتیں بے کار پڑی رہتی ہیں۔ اُس کے جوہر کی نشوونما نہیں ہو پاتی۔ جسم اور جان سست ہو جاتے ہیں اور روح و دل بے سکون رہتے ہیں۔ ہر طرح کی لذتوں اور راحتوں سے استفادہ کرنے کے باوجود زندگی حقیقی کیف اور سکون سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں تحفظ، رہنمائی، بصیرت اور طاقت اپنے انتہائی پست درجے پر ہوتے ہیں۔

(vii) دوستی کا مرکز

بعض لوگ اپنی زندگی کا مرکز دوستی کے جذبے کو بنا لیتے ہیں۔ کوئی دوست (یہ صنفِ موافق سے

بھی ہو سکتا ہے اور صنفِ مخالف سے بھی) اس طرح انسان کی زندگی میں آجاتا ہے کہ اُس پر بہت زیادہ جذباتی انحصار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ مرض بالعموم جوانی میں لگتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان کے سکون و راحت کا دار و مدار دوسرے کے ہر وقت بدلتے موڈ، احساسات، جذبات اور رویے پر ہوتا ہے۔ اور یہ انتہائی کمزور بنیاد ہے کیونکہ کسی ایک شخص پر اتنا زیادہ جذباتی انحصار بہت سارے منفی مسائل پیدا کرتا ہے۔ نتیجتاً تحفظ، رہنمائی، بصیرت اور طاقت بھی نچلے درجے میں چلے جاتے ہیں۔

کئی مرتبہ دوستوں کا ایک حلقہ معرضِ وجود میں آجاتا ہے جو انسان کی توجہات کا مرکز و محور بن جاتا ہے۔ اپنے حلقے سے وابستہ ہونے میں انسان فخر محسوس کرتا ہے اور یہ چیز زندگی میں اتنی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ اس تعلق کو نبھانے میں بعض اوقات بڑے بڑے غلط کام بھی کر لیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بہت مرتبہ قتل کے واقعات میں دوستوں کا بھرپور تعاون شامل ہوتا ہے۔

(viii) دشمنی کا مرکز

بظاہر تو یہ بات بڑی عجیب دکھائی دیتی ہے کہ کوئی شخص دشمنی کے جذبے کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنا لے لیکن عملی طور پر اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی دشمن کو اپنے منفی جذبات و احساسات پر مبنی سوچوں کا مرکز و محور بنا لیتا ہے۔ یہ دشمن اُس کا کوئی سابقہ شراکت دار (Partner) بھی ہو سکتا ہے جس نے انسان کو دھوکہ دیا ہو یا نقصان پہنچایا ہو اور سابقہ جیون ساتھی بھی ہو سکتا ہے جس سے لڑائی جھگڑے کی بنا پر نوبت طلاق تک پہنچ گئی ہو اور اس کے علاوہ کوئی بھی ایسا فرد ہو سکتا ہے جس کے کسی غلط طرزِ عمل کی بنا پر انسان کو کوئی نقصان پہنچا ہو یا نفسیاتی دھچکا لگا ہو۔

دشمنی کو زندگی کا مرکز و محور بنا لینے کی صورت میں انسان ہر وقت اپنے دشمن کے رویے کے متعلق سوچ سوچ کر جلتا اور کڑھتا رہتا ہے اور اُس کے ذہن میں نفرت اور بعض اوقات انتقام کے جذبات بھی گردش کرتے رہتے ہیں۔ ایسا شخص ایک پُر اثر زندگی گزارنے کی بجائے اپنے دشمن کے رویوں اور باتوں پر ردِ عمل کا اظہار کرنے میں مصروف رہتا ہے اور ہر وقت اُسے ہی اپنی سوچوں پر سوار کیے رکھتا ہے۔ چنانچہ اُسے اندرونی تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔ اپنی قدر و قیمت کا احساس محض خیالی ہوتا ہے جس کا دار و مدار دوسرے کی جذباتی کیفیت اور رویے پر ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی رہنمائی اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ مخالف کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ اور اُس کی بصیرت کو بھی دشمنی کا مرکز محدود کر دیتا ہے۔ نیز ایسے فرد کے پاس کوئی

طاقت بھی نہیں ہوتی اور وہ دوسرے شخص کی کمزوریوں کو اس بات کی اجازت دے رہا ہوتا ہے کہ وہ اُس کی زندگی کے تمام نقشے کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیں۔

(ix) عبادت کا مرکز

عبادت انسان کے روحانی وجود کی بقا کے لیے ضروری ہے جس کے بغیر روح مردہ ہو جاتی ہے اور انسان چلتی پھرتی لاش بن جاتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کا تعلق مضبوط بنانے کے لیے بھی عبادت ناگزیر ہے۔ لیکن ہر چیز توازن، اعتدال اور میانہ روی کے دائرے میں ہی اچھی لگتی ہے۔ جب ایک شخص اعتدال کے دائرے سے باہر نکل کر صرف عبادت (یہاں عبادت سے مراد، عبادت کا وہ محدود تصور ہے جو ہمارے ہاں کم علمی کی بنا پر صرف نماز، روزے، حج، زکوٰۃ وغیرہ تک محدود کر لیا جاتا ہے) کو ہی زندگی کا مرکز و محور بنالے تو پھر دیگر انسانی ضروریات کے بارے میں اُس کے اندر حساسیت کا فقدان پیدا ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر حقوق النفس اور حقوق العباد نظر انداز ہونے لگتے ہیں۔ حضور ﷺ کے فرمان لا رهبانية فی الاسلام^(۳۷) (اسلام میں رهبانیت نہیں ہے) میں اسی رجحان کی ممانعت کی گئی ہے۔ نیز جب بعض صحابہ نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق عبادت شاقہ پر ساری زندگی کا بند رہنے کا عزم کر لیا تو آپ ﷺ نے سختی سے منع فرماتے ہوئے اعتدال والی روش کو اپنانے کا حکم دیا۔ عبادت کو اس طرح زندگی کا مرکز و محور بنا لینے سے زندگی عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے اور تحفظ، رہنمائی، بصیرت اور طاقت بھی ایک محدود دائرے میں سکر کر رہ جاتے ہیں۔

(x) خود مرکزیت

خود مرکزیت کا مطلب ہے اپنی ذات کو مرکز بنا لینا۔ اسی کا دوسرا نام خود غرضی ہے جس کی اسلام میں سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اپنے آپ کو مرکز بنا لینے سے انسان ذاتی مفادات کا اسیر بن کر رہ جاتا ہے وہ ہر معاملہ میں صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس میں مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ اُس کی اولین ترجیح اپنی ذات ہوتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ تعلقات اور معاملات میں اُسے صرف اور صرف اپنے مفادات سے غرض ہوتی ہے خواہ دوسروں کے نقصان کی قیمت پر ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے شخص کو اگر موقع ملے تو وہ اپنے معمولی فائدے کے حصول کے لیے ملک اور قوم کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچا دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہ خود غرضی، حرص اور لالچ انسان کو جامد، بے حس اور بے غیرت بنا دیتی ہے اور وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں سے تہی

دامن ہوتا جلد چلا جاتا ہے۔ نیز اُس کے پاس تحفظ، رہنمائی، بصیرت اور طاقت جیسے جواہر بھی نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر انسان اپنی ذاتی ترقی پر اس نیت سے توجہ دے کہ اس کے ذریعے سے خدمت اور نفع بخشی کی صلاحیت بڑھ جائے گی اور ماحول اور معاشرے کو زیادہ بہتر انداز میں فائدہ پہنچایا جاسکے گا تو یہ ایک نہایت اعلیٰ درجے کی خصلت ہوگی اور ایسی صورت میں زندگی کو تقویت دینے والے چاروں عناصر بھی ڈرامائی انداز میں بڑھ جاتے ہیں لیکن جب دوسروں کی نفی کی قیمت پر آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے تو یہ روش انسان کو انسانیت کے مرتبے سے گرا کر حیوانیت کے مرتبے سے بھی پست درجے میں لے جاتی ہے جہاں اُسے بحیرہ مردار (Dead sea) کی طرح دوسروں سے صرف لینا ہی آتا ہے اور دینا نہیں آتا۔ ایسا شخص ماحول اور معاشرے کی نظروں میں گرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنی نظروں میں بھی گرتا چلا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا مراکز کی فہرست حتمی نہیں ہے۔ اس میں چند اور ناموں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ اکثر و بیشتر لوگوں کی زندگیوں کا مرکز و محور مندرجہ بالا یا اسی طرح کی کچھ اور چیزیں بنی رہتی ہیں اور پھر انہی کی مناسبت سے اُن کی زندگیوں پر مختلف قسم کے اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی ایک ہی مرکز ساری زندگی برقرار رہے بلکہ وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں۔ بچپن کے زمانے کی ترجیحات کچھ اور ہوتی ہیں اور جوانی کے زمانے کی ترجیحات اور ہوتی ہیں جبکہ بڑھاپے کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک وقت میں کوئی ایک ہی چیز انسان کا مرکز توجہ بنی ہوئی ہو۔ ایک سے زیادہ چیزوں کا مجموعہ بھی زندگی کا مرکز و محور ہو سکتا ہے اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ تاہم اُس میں پھر ترجیحات کا اصول چلتا ہے۔ ایک وقت میں انسان کسی ایک چیز کو ترجیح اول بنائے ہوئے ہوتا ہے جب کہ دوسرے وقت میں کسی دوسری چیز کو۔ لیکن یہ بات بہر حال مسلمہ ہے کہ انسان کو علم ہو یا نہ ہو زندگی کی ہر شے پر کوئی نہ کوئی چیز انسان کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہوتی ہے اور اسی مناسبت سے اُس کی زندگی کی سرگرمیوں کا رخ متعین ہو رہا ہوتا ہے۔

عمومی مراکز کی خامیاں

مندرجہ بالا مراکز میں پائی جانے والی دو نمایاں خامیاں درج ذیل ہیں۔

(i) تغیر پذیری:

اکثر و بیشتر جن چیزوں کو انسان اپنی زندگی کا مرکز و محور بناتا ہے وہ تغیر پذیر ہوتی ہیں، فانی، عارضی اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔ اُن میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں (۳۸)

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی کو استحکام اور قرار نصیب نہیں ہو پاتا۔ زندگی ہر وقت حوادث کی زد میں رہتی ہے۔ تبدیلیوں کو برداشت کرنا اور اُن کا سامنا کرنا انسان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک کمزوری کا مداوا دوسری کمزوری سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کسی مستقل سمت کا احساس نہیں ہوتا۔ بصیرت قائم نہیں ہوتی اور طاقت کا کوئی باقاعدہ ذریعہ نہیں ہوتا۔ ذاتی اور اندرونی قدر و قیمت کا احساس اور تشخیص بھی کہیں کھو جاتے ہیں۔ شاخ نازک پر بننے والے آشیانے کا انجام اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟

(ii) محدودیت:

ان مراکز کی دوسری خامی ان کا محدود ہونا ہے۔ انسانی زندگی کثیر الجہات (Multi Dimensional) ہے۔ اس کے بہت سے پہلو اور گوشے ہیں اور اس میں طرح طرح کی بولقموئیاں پائی جاتی ہیں۔ مندرجہ بالا میں سے انسان جس بھی چیز کو مرکز بنائے گا وہ محدود ہوگی۔ کسی ایک ہی جانب حد سے زیادہ جھکاؤ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان عدم توازن پیدا کر دے گا جبکہ زندگی کا سارے کا سارا حسن اس بات میں ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں میں ایک خوبصورت توازن، تناسب اور ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ چنانچہ اس طرح زندگی محدودیت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ بھرپور، فعال، موثر، متحرک اور ہمہ جہت و ہمہ رنگ زندگی جو ایک مرد مومن کا طرہ امتیاز ہوا کرتی ہے اُسے گزارنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ اور انسان اپنے حقیقی مقام و مرتبے سے بہت نیچے آ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہا جاتا ہے۔ یہی کچھ لوگوں کی اکثریت کے ساتھ ہو رہا ہے۔

زندگی کا حقیقی نصب العین

انسانی زندگی کو اپنے استحکام اور مضبوطی کے لیے کسی ایسے مرکز کی ضرورت ہے جو ایک طرف اتنا

جامع اور ہمہ گیر ہو کہ زندگی کی جملہ جہتوں پر بھرپور انداز میں اثر انداز ہو سکتا ہو اور اُن میں توازن و ہم آہنگی کی ضمانت فراہم کرتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اتنا ٹھوس، پائیدار اور ناقابلِ تغیر ہو کہ زندگی کے نشیب و فراز میں انسان کو قائم اور برقرار رکھ سکتا ہو اور زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کو ایک مضبوط سہارا فراہم کر سکتا ہو۔ ایسا مرکز اس پوری کائنات میں صرف اور صرف ایک ہے اور اُس کا نام ہے۔

اللہ ﷻ

حضرت آدمؑ سے لے کر حضور ﷺ تک جتنے بھی انبیائے کرام آئے اُن پر جو بھی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے نیز اُن انبیائے کرام کی اپنی تعلیمات کا مرکزی نکتہ یہی رہا ہے کہ اللہ رب العزت کو زندگی کا مرکز اور نصب العین بنا لیا جائے۔ یہی وہ مرکز ہے جس کو پا کر زندگی سود و زیان کے اندیشوں سے بہت بلند ہو جاتی ہے اور حوادثِ زمانہ کے تھپیڑوں میں پہاڑوں اور چٹانوں کی مانند ثابت قدمی اور استقامت کا پیکر بن جاتی ہے۔

وہ کلمہ طیبہ جسے پڑھ کر ایک شخص دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے اُس کا پہلا حصہ لا الہ الا اللہ ہے جس کا ترجمہ عام طور پر ان الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ ”کوئی معبود نہیں ہے سوائے اللہ کے“ لیکن مولانا جعفر شاہ پھلواڑی کے بقول لفظ ”الہ“ کا ترجمہ ”معبود“ سے کرنا اس لفظ کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ انہوں نے دلائل و براہین کی روشنی میں بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس لفظ کا حقیقی ترجمہ ”نصب العین“ بنتا ہے۔ چنانچہ لا الہ الا اللہ کا معنی ہوگا۔ ”نہیں ہے کوئی نصب العین مگر اللہ“ (۳۹) یہی وہ معنی ہے جو زندگی کی جملہ جہتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ویسے بھی اہل تصوف کے بقول عوام کے نزدیک لا الہ الا اللہ کا ترجمہ ہے ”نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ“ لیکن خواص جب یہی کلمہ پڑھتے ہیں تو وہ اس کا مفہوم لیتے ہیں لا مطلوب الا اللہ ”نہیں ہے کوئی مطلوب سوائے اللہ کے“ اور اخص الخواص جب یہی کلمہ پڑھتے ہیں تو اُن کے ذہن میں یہ مفہوم ہوتا ہے لا موجود الا اللہ ”نہیں ہے کوئی موجود سوائے اللہ کے“ گویا عوام اس کلمہ کے ذریعے اللہ کے علاوہ کسی اور کے معبود ہونے کی نفی کرتے ہیں مگر خواص (اولیائے کرام) اسی کلمہ کے ذریعے اللہ کے علاوہ کسی اور ہستی کے مطلوب و مقصود ہونے کی نفی کرتے ہیں جب کہ اخص الخواص (کالمین و مقربین) اسی کلمہ کے ذریعے اللہ کے علاوہ ساری کائنات میں ہر

وجود کی نشی کر دیتے ہیں۔

آئیے اب قرآن مجید سے پوچھتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِذَا نُجِبُوا عَنْهُمْ كُحُبَ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ. (۳۰)

”اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو معبود بنا لیتے ہیں ان سے ویسی محبت کرتے ہیں جو اللہ سے کی جانی چاہیے اور جو ایمان والے ہیں وہ اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں۔“

یہاں افراد کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی جو زندگی کا مرکز اللہ کے علاوہ اوروں کو بنا لیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسری قسم ایمان والوں کی بیان کی گئی جن کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ اللہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کی زندگی کا مرکز و محور اللہ ہوا کرتا ہے۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ذُكِرْتُمْ فِيهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (۳۱)

”آپ ﷺ فرمادیں اگر تمہارے باپ (دادا) اور تمہارے بیٹے (بیٹاں) اور تمہارے بھائی (بہنیں) اور تمہاری بیویاں اور تمہارے (دیگر) رشتہ دار اور تمہارے اموال جو تم نے (محنت سے) کمائے اور تجارت و کاروبار جس کے نقصان سے تم ڈرتے رہتے ہو اور وہ دکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو، تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) نلے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں فرماتا۔“

اس آیت میں اہل ایمان کو تنبیہ (warning) کی گئی ہے کہ اگر انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں جدوجہد کرنے کے مقابلے میں کسی بھی اور رشتے ناٹے یا دنیوی متاع کو اپنا

مطلوب و محبوب بنالیا تو انہیں اللہ کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان کا شمار نافرمانوں میں کیا جائے گا۔

زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ
وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الدُّنْيَا وَاللَّهُ
عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۴۳)

”لوگوں کے لیے ان کی خواہشات کی محبت (خوب) آراستہ کر دی گئی ہے (جن میں) عورتیں اور اولاد اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان کیے ہوئے خوبصورت گھوڑے اور مویشی اور کھیتی (شامل ہیں)۔“

یہاں بھی اللہ کے علاوہ چند اور مراکز حیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بلاشبہ ان کی طرف رغبت و میلان انسانی فطرت کا حصہ ہے لیکن یہ چیزیں مرکز حیات بنائے جانے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ یہ بہر حال دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہی ہے اور دنیا خود دھوکے کا سامان ہے اس کے مقابلے میں جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ان سب سے بہت بہتر ہے۔ مطلب یہی ہے کہ ان میں سے کسی بھی چیز، تعلق یا رشتے ناطے کو زندگی کا مرکز و محور نہیں بنانا چاہیے۔ ان سب کے مقابلے میں اللہ کی ذات ہی اس قابل ہے کہ اُسے اپنی تمام محبتوں، رغبتوں، چاہتوں اور ارمانوں کا مرکز بنایا جائے۔ قرآن مجید نے اُمتِ مسلمہ کو ملتِ ابراہیمی دیتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کو بھی ہمارے لیے ایک نمونہ قرار دیا ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کے عقیدے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ
الْمُشْرِکِیْنَ (۴۳)

”بے شک میں نے اپنا چہرہ ہر طرف سے یکسو ہو کر اسی کی طرف پھیرا جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔“

مندرجہ بالا آیت میں حضرت ابراہیمؑ کتنے خوبصورت الفاظ میں اللہ کے سوا ہر غیر کی نفی کرتے ہوئے اپنے تمام تر خلوص اور وفاداریوں کا مرکز و محور فقط اللہ کی ذات کو بنا رہے ہیں۔ اس کو خدا رُحی زندگی کہتے ہیں کہ ہر غیر کی طرف سے توجہ ہٹا کر اللہ کو اپنی توجہات کا مرکز بنا لینا۔ اسی کی تعلیم حضور ﷺ کو دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۲۴﴾

”آپ فرمادیتے ہیں کہ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اُس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔“

مندرجہ بالا آیت میں نماز خالص بدنی عبادت ہے جب کہ قربانی میں بدنی اور مالی دونوں قسم کی عبادات شامل ہیں۔ اور حیات اور ممات کے دو الفاظ سے زندگی کی جملہ حرکات و سکنات مراد ہیں۔ یہ آیت کریمہ بندہ مومن کو زندگی کا جو نصب العین دے رہی ہے وہ یہی ہے کہ اُس کی زندگی کی تمام چھوٹی بڑی سرگرمیوں (خواہ وہ کسی بھی دائرہ میں ہوں اور کسی بھی نوعیت کی ہوں) کا مرکز و محور صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُس کی رضا اور خوشنودی کی طلب ہونی چاہیے۔ زندگی کے اسی نمونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا۔

من احب لله و ابغض لله و اعطى الله و منع الله فقد استكمل الايمان. (۲۵)

”جس نے اللہ کی خاطر ہی کسی سے محبت کی اور اللہ کی خاطر ہی کسی سے نفرت کی اور اللہ کی خاطر ہی کسی کو دیا اور اللہ کی خاطر ہی کسی کو نہ دیا تو اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔“

گویا جب محبت و نفرت اور دیگر معاملات کا پیمانہ فقط اللہ کی ذات بن جاتی ہے اور اس کے علاوہ ہر غرض، طلب، تمنا اور چاہت کی نشی ہو جاتی ہے تو ایمان اپنے نکتہ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور انسان ایمان کی حقیقی لذتوں اور کیف و سرور سے آشنا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کے بقول زندگی کی دو قسمیں ہیں:

ایک ہے ”لوجه الله“ اور دوسری ہے ”لوجه النفس“۔ (۲۶)

اول الذکر زندگی وہ ہے جس کا کھانا پینا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، ہنسنا رونا جیسا کہ جینا مرنا فقط اللہ کے لیے ہو جاتا ہے جب کہ مؤخر الذکر زندگی میں ان ساری چیزوں کا مرکز و محور نفس کی خواہشات ہوتی ہیں۔ اول الذکر زندگی ہی حقیقی معنوں میں مومنانہ زندگی ہے جب کہ مؤخر الذکر زندگی کافرانہ یا کفرانہ روش کے قریب ہے۔ گویا شیخ الاسلام کے نزدیک بندہ مومن کی زندگی کو فقط ”لوجه الله“ ہونا چاہیے۔ ہمارے عہد کے ایک اور دانشور پروفیسر احمد رفیق اختر (گوجر خاں والے) اس مقصد کے لیے جو اصطلاح

استعمال کرتے ہیں وہ ہے ”اللہ کو اپنی ترجیح اول بنا لینا“۔ (۴۷) اُن کے مطابق جب تک انسان اپنی ترجیحات کی فہرست میں سب سے پہلے درجے میں اللہ کو نہیں رکھتا تب تک وہ جو مرضی کرتا رہے اللہ کو نہیں پاسکتا۔ اللہ کو پانے کی بنیادی شرط ہی یہ ہے کہ اللہ انسان کی پہلی ترجیح بن جائے اور باقی ہر چیز اُس کے نیچے ہو۔ اس کا بھی دوسرے لفظوں میں مطلب یہی ہے کہ زندگی کا مرکز و محور اور نصب العین اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہونا چاہیے۔

مولانا رومؒ نے اسی بات کو اپنے شعر میں یوں بیان فرمایا۔

چست دنیا؟ از خدا غافل بدن

نے قماش و نقرہ و فرزند وزان (۴۸)

(دنیا کیا ہے؟ ہر وہ چیز جو بندے کو خدا سے غافل کر دے۔ ذریعہ معاش، سونا چاندی اور بیوی بچوں میں سے کوئی چیز بھی دنیا نہیں ہے۔)

قرآن و حدیث میں جا بجا دینا کی محبت کی مذمت کی گئی ہے۔ مولانا رومؒ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پہلے سوال اٹھایا کہ جس دنیا کی مذمت کی جاتی ہے وہ ہے کیا؟ پھر خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا کی یاد سے غافل کر دے اور اُس کی محبت و طلب انسان پر اتنی چھا جائے کہ اللہ کی طلب و تمنا پس پشت چلی جائے تو وہ دنیا ہے۔ دنیا کا مال و دولت اور بیوی بچوں میں سے کوئی چیز بھی بذات خود دنیا نہیں ہے، مگر ان میں سے جس چیز کو بھی انسان اپنی زندگی کا مرکز و محور بنالے گا اور وہ اللہ کی یاد اور اُس کی چاہت کو پس پشت کرنے کا ذریعہ بن جائے تو وہی دنیا ہے اور قابل مذمت ہے۔ اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنِّ مِنْ أَرْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُواهُمْ. (۴۹)

”اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور اولادوں میں بعض تمہاری دشمن ہیں پس اُن سے بچ کر رہو۔“

عارف رومیؒ کے مرید ہندی علامہ اقبالؒ نے مندرجہ بالا مفہوم کو اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا۔

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند

بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ (۵۰)

(دنیا کا مال و دولت اور رشتے ناٹے سب وہم و گماں کے بت ہیں۔ کائنات کے اندر اگر کوئی حقیقت ہے اور دل لگائے جانے کے قابل ہے تو وہ فقط اللہ کی ذات ہے) اس مفہوم کی تائید بھی خود قرآن مجید سے ہوتی ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (۵۱)

”جو کچھ زمین پر ہے وہ تباہ ہونے والا ہے اور تیرا عزت اور بزرگی والا رب باقی رہے گا۔“

مندرجہ بالا ساری گفتگو کا خلاصہ یہی ہے کہ اس کائنات میں فقط ایک ہی ہستی ہے جو انسانی زندگی کا مرکز و محور بن سکتی ہے اس کے علاوہ انسان جس بھی رشتے ناٹے یا چیز کو زندگی کا مرکز و محور بنائے گا وہ سوائے سراپوں اور فریبوں میں بھٹکنے کے اور کچھ بھی نہیں ہوگا اللہ رب العزت کی ذات کو زندگی کا نصب العین اور مطلوب و مقصود بنالینے کے جو بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں ان میں سے تین نمایاں ترین فوائد درج ذیل ہیں۔

حقیقی نصب العین کے فوائد

(i) ثبات و استحکام: (Stability)

اللہ رب العزت کو زندگی کا مرکز بنالینے کی صورت میں زندگی کو ثبات اور استحکام میسر آجاتا ہے جو کہ کسی بھی اور طرح نہیں آسکتا۔ جب یہ یقین انسان کے قلب و باطن میں اتر جاتا ہے کہ اُس نے اُس ہستی کو تھام رکھا ہے جو ساری کائنات کی خالق و مالک ہونے کے ساتھ ہر قسم کی قدرتوں، عظمتوں اور رفعتوں کی مالک ہے۔ نیز وہ اپنے بندوں کے ساتھ حد درجہ مہربان بھی ہے تو یہ یقین انسان کو سراپا اطمینان و سکون بنا دیتا ہے۔ اُس کے دل و دماغ سے ہر قسم کے ڈر، خوف، وہم، دوسے، منفی اور تخریبی خیالات اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جیسے سورج کے نکلنے پر رات کی تاریکی ختم ہو جایا کرتی ہے۔ نتیجہ زندگی انتشار و پرگندگی سے نجات پا جاتی ہے اور اُس میں یکسوئی، ثبات، استحکام اور قرار آجاتا ہے جو زندگی کی ترقی، ارتقاء اور عروج کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

(ii) لامحدودیت: (Unlimitedness)

اللہ رب العزت کی ذات لامحدود ہے اور ہر قسم کی حد بندیوں اور حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ اُس نے انسان کے اندر اپنی رُوح پھونک کر اور اُس کے سر پر اپنی خلافت و نیابت کا تاج سجا کر اُس کے

اندر بھی لامحدود امکانات کی ایک دنیا رکھ دی ہے۔ مگر ان امکانات کے عملی طور پر معرض وجود میں آنے کی شرط یہ ہے کہ انسان کا اپنے بنانے والے سے مضبوط رابطہ قائم ہو جائے۔ چنانچہ جب انسان اللہ رب العزت کی ذات کو اپنا منہج مقصود بنا لیتا ہے تو پھر اس کے پھیلنے اور ترقی کرنے کے امکانات بھی لامحدود ہو جاتے ہیں اور اُس کی فضیلتوں اور طاقتوں کا عالم یہ ہو جاتا ہے کہ حدیثِ قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اُس بندے کی سماعت، بصارت اور ہاتھ پاؤں بن جاتے ہیں یعنی اُس کے اعضاء میں خدائی طاقتیں جلوہ گر ہو جاتی ہیں جن سے وہ زمان و مکاں کی حدود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام نہیں جا بجا بندۂ مومن کی ان طاقتوں اور قدرتوں کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

ہفت کشور جس سے ہوں تخیر بے تیغ و تنگ

تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سماں بھی ہے (۵۲)

اسی طرح ایک اور مقام پر انسانی عظمتوں اور رفعتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

فرماتے ہیں۔

در دشت جنوں من جبریل زبوں صیدے

یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ (۵۳)

(میرے عشق کے جنوں کے جنگل میں جبریل جیسے عظیم الشان فرشتے کی حیثیت بھی ایک

شکار کی ہے۔ اے ہمت مردانہ! ایک قدم اور بڑھا تو خدا بھی کند میں آسکتا ہے۔)

یہاں دوسرے مصرعے میں جو بات کہی گئی وہ تقریباً وہی ہے جو مندرجہ ذیل حدیث میں بیان

ہوئی۔

من کان لله کان الله له. (۵۴)

”جو اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ اُس کا ہو جاتا ہے۔“

الغرض جب زندگی کا مرکز و محور اللہ رب العزت کو بنا لیا جاتا ہے تو پھر انسانی زندگی کے عروج

اور ارتقا کے لامحدود امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

(iii) توازن و ہم آہنگی (Balanceness):

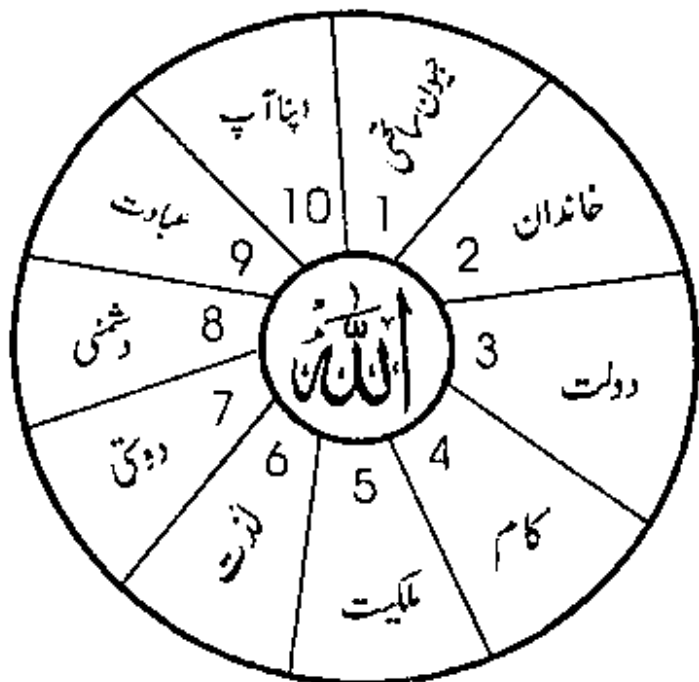
اللہ رب العزت کو مقصود حیات بنالینے سے جو تیسری عظیم الشان نعمت انسان کو میسر آ جاتی ہے وہ ہے زندگی کی تمام جہتوں میں توازن اور ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا۔ زندگی کا سارا حسن اور خوبصورتی اُس کے متوازن ہونے میں ہی ہے اور زندگی کے اندر مکمل توازن اللہ کو مرکز بنائے بغیر کسی بھی قیمت پر نہیں آ سکتا، عربی زبان میں ایک خوبصورت قول ہے۔

الحکیم الذی یضع الاشیاء مواضعها. (۵۵)

”عقل مند وہ ہے جو چیزوں کو اُن کے مقام پر رکھے۔“

چنانچہ کامیاب زندگی بھی وہی ہوتی ہے جس میں ہر چیز اپنے مقام پر ہو اور اُسے اتنی ہی اہمیت دی جا رہی ہو جتنی فی الواقع ہے۔ نہ اُس سے کم نہ زیادہ۔ لیکن ایک عام انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ کسی مرحلے میں وہ کسی ایک چیز کو زیادہ اہم سمجھ کر اُس کی طرف جھک جاتا ہے اور کبھی کسی دوسری چیز کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے اپنی توجہ کا رخ اُس طرف موڑ لیتا ہے۔ کبھی ایک مسئلے کو سر پر سوار کر لیتا ہے اور کبھی دوسرے کو۔ اس طرح زندگی عدم توازن اور افراط و تفریط کا شکار ہو کر اپنے حقیقی کمال کو پانے سے محروم رہ جاتی ہے۔ جو زندگی بے چاری خود ہی ڈانواں ڈول ہوگی وہ انسان کو کس منزل پر پہنچا سکے گی؟ لیکن جب زندگی کا مرکز و محور اللہ کو بنا لیا جاتا ہے اور باقی تمام سرگرمیاں اُس مرکز کے گرد گھوم رہی ہوتی ہیں۔ تو پھر زندگی کو صحیح معنوں میں توازن میسر آ جاتا ہے اور ہر چیز عین اُسی مقام پر ہوتی ہے جس پر اُسے ہونا چاہیے۔ نہ تو کسی بھی چیز کو اُس کی حیثیت سے زیادہ اہمیت دے کر سر پر سوار کر لیا جاتا ہے اور نہ ہی کسی چیز کو خواہ مخواہ کم اہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اس صورت میں زندگی کا نقشہ کچھ یوں بنتا ہے۔



مندرجہ بالا نقشے میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ جب زندگی کا مرکز و محور اللہ بن جاتا ہے تو پھر باقی ہر چیز کی قدر و قیمت اسی کی نسبت سے متعین ہوگی۔ اللہ کو اپنا مقصود بنا لینے والا کوئی بھی شخص دوسری کسی بھی چیز کو وہی مقام دے گا جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے متعین کیا ہوگا۔ وہ کسی بھی چیز کو اُس کے حقیقی مقام و مرتبے سے زیادہ یا کم اہمیت دینے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں اُسے یہ اندیشہ ہوگا کہ اُس کے نصب العین (اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اُس کے قرب کا حصول) کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نیز دنیا کے تمام رشتوں، ناطوں، تعلقات اور تمام سرگرمیوں کی بنیاد میں اُس کی خواہش صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت اور اُس کی خوشنودی ہی ہوگی۔ اس کے علاوہ کوئی اور غرض و غایت نہیں ہوگی۔ یہی ایمان کا کمال، بندگی کی روح اور اخلاص کی جان ہے۔ یہیں سے دین، دنیا اور آخرت کی تملہ کامیابیوں، کامرانیوں اور سعادتوں کے حصول کا آغاز ہوتا ہے۔

تمام انبیائے کرام جو وقتاً فوقتاً مخلوق کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے جاتے رہے اُن سب کی تعلیمات کا بنیادی نقطہ یہی تھا کہ انسان ہر چیز کی نشی کرتے ہوئے ایک اللہ سے بڑ جائے اور پھر اللہ کی نسبت سے دیگر تعلقات استوار ہوں۔ اور وہ اللہ کی محبت اور عبادت میں اخلاص اور لٹھیت کے اُس مقام تک چلا جائے کہ زندگی سرت سے لے کر پاؤں تک بندگی کی چلتی پھرتی نمکی تصویر بن جائے۔ حتیٰ کہ انسان کے ہمد اعمال و انحال اور حرکات و سکنات میں سے ذاتی اغراض و مقاصد، نفس کی خواہشات و داعیات اور لوگوں کی رضا و خوشنودی جیسی تمام چیزیں نکل جائیں اور ہر کام کا مقصد فقط اللہ کی ذات بن جائے۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں کہی گئی۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (۵۶)

”اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔“

کسی بھی معاشرے میں اصلاح احوال کا جو بہترین نکتہ آغاز ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ سب سے پہلے افراد معاشرہ کے اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق بندگی کو رسی دائرہ سے نکال کر ایک حقیقی، پائیدار، مضبوط و مؤثر اور زندہ و جاوید تعلق میں تبدیل کیا جائے کہ اللہ انسان کے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہو جائے، اُس کی سانسوں میں سما جائے اور اُس کی اُمیدوں و اندیشوں کا مرکز و محور بن جائے۔ یہی پیغمبرانہ مشہاج بھی ہے۔ اس نکتے کو نظر انداز کرتے ہوئے بیزاری شعور اور اصلاح معاشرہ کی جو کوششیں بھی ہوں گی اُن سے حوصلہ افزاء نتائج کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔

جس طرح ایک درخت کے پھلنے پھولنے اور تروتازہ رہنے کے لیے لازم ہے کہ اُس کی جڑ سلامت رہے اسی طرح کسی بھی انسان کی سیرت و کردار کی اصلاح اور تعمیر و ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا اللہ کے ساتھ مضبوط اور پائیدار تعلق قائم ہوتا کہ اُس کی روح الوہی فیضان کو اپنے اندر جذب کر کے اُسے شخصیت کے ارتقاء اور نشوونما میں استعمال کرتی رہے۔ اور اپنے کمال کی منزلوں کو طے کرتی رہے لہذا اللہ کو زندگی کا مرکز و محور بنالینا زندگی میں حقیقی کامیابی اور کامرانی کی اولین شرط ہے۔

نصب العین کے حصول کا طریقہ

نصب العین کے تعین کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نصب العین کو حاصل کیسے کیا جائے۔ اس کا طریقہ کار اللہ رب العزت نے قرآن مجید کی اس آیت میں بتایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۷)

”اور انہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں“

تفسیر روح المعانی میں لفظ ”لیعبدون“ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

ای ليعرفون. (۵۸) ”یعنی میری معرفت حاصل کریں۔“

گویا تخلیق انسانی کا مقصد اللہ رب العزت کی معرفت حاصل کرنا اور اس کے ذریعے سے اس کی بارگاہ تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معرفت کی بجائے عبادت کا لفظ کیوں

استعمال کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنی معرفت کو پانے کا ذریعہ عبادت ہی کو بنایا ہے اور معرفت کا دعویٰ فقط وہی قابل قبول ہوگا جو عبادت کی راہ سے ہو۔ اس سے ہٹ کر کوئی معرفت کا دعویٰ کرے تو وہ ناقابل قبول ہوگا۔

عبادت کا جامع مفہوم

اب یہ سمجھنا ہوگا کہ عبادت کا وہ جامع مفہوم کون سا ہے؟ جس کے اندر زندگی کی جملہ حرکات و سکنات آجائیں اور جسے اپنا کر نصب العین تک پہنچا جاسکتا ہے۔ یہ جامع مفہوم مندرجہ ذیل تین اجزاء پر مشتمل ہے۔

(i) براہ راست عبادت

اس میں وہ تمام مخصوص عبادات شامل ہیں جو تمام مسلمانوں پر بشرط استطاعت فرض قرار دی گئی ہیں مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ایسی عبادتیں ہیں جو بذات خود عبادت کا درجہ رکھتی ہیں۔

(ii) بالواسطہ عبادت

اس میں وہ تمام اعمال و معمولات اور حرکات و سکنات شامل ہیں جو بذات خود تو عبادت نہیں ہوتی ہیں لیکن شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کی نیت سے انہیں بجالانا عبادت بن جاتا ہے۔ مثلاً کھانا، پینا، سونا، جاگنا، کاروبار کرنا اور دیگر سماجی ذمہ داریاں سرانجام دینا وغیرہ۔ یہ تمام کام فی نفسہ تو عبادت نہیں ہیں کہ دنیا کا ہر شخص مختلف وجوہات کی بناء پر ان کو کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن اگر انہیں شریعت کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق اللہ رب العزت کی رضا اور خوشنودی کے لیے سرانجام دیا جائے تو یہ عین عبادت بن جاتے ہیں اور اس طرح عبادت کا مفہوم چند مخصوص اعمال کے دائرے سے نکل کر زندگی کے جملہ معاملات تک پھیل جاتا ہے۔

(iii) مخصوص صلاحیت کا تحفظ

عبادت کی پہلی دو قسمیں عام تھیں لیکن عبادت کی یہ تیسری قسم ہر شخص کے لیے الگ مفہوم رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے کوئی خاص صلاحیت رکھی ہوئی ہے جس میں وہ دوسروں سے منفرد ہے۔ یعنی کوئی خاص کام وہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر طریقے سے سرانجام دے

سکتا ہے۔ اُس خاص صلاحیت کو دریافت کرنا، اُسکا تحفظ کرنا، اُسے پروان چڑھانا اور ماحول اور معاشرے کی بہتری میں اُسے استعمال کرنا یہ سب کچھ بھی عین عبادت ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے ہو۔ جس طرح کروڑوں انسانوں میں سے کوئی سے دو افراد کی شکلیں ہو بہو ایک جیسی نہیں ہیں بلکہ انگوٹھے کا پرنٹ ایک جیسا نہیں ہے اسی طرح ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی ایسا وصف ہوتا ہے جس میں وہ دوسروں سے منفرد ہوتا ہے۔ بقول واصف علی واصف

”ایک انسان کو زندگی میں با اعتماد ہونے کے لیے یہ حقیقت ہی کافی ہے کہ اُس سے پہلے نہ تو کوئی اُس جیسا انسان دنیا میں آیا نہ اُس کے بعد ہی کوئی اُس جیسا آئے گا۔ یہ عظیم انفرادیت بہت بڑا نصیب ہے۔“ (۵۹)

حضرت واصف علی واصف کا ہی ایک دوسرا قول ہے:

”وہ جو بھیجنے والا ہے اگر شاہین کو قوت اور شوق پرواز عطا کرے اور شاہین عبادت کرتا رہے اور پرواز نہ کرے تو پھر عبادت غلط ہوگئی لہذا عبادت کا اصل یہ ہے کہ اُس صلاحیت کا بھی تحفظ کر جو تجھے باقیوں سے الگ ملی ہے۔“ (۶۰)

یہ بات انہوں نے عبادت کے مفہوم کے حوالے سے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح شاہین کو پرواز کی قوت دی گئی ہے اور وہ استعمال میں لانے کے لیے ہی دی گئی ہے، اسی طرح قدرت نے ہر انسان میں جو مخصوص صلاحیت رکھی ہوئی ہیں اُسے دریافت کرنا اور استعمال میں لانا ہی معراج انسانیت ہے۔ لہذا انسان کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنی مخصوص صلاحیت کو دریافت کرے اور اُس میں زیادہ سے زیادہ کمال حاصل کرے اور اُس کے ذریعے سے ماحول اور معاشرے کی خدمت کرے۔

انسانی تاریخ کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہر دور میں لوگوں کی اکثریت زندگی اس حال میں گزار رہی ہوتی ہے کہ انہیں پتہ تک نہیں چلتا کہ اُن کے اندر وہ خاص صلاحیت کونسی تھی جو قدرت نے رکھی ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی اور میدان (Field) کا ذوق رکھنے والا ہوتا ہے لیکن وہ کام کسی اور فیلڈ میں کر رہا ہوتا ہے۔ ایسا انسان کبھی اپنی صلاحیتوں کو پھر پور طریقے سے استعمال نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنے شعبے سے انصاف کر سکتا ہے اور نہ ہی اُس شعبے میں چوٹی (Top) پر پہنچ سکتا ہے

چنانچہ تیسرے درجے کی معمولی سی زندگی گزار کر چلا جاتا ہے۔ جتنے بھی لوگ کسی شعبے میں کامیابی کے اعلیٰ ترین درجے پر پہنچے وہ وہی تھے جن کو حسن اتفاق سے یا اُن کی شعوری کوشش سے وہ شعبہ مل گیا جو اُن کے فطری رجحان کے مطابق تھا۔ چنانچہ انہیں اپنے کام کے ساتھ عشق تھا۔ لہذا اُن کے لیے وہ کام محض کام نہ رہا بلکہ اُن کا دل پسند مشغلہ (Favourite hobby) بن گیا۔

ہمارے ہاں طالب علموں کی اکثریت بے چاری کو پتہ نہیں ہوتا کہ کون سا شعبہ اُن کے مناسب حال ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ والدین یا کسی اور کے کہنے پر یا معاشرتی رجحان (Social Trend) کو دیکھتے ہوئے یا پھر یہ دیکھ کر کہ فلاں شعبے میں خوب کمائی ہے، شعبے کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ اُسکے بعد پھر یہی ہوتا ہے کہ اپنے کام کے ساتھ حقیقی دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے وہ توجہ نہیں دے پاتے جو اعلیٰ درجے کی کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ انہیں اوسط درجے کی کامیابی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے اور نتیجہً انہیں خوشی اور مسرت کا اونچا درجہ حاصل نہیں ہو پاتا۔

بعض ماہرین نفسیات کا تو کہنا ہے کہ ہر انسان کے اندر تین تا پانچ فطری صلاحیتیں ہوتی ہیں اور بعض افراد میں سات تک ہوتی ہیں۔ اگر ایسا ہی ہو تو پھر تو کام اور آسان ہو جاتا ہے کیونکہ اگر انسان ایک کو دریافت نہ کر سکے تو کوئی دوسری یا تیسری سامنے آجائے گی۔ تاہم کم از کم ایک صلاحیت تو بہر حال ہر انسان کے اندر موجود ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اُس خاص صلاحیت کا پتہ کیسے چلایا جائے؟ اُسے کیسے دریافت کیا جائے؟ کیونکہ جب تک وہ صلاحیت انسان پر آشکار نہیں ہوتی تو اس کے لیے اسے شعوری طور پر بھرپور طریقے سے استعمال میں لانا ناممکن ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ نے بڑا شاندار اصول دیا جو اس معاملے کی چابی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ساری دنیا کے ماہرین نفسیات بھی اس پر متفق ہیں اور وہ یہ ہے۔

كُلُّ مُيَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ. (۶۱)

”ہر شخص جس کام کے لیے پیدا ہوا، وہ اُس کے لیے آسان کر دیا گیا ہے۔“

لہذا انسان اپنے من کی دنیا میں جھانک کر دیکھے اور بنظرِ غائر جائزہ لے کہ وہ کون سا کام ہے جسے وہ دلچسپی اور رغبت سے کرتا ہے اور جس میں مشغول ہو کر اُسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے اپنے گزشتہ حالات اور واقعات کا جائزہ لینا چاہیے۔ اپنی سابقہ کامیابیوں اور ناکامیوں کے

اسباب پر غور کرنا چاہیے۔ نیز اپنے مزاج اور رجحان پر باریک بینی سے غور کرنا چاہیے کہ طبیعت کا رجحان اور میلان کس سمت میں پایا جاتا ہے۔ انسان اگر کوشش کرے تو بالآخر وہ اپنی مخصوص صلاحیت کو دریافت کر سکتا ہے اور ایک دفعہ یہ چابی ہاتھ آجائے تو پھر انسان ترقی کی اعلیٰ منازل طے کر کے دنیا و آخرت کی سعادتیں حاصل کر سکتا ہے کیونکہ فطری صلاحیتیں کامیابی کی کنجی ہیں۔ دنیا میں اُس سے بڑھ کر خوش قسمت شخص کون ہو سکتا ہے جس کا پیشہ ہی اُس کا محبوب مشغلہ (Favourite Hobby) بن جائے۔

اقدار حیات کا تعین

نصب العین کا تعین اور اُس کے حصول کا لائحہ عمل طے کر لینے کے بعد ہمارے پاس زاویراہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ بالفاظِ دیگر ہمارے لیے صرف منزل کے متعلق جان لینا اور اُس کی طرف جانے والے راستہ سے آگاہ ہو جانا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ ایسے اسباب اور وسائل بھی ہونے چاہئیں جن کے ذریعے خوش اسلوبی سے مسافت کو طے کیا جاسکے۔ ہمیں جان لینا چاہیے کہ زندگی کا سفر ہموار راستوں کا سفر نہیں ہے بلکہ اس سفر میں بہت سارے نشیب و فراز ہیں اور کئی قسم کی کھائیاں، گھائیاں اور ڈھلوانیں ہیں جہاں پھسلنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ کہیں ٹیڑھے میٹرھے راستوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ جہاں بھٹکنے کی صورت میں انسان منزل کے قریب ہونے کی بجائے منزل سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر نفس امارہ اور شیطان کی صورت میں دو دشمن ہیں جو ہر لمحہ اُس کی منزل کو کھوٹا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

لہذا نصب العین اور اُس کے حصول کا لائحہ عمل طے کر لینے کے بعد کامیابی کے ساتھ اُس پر عمل پیرا ہونے کے لیے انسانی زندگی میں کچھ طے شدہ اصولوں اور سوچی سمجھی قدروں کا ہونا ضروری ہے جن کی صداقت و حقانیت پر اُس کا دل و جان سے ایمان ہو اور روزمرہ زندگی کے جملہ معاملات میں وہ درست راستے کی طرف اُس کی رہنمائی کر سکیں۔ تاکہ اُس کا ہر گزرنے والا لمحہ اُسے منزل کی طرف لے جانے کا باعث بن رہا ہو نہ کہ منزل سے دور ہٹانے کا۔ سطورِ بالا میں انہی اصولوں یا اقدار کو زاویراہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ ایک بندۂ مومن کے لیے اس معاملے میں قرآن و حدیث ہی وہ سرچشمہ ہائے حیات ہیں کہ جن پر وہ آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتا ہے۔ اور اسلام کی جملہ تعلیمات کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لیے ایسے رہنما اصول دے دیے جائیں جو اُس کی دنیوی زندگی کو

خوشگوار بنانے کے ساتھ ساتھ اُسے آخری سعادتوں سے بھی مالا مال کر دیں۔ لیکن قرآن و حدیث کی تعلیمات بے شمار ہیں جن کو ہر وقت ذہن میں تر و تازہ رکھنا اور اُن کے مطابق عمل کی جہتوں کو متعین کرنا ایک عام آدمی کے لیے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لہذا بہت ضروری ہے کہ انسانی زندگی میں چند ایک طے شدہ اصول یا اقدار ایسی ہوں جنہیں ہر وقت یاد رکھنا اور عمل میں لانا آسان ہو۔ نیز وہ اتنے جامع ہوں کہ زندگی کے اُلجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے اور عمل کے زاویوں کو درست کرنے میں قدم بقدم انسان کی رہنمائی کر سکیں۔

چار جامع احادیث

امام ابو داؤد (مؤلف سنن ابو داؤد) فرماتے ہیں کہ ”سنن ابو داؤد میں چار حدیثیں ایسی ہیں جو ایک بندہ مومن کے لیے اُس کے دین کے معاملے میں کافی ہیں“۔ (۶۲)

دوسری طرف امام اعظم، امام ابو حنیفہ نے اپنے بیٹے حماد سے فرمایا کہ ”میں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے تمہارے لیے پانچ حدیثوں کو منتخب کیا ہے اگر تم ان پانچ حدیثوں پر عمل کر لو گے تو گویا پورے دین پر عمل ہو جائے گا۔“ (۶۳)

ان پانچ حدیثوں میں سے بھی چار وہی ہیں جو امام ابو داؤد نے بیان فرمائی ہیں۔ اور جہاں تک پانچویں کا تعلق ہے تو اُس پر بھی اُن چار کے ضمن میں ہی عمل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اُسے الگ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے لہذا ان چار حدیثوں کو اگر دل و دماغ کی سختی پر نقش کر لیا جائے اور شب و روز کے جملہ اعمال و افعال اور حرکات و سکنات میں ان کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو حیاتِ انسانی کا ایک ایک لمحہ عبادت بن سکتا ہے اور دنیا اور آخرت کی دونوں زندگیوں میں کامیابی و کامرانی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ چار حدیثیں ہر شخص کے لیے خواہ وہ کسی بھی ملک میں ہو اور کسی بھی شعبے میں ہو، اقدارِ حیات کا کام دے سکتی ہیں اور مومنانہ زندگی کی تصویر کو مکمل کرتی ہیں۔ یہ چار حدیثیں ذیل میں مختصر تشریح کے ساتھ درج کی جا رہی ہیں۔

پہلی حدیث

إنما الأعمال بالنیات (۶۴)

”اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔“

یہ حدیث مبارکہ بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز اس حدیث سے کیا۔ وجہ یہی تھی کہ جب اعمال کا دار و مدار ہی نیت پر ہے تو نیت کا ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر نیت ٹھیک نہیں ہوگی تو عمل بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ بعض اہل علم نے اسے تہائی دین، بعض نے نصف دین اور بعض نے اسی کو کل دین قرار دیا ہے۔

انسان کے ہر چھوٹے بڑے عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی ارادہ کار فرما ہوتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل کو محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے سرانجام دے نہ کہ کسی بھی اور غرض و غایت سے۔ اسے کہتے ہیں نیت کا اللہ کے لیے خالص ہو جانا۔ نیت جب اللہ کے لیے خالص ہو جاتی ہے تو پھر انسان کا تھوڑا عمل بھی اللہ رب العزت کی بارگاہ میں شرف قبولیت پالیتا ہے اور اُس پر زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب مل جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر رخصت کرتے وقت جو نصیحتیں فرمائیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی۔

اخْلَصْ دِينَكَ يَكْفِكَ الْعَمَلُ الْقَلِيلَ (۶۵)

”اپنے دین کو خالص کر لے (یعنی ہر کام کا مقصود و مطلوب اللہ کی رضا کو بنالے) پھر تیرا تھوڑا عمل بھی کفایت کرے گا۔“

یوں سمجھ لیں کہ نیت کا حسن رائی کے برابر عمل کے اجر و ثواب کو پہاڑوں کے برابر کر سکتا ہے اور نیت کی خرابی پہاڑوں جیسے عمل کے اجر و ثواب کو رائی کے دانے کی سطح پر لا سکتی ہے۔ عوام اور خواص (اولیاء و مقربین) میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر لوگ عمل کی مقدار پر زیادہ زور دیتے ہیں جب کہ موخر الذکر لوگ مقدار سے کہیں زیادہ زور عمل کے معیار (اخلاص اور حسن نیت سے عمل بجالانے) پر دیتے ہیں۔

نیت کا عمل دخل فقط اتنا ہی نہیں کہ یہ عمل نئے اجر و ثواب میں کمی بیشی کا باعث بنتی ہے۔ بلکہ اچھی نیت خالص دنیا داری کے کام کو بھی عین عبادت بنا دیتی ہے جیسے کہ حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق جہاد کی نیت سے گھوڑا پالنے والے کا اُس گھوڑے کا گوبر اٹھانا بھی اللہ کی بارگاہ میں باعثِ اجر و ثواب ہے۔ اس کے برعکس نیت کی خرابی عین دین داری کے کام کو بھی دنیا داری بنا کر نہ صرف اجر و ثواب سے

محرّم کر دیتی ہے بلکہ اُلٹا عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے (العیاذ باللہ) چنانچہ قرآن مجید نے نماز میں ریا کاری کرنے والوں کو تباہی و بربادی کی وعید سنائی ہے۔ اور ایک مشہور حدیث کے مطابق قیامت والے دن ایک شہید، ایک عالم اور ایک سخی کو محض اس بنا پر جہنم میں بھیج دیا جائے گا کہ ان لوگوں نے اپنے اعمال میں اللہ کی بجائے مخلوق کو خوش کرنے کی نیت کی تھی۔

ہر عمل کی ایک ظاہری ہیئت (شکل و صورت) ہوتی ہے اور ایک اُس میں شامل باطنی نیت۔ کسی بھی عمل کے باعث اجر و ثواب بننے کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ ان دونوں میں موافقت پائی جا رہی ہو۔ اگر کسی عمل کی ظاہری شکل تو پائی جا رہی ہو لیکن باطنی نیت موجود نہ ہو تو اُس پر ثواب نہیں ملے گا۔ مثلاً

۱۔ اگر ایک آدمی اپنا وزن کم کرنے کے لیے سارا دن کچھ کھاتا پیتا نہیں ہے اور نہ ہی بیوی کے قریب جاتا ہے تو اُس بندے کو روزہ دار نہیں کہیں گے گو اُس نے ظاہری طور پر روزے کے ارکان پورے کر دیئے۔ چنانچہ اُسے اجر و ثواب بھی نہیں ملے گا۔ مگر یہی کام جب وہ روزے کی نیت سے کرتا ہے تو یہ اعلیٰ درجے کی عبادت بن جاتا ہے۔

۲۔ اگر ایک آدمی کو کسی نے تالاب میں دھکا دے دیا اور اُس کے سارے اعضائے وضو دھل بھی گئے تو امام شافعیؒ کے نزدیک تو اُس کا وضو ہوگا ہی نہیں کیونکہ اُس نے وضو کی نیت نہیں کی تھی۔ البتہ امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کے بقول وضو اُس کا ہو جائے گا اور وہ نماز پڑھ سکتا ہے لیکن اُسے وضو کا ثواب نہیں ملے گا کیونکہ اُس نے وضو کی نیت نہیں کی تھی۔

نیت کی تین صورتیں

نیت کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ حسن نیت سے عمل کرنا ۲۔ نیت بد سے عمل کرنا ۳۔

بغیر نیت کے عمل کرنا

پہلی دو صورتیں تو واضح ہیں۔ تیسری صورت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کوئی عمل کر رہا ہو اور اُس میں کوئی خاص نیت (اچھی یا بری) شامل ہی نہ ہو۔ اہل علم کا کہنا ہے کہ اس اُمت کو نیت بد کے ساتھ عمل کرنے سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا نقصان بغیر نیت کے عمل کرنے سے پہنچا ہے۔ ہم اگر اپنے شب و

روز پر غور کریں تو ہمیں صاف دکھائی دے گا کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں بہت سے کام بغیر نیت کے کرتے ہیں اگر انہی کاموں میں اللہ کی رضا کی نیت سے کیا جائے تو وہ ثواب بن جاتے ہیں مثلاً

۱- ہر وہ بندہ جس کے ماں باپ زندہ ہیں وہ ہر دن میں درجنوں مرتبہ ماں باپ کے چہرے کو دیکھتا ہے لیکن اسی دیکھنے میں اگر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی نیت کر لی جاتے تو حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق ہر مرتبہ دیکھنے میں ایک حج مقبول کا ثواب ملتا ہے چاہے ایک دن میں سو مرتبہ دیکھے۔ (۶۶)

۲- ہر خاوند بیوی کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور ہر بیوی خاوند کو دیکھ کر مسکراتی ہے مگر اس مسکرانے میں خواہش کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ شریعت نے کہا کہ جب کوئی خاوند بیوی کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور بیوی خاوند کو دیکھ کر مسکراتی ہے تو اللہ رب العزت ان دونوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال تو تب ہی بنے گی جب دونوں کے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت شامل ہوگی۔ (۶۷)

۳- رات کو سوتے وقت عام طور پر لوگ لباس تبدیل کرتے ہیں مگر یہ کام بالعموم اپنی خواہش اور سہولت کے تحت ہوتا ہے یہی کام اگر حضور ﷺ کی سنت سمجھ کر کیا جائے تو عبادت بن جاتا ہے۔ گویا یہاں عادت ہے مگر عبادت نہیں ہے۔ حسن نیت کے ساتھ اس عادت کو عبادت بنایا جاسکتا ہے۔ (۶۸)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر ہم مذکورہ بالا حدیث کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دن رات کی وہ تمام وہ سرگرمیاں جو حدود شرع میں رہتے ہوئے سرانجام دیتے ہیں (خواہ وہ دینی ہوں یا بظاہر دنیوی) ان میں اپنی نیت کو درست کر لیں تو وہ سب کی سب عبادت بن سکتی ہیں اور ہم چوبیس گھنٹے کے عبادت گزار بن سکتے ہیں۔ گویا ہمارا کھانا، پینا، پہننا، سونا، جاگنا، ہنسنا، رونا، کاروبار کرنا، بیوی بچوں کی پرورش کرنا اور دیگر تمام سماجی کام سرانجام دینا حتیٰ کہ جینا مرنا سب کچھ عبادت بن سکتے ہیں اور یہی ایک بندہ مومن کا مقصد حیات اور منتہائے کمال ہے۔

دوسری حدیث

(۶۹) من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ۔

”آدمی کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ لایعنی کو ترک کر دے۔“

لایعنی سے مراد ہر وہ کلام اور کام ہے جو فضول اور بے مقصد ہو۔ جس کا کوئی بھی فائدہ نہ تو دنیوی زندگی کے حوالے سے ہو اور نہ ہی اخروی زندگی کے حوالے سے۔ ایسے کاموں میں مشغول ہونے کا مطلب اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے اور وقت کو ضائع کرنا درحقیقت اپنی زندگی کو بلکہ خود اپنے آپ کو ضائع کرنا ہے جس کا ایک بندہ مومن متحمل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن مجید نے کامیاب مومنوں کی علامات میں سے ایک علامت یہ بتائی ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ﴿۷۰﴾

”اور وہ لوگ لغو (فضول اور بے ہودہ باتوں) سے اجتناب کرتے ہیں۔“

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ﴿۷۱﴾

”اور جب وہ لغو کے قریب سے گزرتے ہیں تو باوقار طریقے سے گزر جاتے ہیں۔“

دنیا کی زندگی میں انسان کے پاس سب سے قیمتی دولت وقت ہی ہے جتنی زیادہ اس کی قدر کی جائے گی اتنا ہی زیادہ انسان کامیاب ہوگا اور جتنا اسے ضائع کیا جائے گا اتنا ہی ناکام و نامراد ہوگا۔

زندگی محدود ہے اور کام بے شمار ہیں۔ ایسی حالت میں یہ بہت ضروری ہے کہ انسان اپنے وقت کے ایک ایک لمحے کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے۔ فضول اور بے کار کاموں سے بچتے ہوئے اسے ضروری اور کارآمد کاموں میں استعمال کرے۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ وقت سے کام لینے والے اس تھوڑی سی زندگی میں موجب بن گئے، فلاسفر بن گئے، بزرگ اور ولی بن گئے، غرض دین و دنیا کے مالک بن گئے۔ لیکن جن لوگوں نے وقت کو بے کار ضائع کیا وہ محرومیوں، مایوسیوں، ناکامیوں، اور نامرادیوں کا شکار ہو کر رہ گئے اور تیسری درجے کی انتہائی حقیر اور کیڑوں مکوڑوں والی زندگی گزار کر بالآخر گنہگار کے قبرستان میں دفن ہو گئے۔

آج ہماری بہت ساری پریشانیوں اور بد حالیوں کا سبب وقت جیسی انتہائی قیمتی دولت کو بڑی بے دردی سے ضائع کرنا ہے۔ لوگوں کی اکثریت ہر روز اپنا بہت سارا وقت فضول اور بے فائدہ

کاموں مثلاً ٹی وی، ڈراموں، فلموں، کھیل تماشوں وغیرہ جیسی خرافات و واہیات میں ضائع کرتی چلی جاتی ہے جس کی وجہ سے ایک طرف تو مفید، بامقصد اور ضروری کاموں کو کرنے کی صلاحیت زنگ آلودہ ہوتی چلی جاتی ہے اور دوسری طرف ان کاموں کے لیے وقت بھی بہت کم بچتا ہے۔ نتیجہ زندگی مجرمیوں کا شکار ہو کر کانتوں کا بچھونا بنتی چلی جاتی ہے۔ لہذا دنیا و آخرت کی سرفرازیوں کو حاصل کرنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم وقت کی قدر کرنا سیکھیں۔ مذکورہ بالا حدیث کی روشنی میں فضول اور بے فائدہ کاموں سے اپنے اوقات کو بچاتے ہوئے حتی الوسع مفید اور کارآمد کاموں میں استعمال کرتے ہوئے حیات دنیوی کے ہر لمحے کو قیمتی بنائیں۔

تیسری حدیث

الحلال بین والحرام بین و بینہما مشبہات لا یعلمہا کثیر من الناس فمن اتقی المشبہات استبرأ لدينہ و عرضہ. (۷۲)

”حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور دونوں کے درمیان کچھ شبہ میں ڈالنے والی چیزیں ہیں۔ پس جس نے اپنے آپ کو ان سے بچا لیا اُس نے اپنے دین اور عزت کی حفاظت کر لی۔“

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ و خیرات، سچ بولنا، وعدہ پورا کرنا، امانت کی حفاظت کرنا وغیرہ وغیرہ جیسی چیزیں واضح طور پر حلال ہیں جن پر ہمیں کار بند ہونا ہے۔ اس کے برعکس جھوٹ، چغلی، غیبت، چوری، ڈاک، سود، زنا، خیانت اور شراب نوشی وغیرہ جیسے بہت سارے کام ہیں جن کا حرام اور ناجائز ہونا ہمارے اوپر واضح ہوتا ہے اور اُن سے بچنا ہے۔ لیکن انسانی زندگی میں قدم قدم پر ایسے مواقع آتے ہیں جہاں ایک کام کا حلال یا حرام ہونا ہمارے اوپر واضح نہیں ہوتا اور ہمیں پتہ نہیں چل رہا ہوتا کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔ اُس کے حوالے سے ذہن بزدل اور انتشار کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ دل اور دماغ کے درمیان یا عقل اور ضمیر کے درمیان ایک جنگ سی شروع ہو جاتی ہے۔ ہمارے نفس کی خواہش، طبیعت کا تقاضا یا کوئی اور مصلحت ہمیں اُس کام کے کرنے پر آمادہ کر رہی ہوتی ہے جبکہ ضمیر کی غلش اُس سے روک رہی ہوتی ہے۔ ایسے تمام مواقع پر تقویٰ کا کمال یہ ہے کہ انسان رُک جائے اور ایسے کاموں کے کرنے سے اجتناب کرے۔ جس نے ایسے کاموں سے اپنے آپ کو روک لیا اُس نے گویا اپنے دین اور ایمان کی حفاظت کر

لی۔ اور جو ایسے کاموں کو گزرے گا وہ بلاآخر ان کاموں کو بھی کرنے لگے گا جو واضح طور پر حرام اور ناجائز ہوں گے۔ اور نتیجہ اپنے دین اور ایمان کو تباہ کر لے گا اور گمراہی کے راستوں پر چل پڑے گا۔ حضور ﷺ نے ایک اور حدیث مبارکہ میں اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

دع ما یریک الی ما لا یریک. (۷۳)

”جو چیز تجھے شبہ میں ڈالے اُسے چھوڑ دے اور اُس کو اپنا لے جو شبہ میں ڈالنے والی نہ ہو۔“
(یعنی جس کا جائز اور حلال ہونا یقینی ہو)

لہذا اپنے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے اور زندگی کو راست روی پر قائم رکھنے کے لیے ہمیں اس حدیث مبارکہ کو بھی زندگی کی ایک لازمی قدر کے طور پر اپنانا ہے تاکہ زندگی ہر قسم کی گمراہیوں سے پاک ہو کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکے اور ہم دنیا و آخرت کی فلاح و سعادت سے ہمکنار ہو سکیں۔

چوتھی حدیث

لا یومن احد کم حتی یحب لا خیہ ما یحب لنفسہ. (۷۴)

”تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ پسند کرنے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“

اسلام کی جملہ تعلیمات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

حقوق اللہ

وہ معاملات جو فقط اللہ اور بندے کے درمیان ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج و دیگر عبادات۔

حقوق العباد

وہ معاملات جو اپنے ارد گرد میں بسنے والے انسانوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

جہاں تک بیان کا تعلق ہے تو اُس میں حقوق اللہ پہلے آتے ہیں اور حقوق العباد بعد میں۔ لیکن

عملی اعتبار سے حقوق العباد کی اہمیت حقوق اللہ سے بھی زیادہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو حقوق اللہ ہیں

وہ تو صرف حقوق اللہ ہی ہیں جو صرف اللہ اور بندے کے درمیان ہیں اور ان میں کوئی تیسرا فریق براہ راست شامل نہیں ہے۔ لیکن جو حقوق العباد ہیں وہ فقط حقوق العباد ہی نہیں بلکہ حقوق اللہ بھی ہیں۔ کیونکہ بندوں کے جتنے حقوق ایک دوسرے کے اوپر ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ نے ہی مقرر فرمائے ہیں۔ لہذا ان کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے حقوق اللہ کی نسبت حقوق العباد کو ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ بہت سارے لوگ جو نماز، روزے وغیرہ کے پابند ہوتے ہیں لیکن دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ اسلامی تعلیمات کے برعکس ہوتا ہے گویا وہ حقوق العباد کے معاملے میں کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔ بظرف غائر دیکھا جائے تو معاشرے کے اندر جتنے بھی لڑائی، جھگڑے، فساد، نفرتیں، عداوتیں اور کدورتیں ہیں ان سب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حقوق تو پورے پورے حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن دوسروں کے حقوق بطریق احسن ادا کرنے سے گریز کرتا ہے یہیں سے معاشرتی زندگی میں ناہمواریوں، محرومیوں اور خرابیوں کا آغاز ہوتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں حقوق العباد کی ادائیگی کے حوالے سے بہت تاکید کی گئی ہے اور اس کی مختلف جہتوں کے متعلق تفصیلات و جزئیات تک بیان کی گئی ہیں تاہم مندرجہ بالا حدیث مبارکہ میں جو اصول دیا گیا ہے، اس ایک اصول کو تھام لیا جائے تو یہ اکیلا ہی انسان کو اس سلسلے کی بقیہ تعلیمات سے بے نیاز کرنے کے لیے کافی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حقوق العباد کے معاملے کو ایمان کیساتھ منسلک کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ کوئی شخص اُس وقت تک ایمان کی حقیقت یا ایمان کے کمال کو نہیں پا سکتا جب تک اُس کا حال یہ نہ ہو جائے کہ وہ ہر معاملے میں جو کچھ اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی کچھ اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرے۔ حقوق العباد کے حوالے سے جتنی بھی کوتاہیاں ہوتی ہیں ان سب کی بنیاد یہ ہے کہ انسانی نفس کا مزاج یہ ہے کہ وہ اپنے لیے تو ہر خیر کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہر شر سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے لیکن دوسروں کے معاملے میں وہ ایسا نہیں چاہتا ہے چنانچہ دوسروں کے ساتھ ہر قسم کے ظلم، زیادتی اور حق تلفی کو چاہتا سمجھ لیتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ جو سلوک، رویہ اور برتاؤ انسان دوسروں سے اپنے لیے چاہتا ہے وہی طرز عمل اُسے دوسروں کے ساتھ اپنانا ہوگا۔ اور جو سعادتیں اور بھلائیاں انسان اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے کہ اُسے حاصل ہوں ویسی ہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرنا ہوں گی۔ گویا اُسے دوسروں کا اسی طرح ہمدرد، خیر خواہ اور مخلص بننا ہوگا جیسا وہ اپنی ذات کے ساتھ ہے۔

اس ایک اصول کو اگر اپنا لیا جائے تو ایک طرف تو انسان ایمان کے کمال کو پا لیتا ہے اور دوسری طرف معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

مندرجہ بالا چار حدیثوں کو پورے دین کا خلاصہ قرار دیا جاسکتا ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے پورے دین پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ

پہلی حدیث مبارکہ	تصحیح اعمال کے بارے میں ہے
دوسری حدیث مبارکہ	تصحیح اوقات کے بارے میں ہے
تیسری حدیث مبارکہ	حقوق اللہ کے بارے میں ہے
چوتھی حدیث مبارکہ	حقوق العباد کے بارے میں ہے

جب اعمال کی تصحیح بھی ہو جائے، اوقات کی تصحیح بھی ہو جائے، حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی درست طریقے سے ادا ہونے لگیں تو گویا پورے دین پر عمل ہو جاتا ہے اور ہر معاملے میں انسان کے لیے صحیح طرز فکر اور طرز عمل کو اپنانا آسان ہو جاتا ہے۔ زندگی آڈارگیوں اور پراگندگیوں سے نجات پانے لگتی ہے، عمل کے زاویے درست ہونے لگتے ہیں اور دنیا و آخرت کی بلندیوں اور کمال کو حاصل کرنے کی طرف انسان کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔

عملی مشورہ جات

دوسری عادت پر بہترین انداز میں عمل پیرا ہونے کے لیے اور اس سے بھرپور استفادہ کرنے کے لیے چند عملی مشورہ جات درج ذیل ہیں۔

۱۔ دوسری عادت کی بنیاد پہلی عادت ہے۔ جب تک ہم پہلی عادت پر صحیح طریقے سے عمل پیرا نہیں ہوں گے تب تک دوسری عادت سے کما حقہ استفادہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ لہذا ایک مرتبہ واپس پلٹ کر دیکھیں کہ آپ نے پہلی عادت کو کس حد تک اپنی فکر اور عمل کا حصہ بنا لیا ہوا ہے۔ اس حوالے سے جو کمی ہو، اسے دور کریں۔

۲۔ دوسری عادت کو بار بار غور سے پڑھیں۔ فقط ایک مرتبہ پڑھ لینے سے ساری باتیں ذہن میں

جذب نہیں ہو جاتیں۔ لہذا بار بار پڑھیں اور جتنے اہم نکات بیان ہوئے ہیں انہیں خوب غور و فکر سے دل و دماغ میں نقش کریں اور عمل کے سانچے میں ڈھالیں یہاں تک کہ وہ آپ کی عادت بن جائیں۔

۳۔ زندگی میں اپنے مختلف کرداروں کے بارے میں غور کریں۔ (مثلاً باپ، بھائی، بیٹا، شوہر، کسی دفتر میں پاس یا کارکن ہونا، معاشرے کا ایک رکن ہونا وغیرہ وغیرہ) اور دیکھیں کہ کیا آپ اپنے تمام کرداروں کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں اور جس حوالے سے آپ کی جو جو ذمہ داریاں ہیں ان کی ادائیگی کے حوالے سے مطمئن ہیں۔ نیز کیا ان میں توازن اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے جہاں جہاں کامیاں دکھائی دیں انہیں دگر کرنے کی کوشش کریں۔

۴۔ کسی فارغ وقت میں گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے من میں ڈوب کر زندگی کے سراغ کو پانے کی کوشش کریں۔ اپنی انفرادیت کے بارے میں سوچیں اور اپنے آپ کو یقین دلائیں کہ آپ پوری کائنات میں ایک منفرد وجود ہیں جس کی طرح کا انسان نہ پہلے کبھی آیا ہے اور نہ بعد میں آئے گا۔ آپ کا ایک اپنا کردار ہے جو فقط آپ کو ہی ادا کرنا ہے۔ کوئی بھی دوسرا شخص اس کردار کو ادا نہیں کر سکتا۔ اُس کردار کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو مخصوص صلاحیتیں دے رکھی ہیں انہیں دریافت کریں۔ ان پر محنت کر کے انہیں نکھاریں اور اپنی اور معاشرے کی اصلاح و فلاح کے لیے انہیں بھرپور طریقے سے عمل میں لانے کا عزم کریں۔

۵۔ اپنی اب تک کی زندگی کا بغور جائزہ لیں کہ کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے۔؟ اپنی آج تک کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی فہرست مرتب کریں۔ ماضی کی غلطیوں، کوتاہیوں اور گمراہیوں کو کھلے دل سے تسلیم کریں اور آئندہ ان کی اصلاح کا عزم کریں۔ اپنی خوبیوں اور خامیوں کو پہچانیں، پھر خامیوں پر قابو پانے اور خوبیوں کو مزید نکھارنے پر محنت کریں۔ ماضی کے تمام نقصانات اور محرومیوں پر جلنے اور گڑھنے کی بجائے وہاں سے قیمتی اسباق کشید کریں اور ان کی روشنی میں بہترین لائحہ عمل مرتب کر کے ثابت قدمی اور استقامت سے اُس پر گامزن ہو جائیں۔ انشاء اللہ العزیز کامیابی و کامرانی آپ کے قدم چومے گی۔

حرف آخر کے طور پر یہ بات یاد رکھیں کہ جو کچھ بھی آپ آج تک کھو چکے ہیں اُس سے بہت

زیادہ کچھ پانے کے لیے اب بھی موجود ہے شرط صرف یہ ہے کہ ماضی کے نقصانات پر دل گرفتہ نہ ہوں۔ ماضی پر پچھتانے کی بجائے اُسے صرف سبق سیکھنے کا ذریعہ بنائیں۔ پھر اُن حاصل شدہ تجربات کی روشنی میں مردانہ وار آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و مددگار ہوگا اور جو کچھ آپ ماضی کے اندر کھو چکے ہیں اُس سے بہت زیادہ کچھ مستقبل میں پالیں گے۔ (انشاء اللہ العزیز)

حواشی

- (۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۱۱
- (۲) الاعلیٰ، ۸۷: ۱۶
- (۳) غزالی، حجة الاسلام امام ابو حامد محمد الغزالی (۵۵۰۵)۔ احياء علوم الدين۔ (مترجم) مولانا محمد حسنین نانوتوی، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، سن ۳۰۱/۳
- (۴) الانفال، ۸: ۶۷
- (۵) بخاری، الصحيح، رقم: ۲۸۰۱، ۱۰۸۱/۳
- (۶) حاکم، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن محمد (۳۲۱-۳۰۵ھ/۹۳۳-۱۰۱۳ء)۔ المستدرک علی الصحيحین۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۱ھ، رقم: ۷۸۵۳، ۳۲۳/۳
- (۷) عسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳-۸۵۲ھ/۱۳۷۲-۱۴۴۹ء)۔ فتح الباری۔ دارالمعرفہ، بیروت، سن ۲۳۰/۱۱
- (۸) واصف، واصف علی، بات سے بات، کاشف پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۶۹
- (۹) الحشر، ۵۹: ۱۸
- (۱۰) طبرانی، سلیمان بن احمد (۲۶۰-۳۶۰ھ/۸۷۳-۹۷۱ء)۔ المعجم الاوسط۔ دار الحرمین، قاہرہ، ۱۴۱۵ھ، رقم: ۶۳۸۸، ۳۰۸/۶
- (۱۱) غالب، اسد اللہ خان، مرزا، دیوان غالب۔ کامل، مرتبہ گیتا رضا کالی داس، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۶
- (۱۲) الانعام، ۶: ۱۱۶
- (۱۳) النجم، ۵۳: ۲۳
- (۱۴) الکہف، ۱۸: ۲۸
- (۱۵) ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان کوفی (۱۵۹-۲۳۵ھ/۷۷۶-۸۳۹ء)۔ المصنف۔ مکتبہ الرشید، الرياض، ۱۴۰۹ھ، ۵۳۵/۶
- (۱۶) واصف، واصف علی، بات سے بات، ص ۱۵۹
- (۱۷) ایضاً، ص ۸۸
- (۱۸) مسلم، الصحيح، رقم: ۱۸، ۳۸/۱
- (۱۹) ترمذی، السنن، رقم ۲۰۱۰، ۳۶۶/۳
- (۲۰) ترمذی، السنن، رقم ۲۰۱۲، ۳۶۷/۳
- (۲۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۸۴
- (۲۲) وحید الدین خان، مولانا، تذکیر القرآن، دارلتذکیر، لاہور، ۷۹۱/۱

- (۲۳) ملا علی قاری، نور الدین بن سلطان محمد بروی حنفی (م ۱۰۱۲/۵۱۶۰۶ء)۔ مرقاة المفاتیح۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۲ھ، ۴۵/۹
- (۲۴) بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۳-۵۳۵۸/۹۹۳ء)۔ السنن الکبریٰ۔ مکتبہ دارالباز، مکتبہ المکرمة، ۱۴۱۲ھ، رقم: ۱۶۹۰۶، ۲۳۹/۸
- (۲۵) الفاتحہ، ۵:۱
- (۲۶) ملا علی قاری، مرقاة المفاتیح، ۱۱۰/۱۰
- (۲۷) ملا علی قاری، مرقاة المفاتیح، ۱۱۰/۱۰
- (۲۸) البقرہ، ۱۴۶:۲
- (۲۹) مسلم، الصحیح، رقم: ۹۱، ۹۳/۱
- (۳۰) ملا علی قاری، مرقاة المفاتیح، ۲۸۰/۳
- (۳۱) الروم، ۲۱:۳۰
- (۳۲) البقرہ، ۱۸۷:۲
- (۳۳) النساء، ۵:۴
- (۳۴) الغدینت، ۸:۱۰۰
- (۳۵) التغابن، ۱۵:۶۳
- (۳۶) حاکم، المستدرک علی الصحیحین، رقم: ۴۸۹۶، ۳۵۳/۴
- (۳۷) عسقلانی، فتح الباری، ۱۰۱/۹
- (۳۸) محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، ص ۱۷۳
- (۳۹) پهلوارى، شاہ محمد جعفر، ندوی، مولانا، مقالات، مکتبہ امتیاز، راولپنڈی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۷
- (۴۰) البقرہ، ۱۶۵:۲
- (۴۱) التوبہ، ۲۴:۹
- (۴۲) ال عمران، ۱۴:۳
- (۴۳) الانعام، ۷۹:۶
- (۴۴) الانعام، ۱۶۲:۶
- (۴۵) ابوداؤد، سلیمان بن أشعث سبحستانی (۲۰۲-۲۴۵/۵۸۱-۸۱۷ء)۔ السنن۔ دار الفکر، بیروت، رقم: ۳۶۸۱، ۲۴۰/۴
- (۴۶) ماہنامہ دختران اسلام، چیف ایڈیٹر قرۃ العین فاطمہ، دسمبر ۲۰۰۳ء، ص
- (۴۷) احمد رفیق اختر، پروفیسر، مجموعہ پروفیسر احمد رفیق اختر، سنگ سیل پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶۷
- (۴۸) عتبندی، ذوالفقار احمد، پیر، خطبات فقیر، مکتبہ الفقیر، فیصل آباد، ۲۰۰۶ء، ۱۵۷/۳

- (۴۹) التغابن، ۶۳: ۱۳
- (۵۰) محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، ص ۵۲۷
- (۵۱) الرحمن، ۵۵: ۲۶
- (۵۲) محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۲۰
- (۵۳) محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۳۶
- (۵۴) ملا علی قاری، مرقاة المفاتیح، ۳۵۵/۳
- (۵۵) اندلسی، محمد بن یوسف، ابوالحیان، البحر المحيط، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۸/۲
- (۵۶) البینہ، ۹۸: ۵
- (۵۷) الذاریات، ۵۱: ۵۶
- (۵۸) الأوسی، روح المعانی فی سبع المثانی، ۲۵/۲۷
- (۵۹) واصف، واصف علی، کرن کرن سورج، ص ۳۳
- (۶۰) واصف، واصف علی، گفتگو، ۱۳۸/۲
- (۶۱) بخاری، الصحيح، رقم: ۷۱۱۱، ۶/۲۷۳۳
- (۶۲) سعیدی، غلام رسول، علامہ، تذکرۃ المحدثین، فرید بک سٹال، لاہور، ۱۳۹۷ء، ص ۲۸۶
- (۶۳) نقشبندی، ذوالفقار احمد، پیر، خطبات فقیر، مکتبۃ الفقیر، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء، ۱۵/۲۳۲
- (۶۴) بخاری، الصحيح، رقم: ۱، ۱/۳
- (۶۵) حاکم، المستدرک علی الصحيحین، رقم: ۷۸۳۳، ۳/۳۳۱
- (۶۶) خطبات فقیر، ۱۵/۲۵۶
- (۶۷) ایضاً، ۱۵/۲۵۷
- (۶۸) ایضاً، ۱۵/۲۵۷
- (۶۹) ہندی، حسام الدین، کنز العمال، رقم: ۸۲۹۱، ۳/۲۵۵
- (۷۰) المومنون، ۲۳: ۳
- (۷۱) الفرقان، ۲۵: ۷۲
- (۷۲) بخاری، الصحيح، رقم: ۵۲، ۱/۲۸
- (۷۳) بھوتی، شرح منتهی الارادات، ۳: ۲۰۹
- (۷۴) بخاری، الصحيح، رقم: ۱۳، ۱/۱۳

ترجیحات کا تعین کرنا

کامیاب لوگوں کی تیسری عادت ہے: ”ترجیحات کا تعین کرنا“

یہ عادت پہلی دو عادتوں کی عملی تکمیل ہے۔ یہاں آ کر تسخیر ذات کا مرحلہ مکمل ہو جاتا ہے۔ تسخیر ذات، تسخیر کائنات کی اولین شرط اور بنیاد ہے۔ ہماری بڑی غلطی ہی یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو مسخر کیے بغیر کائنات کو مسخر کرنے کے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔ خود کو تبدیل کیے بغیر ماحول اور معاشرے کو تبدیل کرنے کے لیے چل پڑتے ہیں۔ نتیجہ سوائے مایوسی اور ناکامی کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لہذا معاشرے میں ایک بھرپور، فعال، موثر اور متحرک کردار ادا کرنے کے لیے پہلے ہمیں اپنے اندر مضبوطی، استحکام اور اثر انگیزی کی خصوصیت پیدا کرنا ہوگی۔ جس کے لیے ان تینوں عادتوں کو اپنی شخصیت اور کردار کا حصہ بنا لینا بہت ضروری ہے۔

دوسری بات یاد رکھنے والی یہ ہے کہ یہ تینوں عادتیں ایک دوسری کے ساتھ اسی ترتیب کے ساتھ منسلک ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کر کے اُس سے اگلی پر براہ راست عمل نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح چھت پر جانے کے لیے زینہ بہ زینہ چڑھنا پڑتا ہے۔ پہلے، پہلے زینے پر پھر دوسرے پر۔ آپ زینوں کو پھلانگ کر نہیں جاسکتے۔ اسی طرح پہلی عادت بنیاد ہے اُسی کی بنا پر آپ دوسری عادت کی طرف آئیں گے۔ اور پھر دوسری سے تیسری کی طرف آئیں گے۔ اگر کسی بھی جگہ کسی عادت کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی تو خاطر خواہ نتائج کا برآمد ہونا مشکل ہوگا۔

ان عادات کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر غور کریں۔

☆ پہلی عادت نے ہمیں بتایا کہ آپ اپنی زندگی کے معمار ہیں۔ دوسری نے بتایا کہ اپنی زندگی کا نقشہ خود بنائیں۔ تیسری عادت بتاتی ہے کہ نقشے کے مطابق تعمیر شروع کر دیں۔

☆ پہلی عادت نے بتایا کہ آپ اپنی زندگی کے ڈرائیور ہیں۔ دوسری عادت نے بتایا کہ اپنی منزل

کا تعین کریں۔ یعنی فیصلہ کریں کہ آپ نے کہاں جانا ہے۔ اور اُس کے لیے راستے (Road Map) کا تعین کریں۔ تیسری عادت کا تقاضا ہے کہ اپنی منزل کی طرف چل پڑیں۔

☆ پہلی عادت نے بتایا کہ آپ اپنی زندگی کے پروگرامر ہیں۔ دوسری عادت نے بتایا کہ اپنا پروگرام بنائیں کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں اور کیا بننا چاہتے ہیں۔ تیسری عادت کا مطالبہ ہے کہ جو پروگرام آپ نے بنالیا ہے اُسے چلانا شروع کریں۔

تیسری عادت کا مفہوم

تیسری عادت کو سمجھنے کے لیے مکان کی مثال پر غور کریں۔ پہلی عادت نے آپ کو بتایا کہ مکان بنانا چاہیے۔ دوسری عادت نے آپ کے ذہن میں مکان کا ایک نقشہ تشکیل دیا کہ مکان اس طرح کا بننا چاہیے۔ تیسری عادت یہ کہہ رہی ہے کہ وہ مکان جو ابھی تک آپ کے ذہن میں ہے یا نقشے کی صورت میں کاغذ پر منتقل ہو چکا ہے اب اُس کو ٹھوس اور عملی شکل میں معرض وجود میں آنا چاہیے۔ اور اُس کے لیے طریقہ کار تجویز کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ترجیحات کا تعین کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ آپ اپنے خوابوں کی عملی تعبیر کو نہیں پاسکیں گے۔

ترجیحات کے تعین سے کیا مراد ہے؟ مکان کے نقشے نے ہمیں یہ تو بتا دیا کہ یہاں بنیادیں ہوں گی، یہاں دیوار ہوگی، یہاں چھت ہوگی وغیرہ۔ لیکن وہ یہ نہیں بتا رہا کہ پہلے کس چیز کو تعمیر کرنا ہے۔ یہ عادت نمبر 3 ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ پہلے بنیادیں بنائیں گے، پھر دیواریں بنائیں گے اور پھر چھت ڈالیں گے وغیرہ۔ اس عادت کا کہنا ہے کہ بنیادوں کو بنائے بغیر مضبوط اور پائیدار دیواریں نہیں بنائی جا سکتیں اور دیواروں کو تعمیر کیے بغیر چھت ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ تو جو کام پہلے ہوتا ہے اُسے پہلے کرتے ہیں اور جو دوسرے نمبر پر ہوتا ہے اُسے اُس کی باری پر کرتے ہیں اور اس طرح قدم بقدم (Step by Step) آگے بڑھتے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں ”ترجیحات کا تعین کرنا“۔ ”ترجیحات کے تعین“ کا آسان مطلب یہ ہے کہ جو کام پہلے ہے اُسے پہلے کیا جائے اور جو بعد میں ہے اُسے بعد میں کیا جائے۔ علامہ اقبالؒ نے اس تصور اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر ام کیا ہے

شمسِ دنوں اول، طاؤس و رباب آخر (۱)

اللہ رب العزت نے ساری کائنات کے نظام کو ایک خاص نظم و ضبط کا پابند بنایا ہے۔ یہاں واقعات ایک خاص ترتیب سے رونما ہوتے ہیں اور معاملات مرحلہ وار پایہ تکمیل تک پہنچتے ہیں۔ ہر کام کے اندر ایک خاص ترتیب (Sequence) ہوتی ہے۔ کسی بھی کام کو خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے۔ تیسری عادت ہمیں بتاتی ہے کہ جس کام کو بھی آپ نے کرنا ہے اس کی ترتیب کو سمجھیں اور اس کے مطابق اسے لے کر چلیں تو منزل تک پہنچ جائیں گے۔ اور اگر آپ نے ترتیب الٹ دی تو محنت کرتے رہیں گے مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔ مثلاً اگر آپ نے دیواروں کے بغیر چھت تعمیر کرنا شروع کر دی تو اس چھت کا انجام کیا ہوگا؟ یا بنیادوں کے بغیر دیواروں کی تعمیر شروع کر دی تو ان دیواروں کا انجام بھی خوشگوار نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک طالب علم پرائمری کے بغیر میٹرک، میٹرک کے بغیر انٹر، انٹر کے بغیر بی۔ اے اور بی اے کے بغیر ایم اے کرنا چاہے تو یہ اس کی خام خیالی ہوگی جو حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتے گی۔ درست طریقہ یہی ہے کہ ان تمام مقاصد کو مرحلہ وار حاصل کیا جائے۔ یہی قانون زندگی کے ہر معاملے میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم اس قانون کو سمجھیں اور ہر معاملے میں ترجیحات کا تعین کریں۔

عادت نمبر 3 کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زندگی مختصر ہے اور کام بے شمار ہیں۔ اگر ہم بغیر سوچے سمجھے ہر کام کو کرنا شروع کر دیں تو ہماری قیمتی زندگی کا بیشتر حصہ فضول، بے کار اور تیسرے درجے کے گھٹیا کاموں میں گزر جائے گا اور اعلیٰ درجے کے کاموں کو کرنے کے لیے وقت بہت کم بچے گا۔ جس کے نتیجے میں ہم کامیابی کے کسی بڑے درجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ لہذا اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اہم اور با مقصد کاموں میں صرف کرنا ہوگا۔ اور غیر اہم اور ادنیٰ درجے کے کاموں سے حتی الوسع اپنا دامن بچانا ہوگا۔

گویا تیسری عادت کو مختصر آیوں بیان کیا جاسکتا ہے:

- ۱- کاموں کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے ترتیب دینا۔
- ۲- اہم کاموں کی خاطر غیر اہم کاموں کو ترک کرنا۔

وقت کی اہمیت

تیسری عادت کا بطور خاص تعلق وقت کی تنظیم (Management) کے ساتھ ہے۔ لہذا

ہمارے لیے وقت کی اہمیت سے آگاہ ہونا بہت ضروری ہے۔ جب تک ہم وقت کی قدر و قیمت کو نہیں پہنچائیں گے تب تک وقت سے بھرپور استفادہ کی فکر بھی دامنگیر نہیں ہوگی۔ اور عادت نمبر 3 پر خوش دلی سے عمل پیرا ہونا بھی مشکل ہوگا۔ چنانچہ انسانی زندگی میں وقت کی اہمیت پر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

وقت اللہ جل مجدہ کی ایک ایسی نعمت ہے جو امیر و غریب، عالم و جاہل اور چھوٹے بڑے کو یکساں ملی ہوئی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو انسان کی زندگی وقت کے علاوہ کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ انسان کو جتنی بھی زندگی کی مہلت یہاں ملی ہوئی ہے وہ ساری کی ساری وقت کی اکائیوں سے ہی عبارت ہے۔ جہاں وقت ختم ہو جاتا ہے، وہاں ہر چیز ختم ہو جاتی ہے۔ وقت کو اس کائنات کی روح بھی کہہ لیا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ ہر دور کے علماء و عقلاء اس بات پر متفق رہے ہیں کہ انسان کی سب سے اہم پونجی جس کو بچا بچا کر استعمال کرنا چاہیے، وقت ہے۔ لحاظ زندگی فراہم کرنے والا وقت درحقیقت بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی کوئی بھی دولت سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات وغیرہ وقت کی برابری نہیں کر سکتے۔ دنیا کی ہر دولت کو کھونے کے بعد بھی اس بات کا امکان رہتا ہے کہ انسان اُسے دوبارہ پالے بلکہ بسا اوقات اُس سے بھی زیادہ حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن وقت ایک ایسی دولت ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا بادشاہ بھی اس کا ایک لمحہ کسی قیمت پر واپس نہیں لاسکتا۔

انسان دنیا میں جتنی بھی کامیابیاں حاصل کرتا ہے اور جو بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیتا ہے وہ سب کے سب وقت کے بہترین استعمال کے ہی مرہون منت ہوتے ہیں۔ وقت سے اچھے طریقے سے کام لینے والے اس تھوڑی سی زندگی میں موجد بن گئے، فلاسفر بن گئے، دانش ور بن گئے اور دین و دنیا کے مالک بن گئے۔ اس کے برعکس جتنے مفلوک الحال اور قابل ترس لوگ دکھائی دیتے ہیں یہ سب کے سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی رنگ میں وقت کو ضائع کیا ہوتا ہے۔ گویا وقت کو ضائع کرنا صرف وقت کو ضائع کرنا ہی نہیں ہے بلکہ خود اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو ضائع کرنا اور اپنے مستقبل کو تباہ کرنا ہے۔ لہذا دین، دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیوں، کامرانیوں، سعادتوں اور بھلائیوں کا دار و مدار صرف اور صرف وقت کے بہترین استعمال پر منحصر ہے۔ دنیا میں جس قدر کامیاب و کامران ہستیاں گذری ہیں اُن کی کامیابی اور ناموری کا راز صرف وقت کی قدر اور اُس کا صحیح استعمال تھا۔ وقت ایک ایسی زمین ہے کہ اگر اس میں سعی کامل کی جائے تو یہ پھل دیتی ہے۔ بے کار چھوڑ دی جائے تو خاردار جھاڑیاں اُگاتی ہے۔ یا پھر وقت خام مسالے کی مانند ہے جس سے جو چاہیں بنایا جاسکتا ہے اور اگر اسے یونہی چھوڑ دیا جائے تو

ضائع ہو جائے گا۔ یا پھر وقت کی مثال کڑکڑاتی دھوپ میں رکھے ہوئے برف کے اُس بلاک کی ہے جس سے، اگر فائدہ اٹھالیا جائے تو فبہا ورنہ اُس نے تو بہر حال پگھل ہی جاتا ہے۔

وقت کی اس اہمیت کے پیش نظر قرآن و حدیث میں بھی جا بجا وقت کی قدر و قیمت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

﴿وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝﴾ (۲)

"زمانے کی قسم، انسان گھائے میں ہے۔"

یہاں انسان کے حوالے سے ایک بات کہنی تھی اُس سے پہلے زمانے کی قسم کھائی گئی اور زمانہ وقت سے ہی عبارت ہے۔ اسی طرح مختلف مقامات پر مختلف اوقات مثلاً صبح، دوپہر اور رات کے اوقات کی قسمیں کھائی گئی ہیں جو وقت کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ حضور ﷺ نے بھی مختلف اسالیب اور پیرائے میں وقت کی قدر و قیمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد فرمایا:

إِغْتَنِمَ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: حَيَاتِكَ قَبْلَ مَوْتِكَ، وَصِحَّتِكَ قَبْلَ سُقْمِكَ،

وَفِرَاغِكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَشَبَابِكَ قَبْلَ هَرَمِكَ وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ. (۳)

"پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جان۔ زندگی کو موت سے پہلے، صحت کو مرض سے پہلے، فراغت کو مشغولیت سے پہلے، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے اور امارت کو غربت سے پہلے۔"

علامہ سیوطی نے "جمع الجوامع" میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر روز صبح کو جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اُس وقت دن یہ اعلان کرتا ہے۔

مَنْ اسْتَطَاعَ أَنْ يَعْمَلَ خَيْرًا فَلْيَعْمَلْهُ فَإِنَّهُ غَيْرُ مَكْرَرٍ عَلَيْكُمْ أَبَدًا. (۴)

"جو شخص آج کوئی بھلائی کر سکتا ہے کر لے۔ آج کے بعد میں پھر کبھی واپس نہیں لوٹوں گا۔"

حقیقت بھی یہی ہے کہ ہماری زندگی میں طلوع ہونے والا ہر دن منفرد ہوتا ہے اُس طرح کا دن نہ پہلے کبھی آیا ہوتا ہے اور نہ بعد میں کبھی آنا ہوتا ہے۔ اگرچہ بظاہر دیکھنے میں دن ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت میں مختلف ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسے کسی کے پاس سو روپے کے بالکل نئے نوٹوں کا ایک پیکٹ ہو تو اُس میں سے نکلنے والا ہر

نوٹ بظاہر ایک جیسا دکھائی دے گا مگر حقیقت میں ہر ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ ایسے ہی ہماری زندگی کا کوئی دن اور کوئی لمحہ پلٹ کر نہیں آتا ہے۔ جو ایک دفعہ گذر گیا وہ گذر گیا۔ لہذا ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اتنی انمول اور نایاب دولت کو ہم کہاں صرف کر رہے ہیں۔

سیدنا صدیق اکبرؓ دعا کیا کرتے تھے:

الھم لا تدعنا فی غمرة ولا تاخذنا علی غرة ولا تجعلنا من الغافلین. (۵)

”اے اللہ! ہمیں شدت میں نہ چھوڑنا اور ہمیں غفلت کی حالت میں نہ پکڑنا اور ہمیں غافل لوگوں میں سے نہ بنا دینا۔“

سیدنا عمر فاروقؓ کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ تھی۔

الھم انا نسنلک صلاح الساعات والبرکة فی الاوقات. (۶)

”اے اللہ! ہم آپ سے زندگی کی ساعات کی بہتری اور اپنے اوقات میں برکت کا سوال کرتے ہیں۔“

حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے:

الایام صحائف اعمارکم فخلدوها صالح اعمالکم. (۷)

”یہ ایام تمہاری عمروں کے صحیفے ہیں اچھے اعمال سے ان کو دوام بخشو۔“

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

یا ابن آدم انما انت ایام فاذا ذهب یوم هب بعضک. (۸)

”اے ابن آدم! تو ایام ہی کا مجموعہ ہے۔ پس جب ایک دن گزر جائے تو یوں سمجھ کہ تیرا

ایک حصہ گذر گیا۔“

چھٹی صدی کے مشہور عالم علامہ ابن الجوزیؒ نے اپنے صاحبزادے کے لیے ایک نصیحت نامہ ”لفۃ الکبد فی نصیحة الولد“ کے نام سے لکھا اُس میں وقت کی اہمیت اور عمر عزیز کی قدر و منزلت کے حوالے سے جو کچھ انہوں نے کہا، اختصار کے پیش نظر صرف اُس کے ترجمے پر اکتفا کیا جاتا ہے فرماتے ہیں۔

”بیٹے! زندگی کے دن چند گھنٹوں پر مشتمل ہیں اور گھنٹے چند گھڑیوں سے عبارت ہیں۔ زندگی کا ہر سانس گنجینہء ایزدی ہے۔ ایک ایک سانس کی قدر کرو کہ کہیں بغیر فائدے کے نہ گزرے تاکہ کل قیامت والے دن زندگی کا دھینڈ خالی پا کر اشکِ ندامت نہ بہانے پڑیں۔ ایک ایک لمحہ کا حساب کرو کہ کہاں صرف ہو رہا ہے اور اس کوشش میں رہو کہ ہر لمحہ کسی مفید کام میں صرف ہو۔ بے کار زندگی گزارنے سے بچو اور اپنے آپ کو کام کرنے کی عادت ڈالو تاکہ آگے چل کر وہ کچھ پاسکو جو تمہارے لیے باعثِ مسرت ہو“ (۹)

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے ذمہ کام بہت زیادہ ہیں۔ اور وقت بہت مختصر۔ انسان کا مستقبل موبوم ہے۔ اُس کا حال ثبات سے خالی ہے اور ماضی اُس کی قدرت سے باہر ہے جس نے حال سے فائدہ اٹھا لیا محنت و مشقت کو اپنا وطیرہ بنائے رکھا اور جراتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے اپنی دنیا آپ پیدا کر لی اُس کے دامنِ نصیب میں تو بقدرِ ہمت و کوشش تھوڑا زیادہ آجاتا ہے۔ بصورتِ دیگر وقت گذر جاتا ہے اور انسان حسرت سے ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے کیونکہ گردشِ زمانہ کی تنگی داماں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ نہ یہ کسی کی خاطر رکتی ہے اور نہ گذر جانے کے بعد واپس لائی جاسکتی ہے۔ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں بہت خوبصورتی سے وقت کی حقیقت، اُس کی بے وفائی و بے نیازی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے انتظار میں حال کو ضائع کرنے والی انسانی روش کو بیان کیا ہے۔

جو تھا نہیں ہے، جو ہے، نہ ہوگا، یہی اک حرفِ محرمانہ

قریب تر ہے نمودِ جس کی، اُسی کا مشتاق ہے زمانہ (۱۰)

مندرجہ بالا آیات و احادیثِ مبارکہ اور دیگر اقوالِ وقت کی اہمیت و افادیت کو کسی نہ کسی رنگ میں بیان کر رہے ہیں کہ انسان کو وقت کی قیمتی متاع سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے اور وقت کی صورت میں ملی ہوئی مہلت کے ایک ایک لمحے سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے تاکہ وہ دنیا و آخرت کی بھلائیاں حاصل کر سکے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عادت نمبر 3 کو استعمال میں لاتے ہوئے ترجیحات کا تعین کس طرح کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے ذیل میں دیا گیا چارٹ ہمیں مکمل رہنمائی دیتا ہے۔ اس چارٹ کو سمجھنے اور اس کے مطابق وقت کے دانشمندانہ استعمال میں ہی کامیاب زندگی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اس کے برعکس

اسے نہ سمجھنے یا اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں کامیابی کا اعلیٰ درجہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔

وقت کی تنظیم کا چارٹ

غیر ضروری (Not Urgent)	فوری (Urgent)	
II	I	اہم important
۵۰ پرہیزی اور احتیاطی تدابیر	۶۰ بحران سے دو چار کام	
۵۰ تعلقات کی استواری	۶۰ شدید دباؤ میں آنے ہوئے کام	
۵۰ نئے مواقع کی دریافت	۶۰ فوری حل طلب مسائل	
۵۰ آئندہ کے حوالے سے منصوبہ بندی	۶۰ مقررہ تاریخ کے اندر مکمل کیے جانے والے	
۵۰ صلاحیتوں کی تجدید (PC کی حفاظت)	منصوبہ جات	
IV	III	غیر اہم Not important
۵۰ آؤٹ پناگ سرگرمیاں	۶۰ بے وقت مداخلت	
۵۰ فضول وردی اور بے کار کاموں میں مشغولیت	۶۰ غیر اہم فون کالز	
۵۰ خوش گپیاں، ہنسی مذاق اور دیگر دلکش امور	۶۰ چھوٹے چھوٹے مسائل میں مشغولیت	
۵۰ بے مقصد باتیں اور ملاقاتیں اور فون کالز وغیرہ	۶۰ بروئے کار کام	

درج بالا چارٹ کے اندر دو کالم ہیں جنہیں فوری اور غیر فوری کاموں کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا ہے جب کہ دو قطاریں ہیں جو اہم اور غیر اہم کاموں کے عنوان پر مشتمل ہیں۔ فوری نوعیت کے کاموں سے مراد وہ کام ہیں جو ہماری فوری توجہ چاہتے ہیں جنہیں نظر انداز کرنا ممکن نہ ہو۔ جب کہ اہم کاموں سے مراد وہ کام ہیں جو ہماری زندگی پر دور رس اثرات کے حامل ہوتے ہیں اور زندگی میں ہمہ جہت ترقی کے لیے جن کو بجالانا ضروری ہے۔

کالموں اور قطاروں کے اجتماع سے کل چار خانے بن رہے ہیں۔ ہر خانے میں پائے جانے والے کاموں کی دو حیثیتیں ہیں۔ مثلاً فوری اور اہم، فوری اور غیر اہم وغیرہ۔ ہماری شب و روز کی زندگی میں جتنے بھی کام اور سرگرمیاں ہیں ان سب کا تعلق انہی خانوں کے ساتھ ہے اور ہمارا ہر چھوٹا بڑا کام ان میں سے ہی کسی نہ کسی خانے میں آتا ہے۔ ان خانوں کی مختصر تشریح کچھ یوں ہے۔

پہلا خانہ (First Quadrant)

پہلے خانے میں جو کام آتے ہیں وہ اہم بھی ہیں اور فوری نوعیت کے حامل بھی ہیں۔ ایک طرف

تو زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لیے انہیں کرنا ضروری بھی ہے اور دوسری طرف ان کاموں کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ فوری طور پر انجام دہی کا تقاضا کرتی ہے۔ اور ان کو زیادہ عرصہ کے لیے ملتوی بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً گاڑی کے خراب ہو جانے پر اس کی مرمت کروانا، بچے کے بیمار ہو جانے پر اس کی دوائی کا بندوبست کرنا، امتحان سر پر آ جانے کی صورت میں ان کی تیاری کرنا، کسی زیر تکمیل منصوبہ کی مقررہ تاریخ (Dead line) کا قریب آ جانا وغیرہ۔

دوسرا خانہ (Second Quadrant)

اس خانے میں آنے والے کام اہم تو ہیں لیکن فوری نہیں ہیں۔ ان کاموں کے ہماری زندگی پر بہت خوشگوار اثرات ہوتے ہیں لیکن یہ کام ایسے ہیں کہ فوری ادائیگی کا تقاضا نہیں کرتے۔ مثلاً مستقبل کو بہتر بنانے کے حوالے سے منصوبہ بندی، زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے نئے مواقع کی دریافت، اپنے متعلقین کے ساتھ خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے کے لیے اور نئے تعلقات استوار کرنے کے لیے وقت نکالنا۔ اپنی صلاحیتوں کی تجدید اور انہیں بہتر بنانے کے لیے نیز اپنے زیر استعمال اشیاء کی حفاظت کے لیے مناسب تدابیر اپنانا (جسے متعلقہ خانے میں PC (Production Capability) کی حفاظت سے تعبیر کیا گیا ہے) وغیرہ۔

تیسرا خانہ (Third Quadrant)

تیسرا خانہ ایسے کاموں اور سرگرمیوں پر مشتمل ہے جو فوری نوعیت کے حامل ہیں تاہم وہ اہم نہیں ہیں کسی واقف کار کا اچانک ملنے آ جانا، فون کی گھنٹی کا بجنا وغیرہ جیسے کام ایسے ہیں جو ہماری فوری توجہ کے متقاضی ہیں اور عمل کا تقاضا کرتے ہیں لیکن یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ ان کاموں کا کوئی خاص مثبت نتیجہ بھی ہماری زندگی پر مرتب ہو۔

چوتھا خانہ (Fourth Quadrant)

اس خانے میں آنے والے کام وہ ہیں جو نہ تو اہم ہیں اور نہ ہی فوری نوعیت کے حامل ہیں کہ جن کو سر انجام دینا ہماری مجبوری ہو۔ یہ خانہ سارے کا سارا ان مصروفیات سے عبارت ہے جن میں سراسر وقت کا ضیاع ہے۔ مثلاً محض تفریح طبع کے لیے ناول اور افسانے پڑھنا، بغیر کسی خاص مقصد کے

محض وقت گزاری کے لیے ٹی وی پروگرام دیکھتے رہنا۔ دوست احباب کی محفل میں بیٹھ کر گھنٹوں فضول باتوں اور خوش گپیوں میں مشغول رہنا۔ وغیرہ

اب ہم قدرے باریک بینی سے وقت کے ان چاروں حصوں کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان سے متعلقہ کاموں کے ہماری زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

پہلے خانہ کے تمام کام بجز بھاری نوعیت کے ہوتے ہیں جن سے صرف نظر کرنے سے زندگی میں بے شمار الجھنیں، محرومیاں اور پریشانیاں پیدا ہو جاتی ہیں لہذا انہیں نظر انداز کرنا کسی طرح بھی ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ دوسری طرف یہ ہنگامی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں کہ انہیں التواء میں بھی نہیں ڈالا جا سکتا یہ ہمارے بالکل سامنے آکھڑے ہوتے ہیں اور فوری عمل کا تقاضا کرتے ہیں چنانچہ ان کی انجام دہی کے حوالے سے ہمارے اوپر ایک دباؤ ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہمیں مجبوراً ان کی طرف توجہ دینا ہی پڑتی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو ان کاموں کے پیدا ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ ہماری ایک عادت ہے اور وہ ہے ”کاموں کو ملتوی کرنا“ اکثر و بیشتر لوگ روزمرہ کی زندگی میں کئی اہم کاموں کو آخری وقت تک ٹالتے رہتے ہیں۔ بالآخر وہی کام ایک بجز بھاری نوعیت کے انسان کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں اور اب انہیں مزید ٹالنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک طالب علم کے پاس کسی بھی کلاس کے آغاز میں اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ بڑے آرام اور سکون کے ساتھ اُس کی تیاری کر سکتا ہے لیکن امتحان کی تیاری کو وہ آج کل پر ٹالتا رہتا ہے یہاں تک کہ امتحان سر پر آجاتا ہے اور اب اُس کے لیے امتحان کی تیاری ایک دوسرے بن جاتی ہے اور وہ اُس حوالے سے شدید دباؤ کا شکار ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جو گاڑی میں بروقت پٹرول نہیں ڈلواتا ہے تو بالآخر کسی نہ کسی جگہ پر گاڑی رک جاتی ہے اور وہ اُس کے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے۔ یونہی ایک شخص کے پاس ایک منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے کافی وقت ہوتا ہے جس میں وہ ایک معمول (Ruoten) کے تحت کام کرتے ہوئے کامل سکون اور اطمینان سے اپنا کام مکمل کر سکتا ہے مگر ابتداء میں وہ سستی، کاہلی اور غفلت کا مظاہر کرتا ہے جس کی وجہ سے آخری تاریخ (Dead line) کے قریب آجانے پر وقت کم ہوتا ہے اور کام زیادہ۔ یہ چیز ایک ہنگامی صورت حال کو پیدا کر دیتی ہے اور اُسے دباؤ کی حالت میں اپنا کام مکمل کرنا ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام کام ایسے ہیں جن کے سامنے آجانے پر ہم ان سے صرف نظر کر ہی نہیں سکتے

لیکن اگر ہمارے وقت کا بیشتر حصہ انہی کاموں کو کرنے میں گزر جائے تو پھر ساری زندگی بحرانوں کو حل کرنے میں ہی گزر جائے گی اور ہم زندگی کے بازار سے اپنے وقت اور صلاحیتوں کی پوری قیمت وصول نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی کامیابی کی بلندیوں تک پہنچ سکیں گے اور لوگوں کی اکثریت کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ پھر جب ان کاموں کا دباؤ ناقابل برداشت محسوس ہونے لگتا ہے تو کئی لوگ راہ فرار اختیار کرتے ہوئے چوتھے حصے کے کاموں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کچھ وقت پہلے حصے کے مسائل کو حل کرنے میں اور بقیہ وقت سکون اور راحت کے عارضی سامانوں سے دل بہلانے میں صرف ہونے لگتا ہے۔ چوتھے حصے کے کاموں میں ایک نشہ ہوتا ہے جو وقتی طور پر حقائق کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے اور انسان کو عارضی طور پر تسکین مل جاتی ہے لیکن اس طرح مسائل تو حل نہیں ہونے ہوتے بلکہ ان کا انبار بڑھتا چلا جاتا ہے اور زندگی ناقابل برداشت بوجھ دکھائی دینے لگتی ہے۔ پہلے خانے کے کاموں کی یہ خاصیت ہے کہ جتنا زیادہ انسان ان پر توجہ مرکوز کرے اتنا ہی پہلا خانہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور دیگر خانے سکڑتے چلے جاتے ہیں اور صورت حال کچھ یوں بنتی ہے۔

۱۔ نتائج (Results)	
II	☆ ذہنی تناؤ -
IV	☆ جسمانی تھکاوٹ
	☆ ہر وقت ہنگامی صورت حال
	☆ صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ نہ کر سکتا۔
III	

تیسرے خانے کے کام بھی فوری نوعیت کے ہیں تاہم یہ بہت اہم نہیں ہوتے لیکن دکھائی ایسے ہی دیتے ہیں جیسے یہ بہت اہم ہوں۔ اسی بنا پر انسان مطمئن ہوتا ہے کہ میں اہم کاموں میں وقت کو صرف کر رہا ہوں مگر حقیقتاً وہ وقت کو صرف نہیں بلکہ ضائع کر رہا ہوتا ہے اور وقت کی صورت میں درحقیقت اپنی

زندگی کو ہی تباہ کر رہا ہوتا ہے۔ پہلے اور تیسرے حصے کے کاموں میں فرق صرف اہمیت کا ہے۔ جہاں تک فوری ہونے کا تعلق ہے تو وہ دونوں جگہ موجود ہے تاہم پہلے حصے کے کام فوری ہونے کے ساتھ ساتھ اہم بھی ہوتے ہیں کہ ان کے ہونے نہ ہونے کے زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں مگر تیسرے حصے کے کام بھی فوری عمل کا تقاضا تو کرتے ہیں لیکن ان میں اہمیت والا پہلو مفقود ہوتا ہے۔ اس حصے میں وہ تمام کام آتے ہیں جن کو ہم محض دوسروں کی دل جوئی اور ان کی خوشنودی کے لیے کرتے ہیں یا بالفاظ دیگر محض دوسروں کی نظر میں مقبول (Popular) ہونے کے لیے بجالاتے ہیں۔

اس خانے میں زیادہ تر فون کالز، میٹنگز، تقریبات، دوست احباب کے ساتھ ملاقاتیں اور اس طرح کے دیگر مشاغل شامل ہیں جن کا مقصد اکثر و بیشتر دوسرے لوگوں کی توجہ حاصل کرنا، ان کی نگاہوں میں معزز و محترم بننا اور اپنی شخصیت کو ماحول اور معاشرے کے لیے قابل قبول بنانا جیسی خواہشات ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات فون کالز، ملاقاتیں، اور میٹنگز واقعی فائدہ مند اور دور رس اثرات کی حامل ہوتی ہیں۔ مگر وہ سب اس خانہ سے باہر کی ہیں اور ان کا تعلق دو نمبر خانے سے ہے۔ یہاں جن فون کالز اور ملاقاتوں وغیرہ کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ ایسی ہیں جن کے اندر مقصدیت اور اہمیت کا پہلو نہ ہو اور ان کا مقصد محض وقت گزاری اور دوسروں کی نظروں میں نمایاں بننا ہو۔

تیسرے خانے میں ہم جو زندگی گزارتے ہیں وہ دراصل ہماری اپنی نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کے لیے ہوتی ہے کیونکہ اس میں دوسرے لوگ ہی شامل ہوتے ہیں اور ان کو ہی خوش کرنا مقصود ہوتا ہے اس حصے پر زیادہ توجہ مرکوز کر دی جائے تو یہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور باقی سکڑتے چلے جاتے ہیں اور صورتِ حال کچھ یوں بنتی ہے۔

II	I
IV	<p>III نتائج (Results)</p> <ul style="list-style-type: none"> ☆ مقاصد اور منصوبہ بندی کا فقدان ☆ احساس کمتری و احساسِ مظلومی ☆ نظم و ضبط کا فقدان ☆ مضبوط اور پائیدار تعلقات کا فقدان

چوتھا خانہ جن کاموں اور سرگرمیوں پر مشتمل ہے اُن کو تو حقیقتاً کام کہنا ہی نہیں چاہیے کیونکہ وہ نہ تو اہم ہوتے ہیں اور نہ ہی فوری نوعیت کے حامل ہوتے ہیں کہ جن کو کرنے کے حوالے سے ہمارے اوپر کوئی دباؤ ہو۔ اس خانے کے تمام کاموں کا تعلق وقت کے ضیاع کے ساتھ ہے کیونکہ اُن میں مشغول ہونے سے نہ تو ہماری شخصیت میں کوئی بہتری آتی ہے اور نہ ہی کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ مثلاً ہم گھنٹوں بیٹھ کر تاش کھیلتے رہیں، ٹی وی پر اوٹ پناگ قسم کے پروگرام دیکھتے رہیں یا محض ذہنی عیاشی کے لیے کوئی ناول پڑھتے رہیں تو اُس کا حقیقی فائدہ تو کوئی نہ ہوگا البتہ سونے اور چاندی سے کہیں زیادہ قیمتی وقت بڑی تیزی سے ضائع ہوتا چلا جائے گا جس کے نتیجے میں ہم اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے نشوونما دینے اور کامیابی و کامرانی کے بیشمار مواقع سے استفادہ کرنے سے محروم ہوتے چلے جائیں گے۔ نتیجہ زندگی محرومیوں، مایوسیوں اور ناکامیوں کا مرقع بنتی چلی جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم چوتھے خانے کے کاموں میں مشغول ہو کر اپنے آپ کو ضائع کیوں کرتے ہیں۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ نفس کی سستی، کاہلی، غفلت اور لاپرواہی کی عادت ہے۔ انسانی نفس راحت و آسائش کا دلدادہ ہے اور تن آسانی کو پسند کرتا ہے اور محنت و مشقت والے کاموں کو ناپسند کرتا ہے اسی لیے ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے بھی گریز کرتا ہے کہ اُس میں اس کی آزادیاں اور آوارگیاں ختم ہوتی ہیں۔ چوتھے حصے کے کام نفس کی اس خواہش کی تسکین بڑے عمدہ طریقے سے کرتے ہیں۔ اس

لیے اسے یہاں زیادہ سکون میسر آتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلے اور تیسرے خانے کے کام ہم سے فوری عمل کا تقاضا کر رہے ہوتے ہیں۔ جب ان دونوں خانوں کے کاموں کا دباؤ ہمارے اوپر زیادہ ہو جائے تو لامحالہ ہم راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اپنی سلامتی اور سکون کے لیے خانہ نمکو گوشہء عافیت سمجھتے ہوئے اُس میں پناہ لے لیتے ہیں۔

سطحی نظر سے دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خانہ نمبر 4 کے مشاغل ہمیں جسمانی اور ذہنی سکون فراہم کر رہے ہیں لیکن بظہر غائر جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کاموں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ یہ ہمیں حقیقی راحت و تسکین سے ہم کنار کر سکیں۔ اگر انسان اپنا زیادہ وقت اس خانے میں گزارے تو زندگی کے دوسرے اہم اور ضروری کاموں کے لیے وقت بہت کم بچے گا۔ اور انسان اپنے آپ کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لیے بھی عضوِ معطل بن کر رہ جائے گا۔ جوں جوں یہ خانہ پھیلتا چلا جائے گا ویسے ویسے خانے سکڑتے چلے جائیں گے اور صورتِ حال کچھ یوں بن جائے گی۔

II	I
<p>IV۔ نتائج (Results)</p> <ul style="list-style-type: none"> ☆ غیر ذمہ دارانہ زندگی ☆ محرومی و ناکامی ☆ عزت نفس کا فقدان ☆ تعلقات میں خرابی ☆ حقیقی سکون و راحت سے محرومی 	<p>III</p>

جہاں تک دوسرے خانے کا تعلق ہے تو یہی وہ خانہ ہے جس میں پائے جانے والے کام زندگی کو عروج سے ہمکنار کرتے ہیں اور انسان کے دامن کو سچی خوشیوں، حقیقی مسرتوں اور دائمی راحتوں سے بھر دیتے ہیں۔ اس حصے میں پائے جانے والے کام اہم تو ہیں کہ اُن کے کرنے سے زندگی پر بہت سے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں اور زندگی کا سفر بہت آسان ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن وہ فوری نوعیت کے حامل نہیں ہوتے یعنی وہ ہم سے عمل کا فوری تقاضا نہیں کرتے۔ لہذا ہم انہیں لمبے عرصے تک ملتوی کر

سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب ہماری کامیابیوں کا دارومدار اس خانے کے کاموں کو زیادہ سے زیادہ بجا لانے پر ہے تو پھر ہم ان سے گریز کیوں کرتے ہیں؟ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ کام فوری عمل کا تقاضا نہیں کرتے اور ان کے کرنے کے حوالے سے ہمارے اوپر کوئی دباؤ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے انہیں ترک کر دینا یا ملتوی کر دینا ہمیں آسان دکھائی دیتا ہے کیونکہ ان کے فوری نتائج سامنے نہیں آ رہے ہوتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ سب کام اہم ہونے کے باوجود بہت زیادہ دلچسپ نہیں ہوتے ہیں لہذا نفس کو ان کے کرنے میں کوئی خاص رغبت محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ الٹا ایک ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے طبیعت ان کاموں کی طرف راغب نہیں ہو پاتی اور انسان ان کاموں کو آنے والے وقت پر ناتوا رہتا ہے لیکن جن لوگوں نے کامیابی کی بلند منزل پر پہنچنا ہوتا ہے وہ ان کاموں کو ترک یا ملتوی کرنا گوارا ہی نہیں کرتے۔ کامیاب اور ناکام لوگوں میں فرق ایک جملے میں یہ ہے کہ ناکام لوگ ان کاموں کی طرف لپکتے ہیں جو ان کو پسند ہوں اور طبیعت کو مرغوب ہوں چاہے وہ بے فائدہ بلکہ نقصان دہ ہی کیوں نہ ہوں مگر کامیاب لوگ کسی کام کو کرنے نہ کرنے کا معیار اپنی ذاتی پسند و ناپسند اور دلچسپی یا غیر دلچسپی کو نہیں بناتے بلکہ وہ اُس کام کی اہمیت کو دیکھتے ہیں۔ وہ ہر اہم کام کو کرتے ہیں خواہ وہ انہیں کتنا ہی ناپسند ہو اور ہر غیر اہم کام سے گریز کرتے ہیں چاہے وہ کتنا ہی انہیں پسند ہو گویا ناکام لوگ اپنی طبیعت اور مزاج کے غلام ہوتے ہیں۔ اور اپنے جذبات و احساسات کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہتے ہیں جبکہ کامیاب لوگ اپنے جذبات و احساسات، عادات و اطوار اور اپنے اعمال و افعال کے آقا ہوتے ہیں اور انہیں اپنی اقدار، بلند مقاصد اور طے شدہ نصب العین کے تابع رکھتے ہیں۔

دوسرے خانے میں پائے جانے والے تمام کام معیاری اور دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ ان میں وہ تمام سرگرمیاں شامل ہیں جو ہمارے اندر قوت استعداد بڑھاتی ہیں اور ہماری کارکردگی میں اضافہ کرتی ہیں۔ اور دنیا کی سٹیج پر ہمیں ایک بھرپور فعال اور متحرک کردار ادا کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ مثلاً اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرنا، اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو پروان چڑھانے اور انہیں بھرپور انداز میں استعمال کرنے کے حوالے سے مناسب تدابیر اپنانا، مستقبل میں پیش آنے والے حالات کی قبل از وقت تیاری کرنا (گاڑی میں بروقت پٹرول ڈلوانا، امتحان کی تیاری قبل از وقت شروع کرنا وغیرہ۔) یہ

سارے کام وہ ہیں جو ہماری زندگی میں مضبوطی اور استحکام لاتے ہیں اور ہماری اشریت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے وقت، صلاحیتوں اور مواقع سے بھرپور استفادہ کرنے کے قابل بناتے ہیں اور دنیا کی شیخ پر اپنا مخصوص اور منفرد کردار بطریق احسن ادا کرنے کے لیے ہمیں تیار کرتے ہیں۔ جوں جوں انسان دوسرے خانے پر توجہ مرکوز کرتا ہے دوسرا خانہ پھیلتا چلا جاتا ہے پہلا خانہ سکڑتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ جب ہر کام اپنے وقت پر مکمل ہوتا چلا جائے گا تو پھر ہنگامی کام خود بخود کم سے کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں پہلا خانہ خود بخود چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے اور جہاں تک تیسرے اور چوتھے خانوں کا تعلق ہے تو کامیاب اور پُر اثر زندگی کے اندر ان کی گنجائش تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے یہ صورت حال کچھ یوں بنتی ہے۔

II	→	I
نتائج (Results)		
☆ زندگی میں توازن، اعتماد، ہم آہنگی اور ٹھہراؤ		↑
☆ نظم و ضبط (Discipline)		
☆ حالات اور معاملات کا کافی حد تک کنٹرول میں ہونا		
☆ ذہنی و قلبی سکون و اطمینان		
☆ شخصیت میں مسلسل ترقی و ارتقاء اور اثر انگیزی میں اضافہ ↓		↓
IV		III

یوں تو ہم سب لوگ اپنا وقت چاروں خانوں میں ہی صرف کرتے ہیں لیکن کامیابی کا دار مدار اس بات پر ہے کون اپنا کتنا وقت کس خانے میں صرف کرتا ہے۔ کامیاب لوگوں کی خوبی یہ ہے کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دوسرے خانے میں صرف کرتے ہیں اور پہلے خانے میں ضرورت اور مجبوری کی حد تک ہی رہتے ہیں اور جہاں تک تیسرے اور چوتھے خانوں کا تعلق ہے تو ان سے حتی الوسع گریز ہی کرتے ہیں کیونکہ ان دونوں کا تعلق غیر ذمہ دارانہ زندگی کے ساتھ ہے۔ جتنا زیادہ کوئی شخص اپنا وقت دوسرے خانے میں صرف کرنا شروع کر دیتا ہے اسی تناسب سے کامیابی کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ جو شخص پہلے سے ایک غیر منظم اور بے ترتیب زندگی گزار رہا ہے اور اب وہ اپنی زندگی کو منظم کرنا چاہتا ہے تو اُسے خانہ نمبر 2 میں زیادہ وقت صرف کرنے کے لیے ابتداء میں

وقت تین اور چار نمبر کے خانوں سے لینا پڑے گا کیونکہ ایک نمبر خانے کے جو بحرانی اور ہنگامی مسائل ہیں انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا شروع میں تو یہ قربانی آخری دو خانوں کو ہی دینا ہوگی۔ تاہم جوں جوں انسان دوسرے خانے پر محنت کر کے زندگی کے معیار کو بہتر بناتا چلا جائے گا تو پھر ایک نمبر خانے کے ہنگامی مسائل اور بحرانی کام خود بخود کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے اور یہ خانہ بھی سکڑتا چلا جائے گا یہاں تک کہ اپنے اُس اصل سائز پر آجائے گا جو کہ ایک نارمل اور صحت مند زندگی میں ہوتا ہے نیز وہاں پہنچ کر انسان خود بھی کافی مضبوط اور مستحکم ہو چکا ہوگا۔ اُس سطح پر اس خانے کے مسائل سے پنپنا قطعاً مشکل نہیں ہوگا۔

دوسرے خانے میں کام کرنے کے لیے ہمیں ذمہ دار (Proactive) بننا پڑے گا۔ اس لیے کہ پہلے اور تیسرے خانے کے فوری نوعیت کے کام ہم پر عمل کرتے ہیں اور ہمیں دباؤ کی کیفیت میں لے آتے ہیں۔ لہذا دوسرے خانے کی اہم ترجیحات کو ”ہاں“ کہنے کے لیے ہمیں بعض دوسرے کاموں کو ”نہ“ کہنا سیکھنا پڑے گا۔ اگرچہ اُن میں سے کچھ چیزیں ہمیں فوری نوعیت کی دکھائی دیں گی۔ ہمیں پہلے تو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہماری اہم ترجیحات کیا ہیں اور پھر اپنے اندر یہ حوصلہ پیدا کرنا ہوگا کہ ہم اُن کے مقابلے میں دوسری ”غیر اہم“ یا کم ”اہم چیزوں“ کو ”نہ“ کہہ سکیں۔ مگر اس ”نہ“ کہنے کے لیے پہلے ہمارے اندر ایک بھڑکتی ہوئی ”ہاں“ کا ہونا ضروری ہے اور یہ تب ہی ممکن ہوگا جب ہم پہلے عادت نمبر ایک کے ذریعے اپنے اندر خود اعتمادی اور احساسِ ذمہ داری پیدا کر چکے ہوں اور پھر عادت نمبر 2 کے ذریعے اپنے نصب العین اور اپنی گہری اقدار کو قلب و ذہن میں اتار چکے ہوں۔

یوں تو ہم ہر وقت کسی کام کو ”ہاں“ اور کسی کو ”نہ“ کہہ رہے ہوتے ہیں روزمرہ زندگی میں ہر وقت ہمارے سامنے مختلف کاموں کے آپشنز کھلے ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ہم نے کسی کو لینا ہوتا ہے اور کسی کو چھوڑنا ہوتا ہے لیکن عام طور پر ہم سوچ سمجھ کر فیصلہ نہیں کرتے اور یونہی بلا سوچے سمجھے اہم اور ضروری کاموں کو چھوڑ کر کم اہم یا غیر اہم کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً اپنے وقت کو بہترین انداز میں استعمال کرنے کی بجائے کبھی بہتر پر اکتفا کر لیتے ہیں اور کبھی وقت کو ضائع کرتے چلے جاتے ہیں لیکن اگر ہمارے اندر ہمارا نصب العین راسخ ہو چکا ہے اور ہماری زندگی درست اصولوں پر قائم ہو چکی ہے تو پھر ہمارے اندر یہ بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم ہر موقع پر موثر انداز میں صحیح فیصلہ کر سکیں اور اپنے

وقت کو بہترین انداز میں استعمال کر سکیں۔ نیز ہمارے اندر اتنی جرأت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم اپنے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو حوصلہ مندانہ طور پر طور پر عبور کر سکیں اور ثابت قدمی اور استقامت سے اپنے متعینہ راستے پر گامزن رہ سکیں۔

جرأت مندی کا حلقہ

تیسری عادت ہم سے صرف وقت کو بہترین انداز میں استعمال کرنے کا ہی تقاضا نہیں کرتی بلکہ یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ عادت نمبر ۲ کے ذریعے جن اقدار کو ہم نے اپنی زندگی کے لیے متعین کیا ہے ان پر کاربند رہیں۔ بالفاظ دیگر یہ عادت ہمیں اہم کاموں اور اہم اصولوں پر کاربند رہنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ چیز قدرے مشکل ہے اور اس میں طبیعت پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف ہماری طبیعت کی سہل پسندی آسان کاموں کی طرف لپکتی ہے اور محنت طلب اور پُرمشقت کاموں سے بالعموم گریز کرنا چاہتی ہے۔ معمول (Routine) کے حالات میں تو پھر بھی انسان کسی نہ کسی درجے میں اہم چیزوں کو اپنی عملی زندگی میں اولیت دے دیتا ہے۔ لیکن خوف اور دباؤ کی حالت میں ان چیزوں پر کاربند رہنا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اور عاقبت ان چیزوں کو نظر انداز کر دینے میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس صورت حال کو مندرجہ ذیل دائرے کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔



مندرجہ بالا شکل میں اندرونی دائرہ ایسی چیزوں کی نمائندگی کرتا ہے جن سے ہم مانوس ہیں اس میں ایسی جگہیں ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں، ایسے دوست ہیں جن کے ساتھ ہم آسانی محسوس کرتے ہیں اور ایسی سرگرمیاں ہیں جنہیں انجام دیتے ہوئے ہمیں لطف محسوس ہوتا ہے۔ اس حلقے میں ہمیں کسی قسم کا خطرہ درپیش نہیں ہوتا۔ یہ بہت آسان ہے اور یہاں ہم اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتے ہیں۔

اس کے برعکس بیرونی دائرہ ان سرگرمیوں سے عبارت ہے جن میں ہمارے حوصلے، جرات مندی اور جوانمردی کا امتحان ہوتا ہے۔ مثلاً نئے دوست بنانا، بڑے ہجوم کے سامنے تقریر کرنا، ہر قسم کے حالات میں اپنی اقدار پر قائم رہنا اور بیرونی خوف اور دباؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے متعینہ راستے پر گامزن رہنا وغیرہ جیسے کام ایسے ہیں جو خطرات اور چیلنجز سے بھرپور ہیں۔ یہاں ہر وہ شے نظر آتی ہے

جس کی بدولت وقتی طور پر ہم بے سکونی، مشقت اور کلفت محسوس کرتے ہیں۔ اس حلقے میں کئی رکاوٹیں، مزاحمتیں اور الجھنیں ہیں جن پر قابو پانے کے لیے مضبوط قوتِ ارادی درکار ہوتی ہے۔ نیز یہاں نتائج کے حوالے سے بے یقینی اور ناکامی کا خوف بھی ہوتا ہے تاہم مواقع کو حاصل کرنے اور کامیابی کی بلند سے بلند منزلیں حاصل کرنے کی جگہ بھی یہی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم اپنی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں استعمال کر سکتے ہیں۔

کامیاب اور ناکام لوگوں میں بڑا فرق یہی ہے کہ ناکام لوگ اپنی طبیعت کی سہل پسندی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وقتی لذتوں، راحتوں اور آسانیوں کی تلاش میں زیادہ تر وقت اندرونی دائرے میں صرف کرتے ہیں جب کہ کامیاب لوگ اپنے وقتی جذبات و احساسات پر قابو کر اندرونی دائرے کی آسانیوں سے باہر نکل کر زیادہ سے زیادہ وقت بیرونی دائرے کے مشکل اور اہم کاموں کو کرنے میں صرف کرتے ہیں اور نتیجتاً ہر آنے والے دن میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان کی اثر انگیزی کا دائرہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔

اب آئیے! دیکھتے ہیں کہ اس حوالے سے قرآن و حدیث کی تعلیمات کیا ہیں۔

اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں زندگی کی نوعیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ (۱۱)

”بے شک ہم نے انسان کو محنت و مشقت میں زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا کیا“

ایک اور مقام پر فرمایا:

يَأْتِيهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ (۱۲)

”اے انسان! بے شک تو محنت و مشقت چھیلتا ہوا اپنے رب کی طرف رواں رہتا ہے۔ پس تجھے

اُس سے لازماً ملنا ہے“

نیز فرمایا کہ

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۱۳)

”انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ انسان جس میدان میں جس درجے کی کوشش اور جدوجہد کرے گا اُس میدان میں اسی طرح کے نتائج وہ حاصل کرے گا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک اور مقام پر فرمایا

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۗ (۱۴)

”اللہ تعالیٰ اُس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں“

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (۱۵)

”اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اپنے آپ کو نفس کی خواہشات کی پیروی سے روک لیا پس بے شک اُس کا ٹھکانہ جنت ہے۔“

اب نفس کی خواہشات کیا ہیں! وہ تمام کام جن میں ہمیں مزہ آتا ہے اور شریعت نے انہیں نا پسندیدہ قرار دیا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا۔

حجبت النار بالشهوات وحجبت الجنة بالمكاره (۱۶)

”جنہم کو نفس کی شہوتوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے اور جنت کو اُن کاموں سے ڈھانپ دیا گیا ہے جو نفس پر گراں گزرتے ہیں۔“

مطلب یہ کہ جتنا زیادہ انسان نفس کی لذتوں، ذائقوں، چسکوں اور اس کی جائز و ناجائز خواہشات کی تکمیل میں مصروف ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ جنہم سے قریب ہوتا جاتا ہے اور اس کے برعکس وہ کام جو نفس پر بوجھ محسوس ہوتے ہیں اور جنہیں کرنا ہماری طبیعت پر گراں گزرتا ہے اُن کاموں کو کرنے سے انسان جنت کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ ہر روز فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) کے الفاظ دہرائے جانے کا مقصد بھی یہی بتانا ہے کہ نیند جو کہ ہمارے نفس کی خواہش ہے اسے چھوڑ کر نماز جو کہ ہمارے رب کی پکار ہے اُس کی طرف آنا زیادہ بہتر ہے حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجے وقت بڑی خوبصورت نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

ایاک والتنعیم فان عباد الله لیسوا بالمتعمین. (۱۷)

”اپنے آپ کو لذتِ طلبی سے بچانا۔ اللہ کے بندے لذتوں کے عادی نہیں ہوتے۔“

حضور ﷺ نے فرمایا:

الدنیا سبحن المؤمن وجنة الکافر. (۱۸)

”دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت“

مطلب یہ کہ مومن کی زندگی پابند زندگی ہوتی ہے جب کہ کافر ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنی نفسانی خواہشات کے تحت زندگی گزارتا ہے۔

دوسری حدیث میں فرمایا ہے کہ

تحفة المؤمن الموت. (۱۹)

”موت مومن کے لیے تحفہ ہے“

کیونکہ بندہ مومن کے لیے دنیا دارِ الحنن ہے اور آخرت دارِ الازاء۔ موت انسان کو محنت و مشقت والے گھر سے نکال کر جزا والے گھر (جنت) کی طرف لے جانے کا باعث بنتی ہے۔ لہذا مومن کے لیے موت ایک تحفہ ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

ان الله عزوجل يحب معالی الامور. (۲۰)

”اللہ تعالیٰ اعلیٰ امور کو پسند کرتے ہیں۔“

مطلب یہ ہے کہ بندہ مومن کی قیمتی زندگی کا ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔ اسے اعلیٰ درجے کے کاموں میں استعمال ہونا چاہیے نہ کہ ادنیٰ، گھٹیا، نکلے، ردی، فضول اور بیکار کاموں میں ضائع ہونا چاہیے۔

یونہی اعلیٰ اقدار پر اپنے آپ کو کار بند رکھنے کے لیے بھی زبردست مجاہدے کی ضرورت ہوتی

ہے۔ مثلاً حضور ﷺ نے فرمایا۔

ایة المنافق ثلاث. اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف و اذا ائتمن خان. (۲۱)

”منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ بات کرے تو جھوٹ بولتا ہے۔ وعدہ کرے تو پورا نہیں کرتا اور امانت کو ادا نہیں کرتا“

گویا مندرجہ بالا تینوں علامات سے ایک بندہ مومن کو اپنے آپ کو سختی سے پہچانا چاہیے لیکن ہر قسم کے حالات میں سچائی پر کاربند رہنے، وعدہ کو پورا کرنے اور امانت کو پورا پورا ادا کرنا کتنا مشکل ہے اور اس کے مقابلے میں جھوٹ، وعدہ خلافی اور بددیانتی جیسے کام اتنے آسان ہیں۔

اوپر والی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح بلندی کی طرف چڑھنا ہمیشہ محنت و مشقت کا تقاضا کرتا ہے جب کہ پستی کی طرف آنا بہت آسان دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح انسان اگر زندگی کو عروج سے ہم کنار کرنا چاہتا ہے تو اُسے سفلی جذبات، وقتی لذات اور پست خواہشات سے اوپر اٹھ کر اعلیٰ مقاصد کے لیے مسلسل اور متواتر جدوجہد کرنی ہوگی جس کے لیے خانہ نمبر 2 کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنا بہت ضروری ہے۔

دوسرے خانے کے مطابق خود انتظامی

دوسرے خانے کے مطابق اپنے آپ کو منظم کرنے اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں کو بھرپور انداز میں سرانجام دینے کے لیے مندرجہ ذیل تین چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑے گا۔

(i) کرداروں کی شناخت

سب سے پہلے ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے زندگی میں اپنے اہم کرداروں کو تلاش کریں اور معلوم کریں کہ وہ کون کون سی جگہیں ہیں جہاں ہم اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو استعمال میں لاتے ہوئے کوئی مخصوص کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ایسا کردار جو ہمارے سوا اور کوئی سرانجام نہیں دے سکتا۔ مثلاً ہم کسی گھر کے سربراہ ہو سکتے ہیں۔ اس حوالے سے ہماری کچھ مخصوص ذمہ داریاں بھی ہوں گی جنہیں بہر حال ہم نے ہی ادا کرنا ہوگا۔ ہمارے علاوہ کوئی اور شخص ان ذمہ داریوں کو اتنے احسن طریقے سے نہیں سرانجام دے سکتا۔ اسی طرح ہم کسی دفتر میں کسی خاص عہدے پر مامور ہو سکتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی ہمارا ایک مخصوص کردار ہے یا اگر ہم نے کوئی اپنا بزنس شروع کر رکھا ہے تو اُس کے اپنے تقاضے ہیں۔ یہ ہماری دوسری نمایاں حیثیت ہوگی۔ اس طرح ہم کسی مذہبی

رفائی یا فلاحی تنظیم کے کوئی عہدیدار یا رکن بھی ہو سکتے ہیں اور یہ دنیا میں نام سے ہوا اور ادا کرنے کا تقاضا کرے گی۔ علاوہ ازیں سماج کا ایک اہم فرد ہونے کے ناطے ارد گرد کے ماحول اور لوگوں کے حوالے سے بھی ہماری کچھ ذمہ داریاں ہیں جن سے فرار ممکن نہیں ہے اور ان سب سے بڑھ کر ہماری اپنی ذات ہے کہ مندرجہ بالا تمام کرداروں کو بہترین انداز میں سرانجام دینے کے لیے نام سے اپنے وجود کا ہر حوالے سے صحت مند اور بہترین حالت میں ہونا ضروری ہے۔ *قلی هذا القیاس* یعنی نفس کی زندگی میں چار پانچ یا کم و بیش کردار ایسے ہوتے ہیں جہاں اُسے اپنا مخصوص اور منفرد کردار ادا کرتے ہوئے زندگی کی مانگ میں سینور بھرنا ہوتا ہے۔ اور زندگی کی گاڑی رواں دواں رکھنے کے لیے اپنا حصہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ ہر شخص کے لیے کامیاب اور موثر زندگی گزارنے اور دنیا و آخرت میں سرخرو ہونے کے لیے ان مخصوص کرداروں کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔

(ii) اہداف کا یقین

زندگی میں اپنے مخصوص کرداروں کو شناخت کر لینے کے بعد ہمیں اُن کے حوالے سے اہداف کا تعین کرنا ہوگا تاکہ اُن اہداف کو حاصل کرنے کے لیے لائحہ عمل کو تشکیل دیا جاسکے۔ مثلاً ایک شخص اپنے تمام کرداروں کو بہتر انداز میں سرانجام دینے کے لیے اپنی جسمانی، ذہنی، قلبی اور روحانی صلاحیتوں کو بہتر بنانا چاہتا ہے تو اُسے اس حوالے سے متوازن غذا، ورزش، نمینڈ، مطالعہ، غور و فکر عبادات وغیرہ کی طرف توجہ دینا ہوگی اور اُن کے لیے وقت نکالنا ہوگا۔ ایک شخص کسی دفتر کا سربراہ ہے اور وہ اپنے دفتر کے حالات کو مثالی انداز میں چلانا چاہتا ہے تو اُسے لازماً کچھ اہداف طے کرنا ہوں گے اور اُن کے حصول کے لیے لائحہ عمل کا تعین کرنا ہوگا۔ الغرض ہم جو کچھ بھی ہیں ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم جس جس شعبے میں بھی ہیں اُسے کہاں تک پہنچانا چاہتے ہیں اور کون کون سے اہداف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

(iii) شیڈول بنانا

تیسرا اہم کام ہے اپنے اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے نظام الاوقات کا تعین کرنا اور ہر اہم کام کے لیے وقت مقرر کرنا۔ یہ شیڈول ہفتہ وار بنیاد پر بنانا زیادہ موزوں رہے گا۔ روزانہ کی بنیاد پر بنانا ایک دروس ہے اور ماہانہ بنیادوں پر بنانے میں کئی پیچیدگیاں اور قباحتیں ہیں۔ لہذا ہفتہ کو وقت کی ایک مناسب اکائی سمجھتے ہوئے اس بنیاد پر شیڈول بنانا آسان ہے۔ تاہم اسے اپنا یا روزانہ کی بنیاد پر جائے

جماعت کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرنا۔ اس سے انسان زندگی میں بہت زیادہ نظم و ضبط (Displine) آتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جتنا زیادہ انسان اپنی نمازوں کے اوقات منضبط کرتا چلا جاتا ہے اتنا ہی انسان کی دیگر سرگرمیاں نظم و ضبط کے دائرے میں آتی جاتی ہیں۔

(ii) دوسرا ضابطہ ----- اوقاتِ طعام

کھانے پینے کے اوقات مقرر کرنا اور حتی الوسع ان کی پابندی کرنا۔ کھانے پینے کے اوقات کی پابندی سے بھی انسانی زندگی نظم و ضبط کی پابند ہوتی چلی جاتی ہے۔ لہذا زندگی کی سرگرمیوں کو منضبط کرنے کے لیے کھانے پینے کے اوقات کو مقرر کرنا اور حتی الوسع ان کی پابندی کرنا بہت ضروری ہے تاہم یہاں بھی طبیعت کی راحت و آسائش کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے چھٹی والا دن پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔

(iii) تیسرا ضابطہ ----- اوقاتِ منام

سونے جاگنے کے اوقات مقرر کرنا اور حتی الوسع ان کی پابندی کرنا۔ ایسا کرنے سے بھی انسان کی وقت پر گرفت مضبوط ہوتی ہے اور اوقات کو نظم و ضبط کی لڑی میں پرونے میں کافی مدد ملتی ہے۔ بالخصوص رات کو جلد سونے اور صبح کو جلد اٹھنے کی عادت ڈالنا اور اس پر باقاعدگی اور دوام اختیار کرنا انسان کو اپنے آپ کو بہتر طریقے سے استعمال میں لانے پر بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا تینوں ضابطوں کو انسان جتنا زیادہ مضبوطی سے تھام لے گا اتنا ہی بقیہ اوقات کی پابندی آسان ہوتی چلی جائے گی اور شیڈول پر عمل کرنا اور وقت کا بہتر استعمال ممکن ہوتا چلا جائے گا۔
(انشاء اللہ العزیز)

عملی مشورہ جات

تیسری عادت پر بہترین انداز میں عمل پیرا ہونے اور اس سے بطریق احسن استفادہ کرنے کے لیے چند عملی مشورہ جات درج ذیل ہیں۔

۱۔ تیسری عادت کی بنیاد پہلی دو عادتیں ہیں جب تک اُن دونوں کو نہیں اپنایا جائے گا اس سے کماحقہ فائدہ اٹھانا ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا واپس لوٹیں اور پلٹ کر دیکھیں کہ آپ نے اُن دونوں عادتوں کو کس حد تک اپنے دل و دماغ میں اتار لیا ہے اور اپنے کردار اور عمل کا حصہ بنا لیا ہے۔ اس حوالے سے جو کمیاں ہیں انہیں دور کریں۔

۲۔ تیسری عادت میں بطور خاص دو چیزیں شامل ہیں۔

(۱) اقدار کی حفاظت (۲) اوقات کی حفاظت

ان دونوں چیزوں پر کار بند ہونے کے لیے ضبطِ نفس اور قوتِ ارادی کی ضرورت ہے۔ اور قوتِ ارادی کو بڑھانے کا آسان ترین طریقہ ہے اپنی ذات اور دوسروں کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کی پاسداری کرنا۔ لہذا اپنے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ موقع بہ موقع ایسے وعدے کریں جو نبھائے جاسکتے ہوں اور پھر حتی الوسع اُن کی پاسداری کریں۔ اس سے انسان کی قوتِ ارادی مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً صبح کو اٹھنے کے لیے الارم کا وقت بہت سوچ سمجھ کر طے کریں لیکن جو وقت طے کر لیں پھر ہمت سے اُس وقت اٹھ جائیں۔ اس کا آپ کے اپنے تصورِ ذات (Self Image) پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ اور شخصیت میں مضبوطی اور استحکام آئے گا۔

۳۔ کسی فارغ وقت میں بیٹھ کر وقتِ نظر اور باریک بینی کے ساتھ زندگی کا بغور جائزہ لیں کہ وقت کہاں صرف ہو رہا ہے۔ کتنا وقت سستی اور کاہلی کی وجہ سے ضائع ہو رہا ہے اور کتنا وقت ادنیٰ، ردی اور فضول کاموں میں صرف ہو رہا ہے نیز اُس وقت کو کس طرح بچایا جاسکتا ہے یا اُس میں کمی لائی جاسکتی ہے یہ بھی دیکھیں کہ وہ کون کون سے ایسے اہم کام ہیں کہ جن کو کرنے سے زندگی میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں آسکتی تھیں لیکن آج تک انہیں نہیں کیا جاسکا۔ اُن میں سے

کس کس کام کو اب شروع کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ روزانہ صبح کے ابتدائی وقت میں چند منٹ تجدیدِ عزم پر صرف کریں۔ اپنی ذات کے ساتھ عہد کریں کہ آج کا دن بہترین انداز میں استعمال کریں گے۔ اپنے اوقات اور اقدار کی حتی الوسع حفاظت کرنی ہے۔ پھر دن کے اختتام پر چند منٹ کے لیے دن بھر کی کارکردگی کا جائزہ لیں۔ کیا کھویا اور کیا پایا۔ کہاں کہاں پر اپنے کیے گئے فیصلوں پر عمل کیا اور کہاں کوتاہیاں ہوئیں۔ جو مثبت باتیں نظر آئیں ان پر اللہ کا شکر ادا کریں اور جو منفی باتیں نظر آئیں ان پر دل شکستہ اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ توبہ و استغفار کا دروازہ کھلا ہوا ہے سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے دن بھر کی غلطیوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کی معافی مانگیں اور آئندہ کے لیے ان کی اصلاح اور بہتری کا عزم کریں۔

حواشی

- (۱) محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۸۲
- (۲) العنصر، ۱۰۳: ۱، ۲
- (۳) حاکم، المستدرک علی الصحیحین، رقم: ۴۸۳۶، ۳/۳۴۱
- (۴) عباسی، ابن الحسن، متاع وقت اور کاروانِ علم، مکتبہ عمر فاروق، کراچی، ۱۳۴۲ھ، ص ۵۴
- (۵) ایضاً
- (۶) ایضاً، ص ۵۵
- (۷) ایضاً
- (۸) عباسی، ابن الحسن، متاع وقت اور کاروانِ علم، مکتبہ عمر فاروق، کراچی، ۱۳۴۲ھ، ص ۵۵
- (۹) ایضاً، ص ۵۶
- (۱۰) محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۵۸
- (۱۱) البلد، ۳: ۹۰
- (۱۲) الانشاق، ۲: ۸۴
- (۱۳) النجم، ۳۹: ۵۳
- (۱۴) الرعد، ۱۱: ۱۴
- (۱۵) النزعت، ۴۹: ۴۰-۴۱
- (۱۶) بخاری، الصحیح، رقم: ۶۱۲۲، ۵/۲۳۷۹
- (۱۷) بیہمی، نور الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر بن سلیمان (۷۳۵-۸۰۷/۱۳۴۵-۱۴۰۵)، مجمع الزوائد۔ دارالریان للتراث، بیروت، ۱۴۰۷ھ، ۱۰/۲۵۵
- (۱۸) مسلم، الصحیح، رقم: ۲۹۵۶، ۳/۲۲۷۲
- (۱۹) حاکم، المستدرک علی الصحیحین، رقم: ۷۹۰۰، ۳/۳۵۵
- (۲۰) طبرانی، المعجم الاوسط، رقم: ۲۹۴۰، ۳/۲۱۰
- (۲۱) بخاری، الصحیح، رقم: ۳۳/۱، ۲۱

باب دوم

عوامی فتح کے اصول

فصل اول:	جیتنا اور جیتنے دینا
فصل دوم:	پہلے سمجھنا پھر سمجھانا
فصل سوم:	تعاون کا اصول اپنانا

فصل اول:

جیتنا اور جیتنے دینا

اندر سے باہر کی طرف

انگریزی زبان کا ایک مقولہ ہے:

"Man is a Social Animal" (۱)

”آدمی ایک معاشرتی حیوان ہے۔“

مطلب اس قول کا یہ ہے کہ انسانی زندگی ایک اجتماعی زندگی ہے، انفرادی نہیں ہے۔ ہر انسان دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ انسان کے اجتماعیت پسند ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے انسان کی فطرت ہی اس طرح کی بنائی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ گل مل کر رہنے میں تسکین پاتی ہے اور دوسروں سے الگ تھلگ بالکل تنہا رہنے میں وحشت محسوس کرتی ہے (سوائے اُن مخصوص لوگوں کے جو اللہ رب العزت کی محبت کے نشے میں اتنا سرشار ہو جاتے ہیں کہ انہیں جلوتوں سے کہیں زیادہ مزہ خلوتوں میں آتا ہے اور اُن کیلئے عرصہ دراز تک دوسروں سے الگ رہنا کچھ بھی مشکل نہیں رہتا) دوسری وجہ یہ ہے کہ زندگی کے تقاضوں اور لوازمات کی فراہمی کیلئے ہر شخص دوسرے سے بہت سارے لوگوں کا محتاج ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ کتنا ہی باصلاحیت کیوں نہ ہو اپنی زندگی کی ضروریات کو خود پورا نہیں کر سکتا۔ ایک انسان کی ایک دن کی روٹی ہی بے شمار لوگوں کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی حال دیگر ضروریات زندگی کا بھی ہے۔ چنانچہ دوسرے لوگوں سے مل جل کر اجتماعی زندگی گزارنا ہمارا فطری اور طبعی تقاضا بھی ہے اور ہماری بقاء اور ارتقاء کیلئے ضرورت اور مجبوری بھی ہے۔

کامیاب زندگی گزارنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم جس ماحول اور معاشرے میں رہ رہے ہوں اُس سے ہم آہنگ ہوں اور وہ ماحول ہمارا مددگار و معاون ہو، تاکہ ہمارے لئے اپنی صلاحیتوں اور مواقعوں

سے بھر پور استفادہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا آسان ہو۔ اس مقصد کیلئے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ ہمارے مضبوط، پائیدار اور خوشگوار تعلقات کا ہونا ضروری ہے۔ جتنے زیادہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارے تعلقات ٹھوس بنیادوں پر استوار ہوں گے اتنا ہی ہمیں دوسرے لوگوں کا تعاون حاصل ہوگا اور ہمارے لئے اپنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کی صلاحیتوں کو اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کیلئے استعمال کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم نہ ہونے کی صورت میں قدم قدم پر دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارا ٹکراؤ ہوگا اور وہ ہمارے معاون بننے کی بجائے ہمارے راستے میں رکاوٹ بن جائیں گے۔ جس کی وجہ سے ہم نہ تو ان سے مطلوبہ تعاون حاصل کر سکیں گے اور نہ ہی اپنی صلاحیتوں سے بھر پور استفادہ کر سکیں گے۔ نتیجتاً ترقی کی شاہراہ پر تیز رفتاری سے سفر کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں رہے گا۔

ہمارے دین کے اندر باہمی تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے حوالے سے بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور ان کو مضبوط سے مضبوط بنانے کے حوالے سے کئی قیمتی مگر بیان کئے گئے۔ اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ محض دنیوی زندگی کو خوشگوار اور آسان بنانے کیلئے ہی اچھے تعلقات کو برقرار رکھنے پر زور نہیں دیتا بلکہ اس معاملے کو ایمان اور آخرت کی فلاح و بہبود کے ساتھ جوڑ کر اُسے دنیا و آخرت کی سعادتوں اور بھلائیوں کے حصول کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ. (۲)

”بے شک مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں پس تم آپس میں صلح کو قائم رکھا کرو۔“

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُومٌ. (۳)

”بے شک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اللہ کی راہ میں باہم مل کر جہاد کرتے ہیں جیسے

وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔“

اس آیت میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے مومن بندوں کا باہم مل جل کر،

اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس کی راہ میں جدوجہد کرنا بہت پسند ہے۔

حضور نے فرمایا:

المومن مالف ولا خیر فیمن لا یالف ولا یولف. (۴)

”مومن اُلفت و محبت کا پیکر ہوتا ہے اور اُس شخص میں کوئی خیر نہیں ہے جو دوسروں سے محبت نہیں کرتا اور دوسرے اُس سے محبت نہیں کرتے ہیں۔“

مندرجہ بالا ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ دین و دنیا اور آخرت کی سعادتوں کے حصول کیلئے ہمارے لئے بہت ضروری ہے کہ ہم معاشرے سے الگ تھلگ اپنا جزیرہ بنانے کی بجائے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا سیکھیں۔ ہم دوسروں کو محبت دینا جانتے ہوں اور اُن سے محبت لینا جانتے ہوں۔ ہم ہر کسی کے مددگار اور معاون بنے ہوئے ہوں اور دوسری طرف ہمارا سارا ماحول ہمارا مددگار اور معاون بنا ہوا ہو اور اس مقصد کیلئے یہ بھی بہت ضروری ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارے تعلقات نہایت خوشگوار ہوں جن کی بنیاد محبت و مودت، ہمدردی و خیرخواہی اور ایثار و قربانی وغیرہ کے بہترین اصولوں پر قائم ہو۔

”سمجھنے اور ذہن نشین کرنے والی اہم ترین بات یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی اولین بنیاد اپنے آپ پر ضبط حاصل کرنا ہے بالفاظ دیگر تسخیر کائنات کی پہلی شرط تسخیر ذات ہے۔ اپنے آپ پر فتح حاصل کئے بغیر ماحول کو فتح نہیں کیا جاسکتا۔ ذاتی فتح عوامی فتح سے پہلے آتی ہے۔ اجتماعی کامیابی سے پہلے انفرادی کامیابی ضروری ہوتی ہے۔ انفرادی کامیابی پہلی منزل ہے اور اجتماعی کامیابی دوسری منزل۔ جس طرح آپ پہلی منزل کو تعمیر کیے بغیر دوسری منزل تعمیر نہیں کر سکتے اسی طرح ذاتی استحکام اور شخصی تعمیر کے بغیر ماحول اور معاشرے کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم نہیں کر سکتے۔ سرائڈ منڈ ہیلری جنہوں نے دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا، اُن کا ایک نہایت خوبصورت اور بامعنی قول یہ ہے کہ:

”It is not the mountain we conquer but ourselves“ (۵)

”ہم پہاڑ کو فتح نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ کو فتح کرتے ہیں۔“

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ بیرونی دنیا کو فتح کرنے سے پہلے ہم اپنی ذات کو فتح کرتے ہیں اور اپنے آپ پر عبور حاصل کرتے ہیں۔ یہی ذاتی فتح ہی ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم باہر کی دنیا کو فتح

کرنے کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

اس طرح کسی دانشور کا ایک قول کچھ یوں ہے:

”جو شخص اپنے آپ پر فتح حاصل کر لے اُس کے لئے دوسروں پر فتح حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں۔“ (۶)

مندرجہ بالا اقوال کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ تعلقات میں بہتری لانے سے پہلے اپنے آپ کو بہتر کرنا ضروری ہے۔ ماحول اور معاشرے کو مسخر کرنے کیلئے پہلے اپنے آپ کو مسخر کرنا ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی بھی تعلق کا اہم ترین جز یہ ہوتا ہے کہ ہم خود کیا ہیں؟ لہذا اگر ہم دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنانا چاہتے ہیں تو کسی اور جانب دیکھنے سے پہلے ہمیں اپنے آپ پر نظر دوڑانا ہو گی۔ اور اُن کی نظروں میں سچی عزت حاصل کرنے کے لیے زبان سے کہنے یا ظاہر کرنے کی بجائے حقیقتاً وہ کچھ بن کر دکھانا ہوگا۔ اصل عزت نفس اپنے آپ پر عبور حاصل کرنے میں ہے۔ اسی سے خود مختاری حاصل ہوتی ہے اور یہ خود مختاری ہی ہمیں باہمی انحصار کے قابل بناتی ہے جب تک ہم سچی خود مختاری حاصل نہیں کر لیتے، اُس وقت تک انسانی تعلقات میں ترقی حاصل کرنے کے جوہر کی خواہش حماقت ہے۔ ممکن ہے کہ ہم کوشش کریں اور موافق حالات میں ہمیں تھوڑی بہت کامیابی بھی حاصل ہو جائے۔ لیکن جب ناموافق حالات آئیں گے اور وہ ضرور آئیں گے تو ہمارے پاس وہ بنیاد ہی نہیں ہوگی کہ جو چیزوں کو مجتمع رکھ سکے۔

لہذا انفرادی کامیابی سے اجتماعی کامیابی کے میدان میں داخل ہونے کیلئے جس باہمی انحصار کی ضرورت ہوتی ہے اُس کی بنیاد یہ ہے کہ پہلے ہم خود اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہوں اور اپنے وجود کیلئے کسی کے محتاج نہ ہوں۔ خود انحصاری (Self Dependence) ایک معرکہ ہے جبکہ باہمی انحصار (Inter Dependence) ایک ایسا انتخاب (Choice) ہے کہ جو صرف خود مختار لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ تسخیر ذات سے آپ کو خود مختاری میں مدد ملے گی اور آپ کہہ سکیں گے کہ ”میں اپنی ذات کا خود ذمہ دار ہوں اور اپنی تقدیر خود بنا سکتا ہوں“۔ ایسا ہو جانا بہت بڑی کامیابی ہے اور یہ ذاتی فتح ہے۔ بعد ازاں عوامی فتح کا مرحلہ آتا ہے اور عوامی فتح آپ کو باہمی انحصار کے قابل بنائے گی اور آپ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا سیکھیں گے اور کہہ سکیں گے کہ ”میں ایک ٹیم کارکن ہوں۔ میرے پاس بہت قوت ہے اور میں لوگوں

پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہوں“ یہ پہلی سے بھی بڑی کامیابی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

لا یومن احدکم حتی یحب لانیہ ما یحب لنفسہ. (۷)

”تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے (مومن) بھائی کیلئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔“

مندرجہ بالا حدیث مبارکہ میں دوسروں کی ہمدردی اور خیر خواہی کے حوالے سے اپنی ذات کو معیار بنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس حدیث سے یہ حقیقت بھی آشکار ہو رہی ہے کہ دوسروں سے محبت کرنے اور انہیں پسند کرنے کیلئے پہلے اپنے آپ سے محبت کرنی پڑتی ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو ہی پسند نہیں کرتا یا اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے وہ دوسروں کو کیا پسند کرے گا؟ اور اپنی ذات سے محبت، اپنے آپ کو پہنچانے بغیر اور اپنے جوہر کو جلا دیے بغیر نیز ضبط نفس اور پختگی کردار کے بغیر کیسے ہو سکتی ہے؟ اور اگر ہو بھی جائے تو وہ بے بنیاد ہوگی۔ جلدیابدیر ہمارے اندر کا کھوکھلا پن ہماری اپنی نظروں میں اور زمانے والوں کی نظروں میں نمایاں ہو جائے گا۔ اگر ہمارا اپنی ذات پر کنٹرول نہیں ہے اور ہمارے کردار کے اندر مضبوطی اور استحکام نہیں ہے تو ہم کبھی بھی اپنی نظروں میں صحیح معنوں میں عزت نفس کے حامل نہیں بن سکتے۔ سچی عزت نفس پیدا ہی اُس وقت ہوتی ہے جب ہم پورے اعتماد کے ساتھ ضبط نفس اور پختگی کردار کے دو قدموں پر آزادانہ کھڑے ہوں۔ ورنہ ہمارا ضمیر اندر سے ہمیں ملامت کرتا رہتا ہے یا پھر ہمیں ضمیر سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے بے ضمیر بن جانا پڑتا ہے۔ نیز زمانے والوں کی نگاہوں میں بھی ہمارے قول و فعل کا تضاد نمایاں ہوتا رہتا ہے اور اُن کی نظروں میں معزز و محترم بننے کی ہماری کوششوں کو سبوتاژ کرتا رہتا ہے۔

فارسی زبان میں ایک کہاوت ہے جو کچھ یوں ہے:

”کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کبوتر با کبوتر باز باباز“ (۸)

”ایک طرح کے پرندے اکٹھے اڑتے ہیں کبوتر کبوتروں کے ساتھ اور باز بازوں کے ساتھ

پرواز کرتے ہیں۔“

چنانچہ عملی زندگی کے اندر عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس طرح کے انسان ہم خود ہوتے ہیں اسی طرح کے انسانوں کیساتھ ہمارے رابطے اور تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

الْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ (۹)

”خبیثوں کے لئے خبیث اور پاکدامنوں کیلئے پاک۔“

انگریزی زبان کا مندرجہ ذیل محاورہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

A man is known by the Company he keeps

” آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔“

مطلب یہ کہ جس طرح کا آدمی خود ہوتا ہے اسی طرح کے دوست احباب اُسے مل جاتے ہیں یا پھر جس طرح کے دوست احباب کیساتھ کسی کا اٹھنا بیٹھنا ہو اسی سانچے میں وہ ڈھلتا چلا جاتا ہے۔

چنانچہ یہ اصول ہم سب صادق آتا ہے کہ اگر ہم ذاتی نظم و ضبط اور اچھے کردار کے باعث عزت نفس رکھتے ہوئے اپنے قدموں پر آزادی اور اعتماد کیساتھ کھڑے ہوں تو اسی طرح کے لوگ بھی ہماری عزت کرنے اور ہم پر اعتماد کرنے میں زغبت محسوس کریں گے اور یوں باہمی عزت و احترام کی بناء پر ہمارے لئے باہمی اعتماد کا راستہ کھل جائے گا۔ اب یہ انحصار اُن لوگوں کے درمیان ہوگا جو دوسروں کے محتاج اور طفیلی نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے قدموں پر کھڑے باصلاحیت، باکردار، اور خود مختار (Independent) افراد ہوتے ہیں۔ لیکن بلند تر مقاصد اور عظیم تر کامیابیوں کے حصول کیلئے وہ باہم انحصار کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے استعمال میں لائے ہوئے ترقی اور کامیابی کی اُن بلندیوں تک پہنچا جاسکے جہاں تک پہنچنا انفرادی طور پر کسی کیلئے بھی ممکن نہیں ہے۔

پہلی تین عادات کا تعلق شخصی تعمیر اور ذاتی استحکام سے ہے یعنی اپنی ذات کی تسخیر کرنا اور اپنی زندگی کی بھاگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا۔ بالفاظ دیگر اپنے جذبات، احساسات، خیالات اور عادات کا خود مالک بننا۔ یہ چیز انسان کو خود انحصاری تک پہنچاتی ہے جہاں وہ خود مختار اور آزادانہ حیثیت میں خود اعتمادی

اور ضبط نفس کی مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ اگلی تین عادات کا تعلق ماحول کی تسخیر سے ہے۔

ماحول کی تسخیر کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دوسروں کے اوپر قابو پالیں یا غلبہ حاصل کر لیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں ہماری عزت اور احترام ہو۔ وہ ہم پر اعتماد اور اعتبار کر رہے ہوں اور ہماری ہر جائز اور معقول بات کو ماننے پر تیار ہوں نیز مثبت مقاصد کیلئے ہمارے ساتھ تعاون کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو ہماری صلاحیتوں کے ساتھ ملا کر مشترکہ جدوجہد کے لیے بخوشی آمادہ ہوں تاکہ باہمی خوشگوار تعلقات کے ماحول میں ایک باوقار انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے ہوئے اور ایک دوسرے کی صلاحیتوں کو بہترین انداز میں استعمال کرتے ہوئے بلند تر مقاصد اور اعلیٰ اہداف کے حصول کو ممکن بنایا جاسکے۔

جذبائی اکاؤنٹ

اس سے پہلے کہ ہم خود انحصاری سے باہمی انحصار کی منزل کی طرف روانہ ہوں اور عادت نمبر ۴، ۵، ۶ کو بیان کریں باہمی تعلقات کے حوالے سے ایک اہم ترین حقیقت کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے، جسے کامیاب، خوشگوار اور پر اثر تعلقات کی کلید بھی کہہ لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس حقیقت کو جذبائی اکاؤنٹ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ہم سب لوگ جانتے ہیں کہ بینک اکاؤنٹ کیا ہوتا ہے۔ ہم بینک میں اپنے نام کا ایک اکاؤنٹ کھلواتے ہیں اور اُس میں "وقتاً فوقتاً" رقم جمع کرواتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت وہ ہمارے کام آسکے۔ جتنی زیادہ رقم ہمارے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی چلی جاتی ہے اسی کی مناسبت سے ہمارے اندر معاشی حوالے سے تحفظ اور اعتماد کا لیول بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر وقت آنے پر ہم آسانی کے ساتھ مطلوبہ رقم نکلا کر اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جتنے بھی لوگ ہمارے ساتھ مختلف حیثیتوں سے منسلک ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہمارا ایک جذبائی اکاؤنٹ کھلا ہوتا ہے۔ ہم اپنے روزمرہ کے برتاؤ اور طرز عمل کے ذریعے اس اکاؤنٹ میں رقم جمع کرواتے یا نکلاواتے رہتے ہیں جو ہم باہمی تعلقات کے اس اکاؤنٹ میں ڈیپازٹس جمع کرواتے ہیں تو تعلقات مضبوط ہو جاتے ہیں اور جب ہم رقم نکلاواتے ہیں تو تعلقات میں کمی آ جاتی ہے اور اعتماد کی سطح نیچے آ جاتی ہے۔ مضبوط اور صحت مند تعلق طویل عرصہ تک مسلسل سرمایہ جمع کروانے کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ یہاں جس جذبائی اکاؤنٹ کی بات کی جا رہی ہے وہ ایک تشبیہاتی اکاؤنٹ ہے جس کا وجود ہمارے ذہنوں میں

ہوتا ہے اور رقم سے مراد روپیہ پیسہ نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارا رویہ (Behaviour) ہے جو مختلف مواقع پر ہم ظاہر کرتے ہیں۔

عربی زبان میں ایک مقولہ ہے:

قیمتہ المرء ما یحسنة.

” آدمی کی قدر و قیمت اُس کے محاسن ہیں۔“

یہ قول بڑے ہی بامعنی انداز میں بتا رہا ہے کہ دوسرے لوگوں کی نظروں میں ہماری قدر و منزلت کا دار و مدار ہماری خوبیوں (محاسن) پر ہوتا ہے پھر ان خوبیوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم تو ہماری ذاتی خوبیاں ہیں جن کا تعلق ہماری شخصیت اور کردار سے ہے۔ پہلی تین عادات ذاتی محاسن کو پیدا کرنے کے حوالے سے ہی ہیں۔ ذاتی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں دوسرے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور اچھے برتاؤ والی خوبیوں کو بھی اپنانا ہوگا۔ ورنہ لوگوں کے دلوں میں ہمارے لئے سچی عزت و احترام کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہم اپنی ذات میں کتنے ہی منظم، مضبوط، اور مستحکم ہوں لیکن تکبر اور خود پسندی کا شکار ہو کر دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھتے ہوں اور اُن کے ساتھ ہمارا رویہ تنگ آمیز ہو، تو پھر ہماری تمام تر خوبیوں کے باوجود لوگوں کے لیے دل کی گہرائیوں سے ہماری عزت کرنا ممکن نہیں ہوگا اگرچہ وقتی طور پر بظاہر کسی مجبوری یا مصلحت کی بنا پر وہ ہمیں سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہوں۔

اسلام کی تعلیمات میں دوسروں کے ساتھ حسن سلوک، ایثار و قربانی، محبت و مودت، ہمدردی و خیر خواہی، نفع بخشی و فیض رسانی، عفو و درگزر وغیرہ کی جتنی بھی ہدایات دی گئی ہیں وہ ساری کی ساری باہمی تعلقات کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے اور جذباتی اکاؤنٹ میں بڑے بڑے ڈیپارٹس جمع کروانے کا زبردست ذریعہ ہیں اس کے برعکس حسد، بغض، کینہ، تکبر، لالچ، بخل، غصہ، نفرت اور انتقام وغیرہ جیسی جن چیزوں سے روکا گیا ہے وہ سب کی سب جذباتی اکاؤنٹ میں سے بڑی بڑی رقمیں نکال کر تعلقات میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔ ذرا غور کریں کہ اسلام کس قدر خوبصورت دین ہے جو اخروی زندگی میں سعادت کے حصول کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی کو بھی کس قدر خوشگوار بنا دیتا ہے اور اس کی تعلیمات کو دل و جان سے اپنالیا جائے تو دنیا ہی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ گویا اسلام کے سنہری اصولوں پر عمل کرنے کی بناء پر انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخرو ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نظروں میں بھی محبوب بنا چلا

جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس ان اصولوں کی خلاف ورزی پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا مجرم بننے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نظروں میں بھی اپنا وقار اور مرتبہ کھو دیتا ہے۔

جذبائی اکاؤنٹ کے اہم ڈیپازٹس

ہم صبح سے لیکر شام تک دوسرے لوگوں کے ساتھ جو طرز عمل اپنا رہے ہوتے ہیں اُس کے ذریعے کہیں جذبائی اکاؤنٹ میں رقم جمع کروا رہے ہوتے ہیں اور کہیں نکال رہے ہوتے ہیں۔ ان رقوم کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چھ بڑی رقوم یہاں بیان کی جا رہی ہیں جو تعلقات کو بنانے یا بگاڑنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

(i) فرد کو سمجھنا

دوسرے شخص کو حقیقی معنوں میں سمجھنے کی کوشش کرنا ایک بہت بڑی رقم ہے جو ہم جذبائی اکاؤنٹ میں جمع کروا سکتے ہیں ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے ایک انفرادیت عطا فرما رکھی ہے۔ اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اُس کے رنجانات، میلانات، ترجیحات اور پسند و ناپسند کو دوسرے لوگ جانیں اور اُن کا احترام کریں۔ ہمارا حال یہ ہوتا ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کو اپنے آپ پر قیاس کرتے ہوئے اپنے افکار و خیالات اور عقائد و نظریات کی روشنی میں تشریح کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک چیز ہمارے لئے اہم ہو مگر وہ کسی دوسرے کیلئے بالکل ہی اہم نہ ہو یا ایک چیز ہمیں پسند ہو اور دوسرے کو بالکل ہی ناپسند ہو۔ اگر ہم دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنا چاہتے ہوں تو ہمیں اُن کی دلچسپیوں اور میلانات کو سمجھنا ہو گا۔ اور اُس کے مطابق ہی اُن کے ساتھ معاملہ کرنا ہو گا۔ ذیل کارنیگی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب

"How to win friends and influence people"

میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے جو اصول بیان کئے ہیں اُن میں سے دو یہ ہیں: (۱۰)

۱۔ دوسرے شخص کو اُس کی اپنی ذات کے متعلق گفتگو کرنے پر آمادہ کرنا۔

۲۔ اُن موضوعات پر گفتگو کرنا جو مخاطب کے لئے دلچسپ ہوں۔

ایک حدیث پاک میں صحابہ کرام کا ایک قول یوں بیان کیا گیا ہے:

امرنا ان نکلم الناس علی قدر عقولہم۔ (۱۱)

”ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اُن کی عقلوں کے مطابق گفتگو کریں۔“

نیز حضور ﷺ کے کندھے کے ساتھ ٹیک لگا کر حضرت عائشہ ز کا پتلی تماشہ دیکھنا اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ حضور ﷺ اپنے متعلقین پسند اور اُن کے مزاج کا کس حد تک لحاظ رکھا کرتے تھے اس شرط کے ساتھ کہ کوئی بات حدود اللہ کے خلاف نہ جارہی ہو۔ اس حوالے سے زیادہ تفصیل سے گفتگو آگے چل کر عادت نمبر ۵ میں ہوگی کہ وہ عادت اسی نکتے سے متعلق ہے۔

(ii) جزئیات پر توجہ دینا

اجتماعی زندگی میں اور باہمی تعلقات میں بظاہر چھوٹی دکھائی دینے والی چیزیں حقیقتاً بہت اہم ہوتی ہیں۔ دوسروں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی مہربانیاں بڑی بڑی رقوں کے جمع ہونے کا سبب بن جاتی ہیں اور اس کے برعکس ان کو نظر انداز کرنے سے بعض اوقات بڑی رقیں نکل جاتی ہیں۔ مثلاً کسی کی خوشی یا غمی کے مواقع پر شرکت کرنا، کسی کی کامیابی پر اُسے مبارکباد دینا وغیرہ۔ اس طرح کی معمولی باتوں کا خیال رکھنا تعلقات کو مضبوط سے مضبوط تر بناتا چلا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس کرنے سے شکایات پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں جو بڑھتے بڑھتے تلخیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ حضور ﷺ نے خندہ پیشانی سے بھی ملنے کو بھی صدقہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح آقا ﷺ کا معمول تھا کہ جب کسی سے سلام لیتے تو مکمل طور پر اُس کی طرف متوجہ ہوتے اور مصافحہ کرنے کی صورت میں جب تک اگلا ہاتھ نہ چھوڑتا آپ ﷺ نہ چھڑاتے۔ یہ بظاہر معمولی دکھائی دینے والی باتیں دوسروں کے دلوں کو موہ لینے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ دراصل جذباتی اکاونٹ انسان کے دل میں کھلتا ہے اور دل بہت ہی نازک ہوتا ہے اُردو کے نامور شاعر نے اہل دل کو یہ مشورہ دیا:

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم

انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آگینوں کو (۱۲)

ابو انیس صوفی برکت کے بقول:

”دل کی دنیا میں جو مقام دل نوازی کو حاصل ہے کسی اور عمل کو حاصل نہیں“ (۱۳)

چنانچہ اسلام کے اندر دوسروں کی دلجوئی کو ایک انتہائی اعلیٰ درجے کی نیکی قرار دیا گیا ہے اور دل آزاری کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

من قضی لاحد من امتی حاجة یرید ان یرہ فقد سرنی و من سرنی فقد سر
الله و من سر الله ادخله الله الجنة. (۱۴)

”جس شخص نے میرے کسی امتی کی حاجت روائی کی، اس نیت سے کہ وہ خوش ہو جائے تو اُس نے مجھے خوش کر دیا اور جس نے مجھے خوش کیا اُس نے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا تو اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل کرے گا۔“

ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے بقول:

”گناہ اور معصیت کے کاموں کو چھوڑ کر مخلوق کی رضا مندی میں ہی خالق کی رضا مندی ہے۔“ (۱۵)

(iii) وعدے کی پابندی

جب کوئی شخص ہمارے ساتھ وعدہ کرے بطور خاص کوئی ایسا وعدہ جس کا تعلق ہماری کسی بنیادی ضرورت سے ہو تو ہمیں اس حوالے سے ایک توقع لگ جاتی ہے اور اُمید قائم ہو جاتی ہے۔ پھر اگر وہ شخص اس وعدے کو من و عن پورا کر دے تو ہماری نظروں میں اُس کا اعتبار اور وقار بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ وقت آنے پر وعدے کی خلاف ورزی کرے تو ہماری نظروں میں اُس کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے۔ اور ہمارے ذہن میں اُس کے اکاؤنٹ میں اعتماد کی جو رقم جمع تھی وہ کم ہو جاتی ہے۔ اگر وہ مختلف اوقات میں وعدہ خلافی کرے تو یہ اعتماد کا لیول تقریباً صفر پر آ جاتا ہے۔ اور آئندہ ہم اُس کے کسی وعدے پر اعتبار کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ ہی سب کچھ بعینہ اُس وقت بھی ہوتا ہے جب ہم دوسروں کے ساتھ وعدہ کرنے کے توڑ دیتے ہیں۔ جب ہم کسی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کرتے ہیں۔ تو اُس کی نظروں میں اپنے اکاؤنٹ کافی رقم جمع کروا دیتے ہیں۔ اور جب ہم وعدہ توڑتے ہیں تو کافی رقم نکالوا لیتے ہیں۔

جب ہم کسی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ توڑتے ہیں تو یہی نہیں کہ اُس کی نظروں میں اپنے آپ کو گراتے ہیں بلکہ خود بھی اپنی نظروں میں گر جاتے ہیں اور ہمارا تصور ذات (Self Image) مجروح ہوتا

ہے بات یہاں تک ہی نہیں رہتی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اللہ اور رسول ﷺ کی بارگاہ میں بھی ہمارا مرتبہ گھٹ جاتا ہے۔ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے بندوں کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وَالَّذِينَ هُمْ لَا مُّٰثِبَهُمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ (۱۶)

”اور وہ لوگ اپنی امانتوں اور وعدوں کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں“

اور دوسری طرف حضور ﷺ نے فرمایا:

لَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ (۱۷)

”جو وعدے کی پابندی نہیں کرتا اُس کا کوئی دین نہیں ہے۔“

غور کریں کہ وعدہ خلافی کے دنیا سے لیکر آخرت تک کتنے نقصانات ہیں۔ وعدہ خلافی ہمیں اپنی نظروں میں بھی گرا دیتی ہے، لوگوں کی نظروں میں بھی ہمارا وقار ختم کر دیتی ہے اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں بھی ہمیں مجرم بنا دیتی ہے۔ لہذا ہمارے لئے بہت ضروری ہے کہ ہم بہت سوچ سمجھ کر وہی وعدہ کیا کریں جس کے متعلق ہمیں یقین ہو کہ ہم پورا کر لیں گے۔ اور پھر حتیٰ الوسع اُسے پورا کرنے کی کوشش کیا کریں۔ اگر کسی بہت مجبوری کی صورت میں وعدہ کو پورا کرنا ممکن ہی نہ دکھائی دے رہا ہو تو پھر فریق ثانی کو قبل از وقت آگاہ کر دیں۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو بعد ازاں اپنی مجبوری بیان کر کے اُس سے معذرت کر لینی چاہیے تاکہ باہمی اعتماد کے لیول کو نقصان نہ پہنچے۔

(iv) حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین

اجتماعی زندگی میں یہ بات بہت ضروری ہے کہ ہر کسی کو اپنے حقوق اور فرائض کا علم ہو۔ کسی گھر، دفتر یا تنظیم وغیرہ میں جہاں بھی چند افراد مختلف حیثیتوں میں کام کر رہے ہوں تو ہر کسی کے ذہن میں واضح ہونا چاہیے کہ اُس کی ذمہ داری کیا ہے اور اُس کے حقوق کیا ہیں؟ ایسا نہ ہونے کی صورت میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بعد ازاں نفرتوں اور عداوتوں میں بدل جاتی ہیں۔ ہمارے بہت سارے باہمی جھگڑوں کی بنیاد بھی یہی چیز بنتی ہے ہم اپنے ذہن میں دوسروں سے بہت سی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں پھر جب ہماری توقعات پوری نہیں ہوتیں تو ہمارے ذہن میں نفرت و عداوت کے جذبات پیدا ہوتے

ہیں جو کہ اجتماعیت کی روح کیلئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جس طرح کھیل میں ضروری ہوتا ہے کہ ہر کھلاڑی کو معلوم ہو کہ وہ کس پوزیشن میں کھیلے گا۔ مثلاً فٹ بال یا ہاکی میں وہ گول کیپر ہوگا یا سینٹر فارورڈ، لیفٹ ان ہوگا یا لیفٹ آؤٹ وغیرہ ہوگا ایسا نہ ہونے کی صورت میں بڑی آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ ٹیم کا انجام کیا ہوگا۔ اسی طرح بہت ضروری ہے کہ باہمی انحصار کی صورت میں ہر فریق کو حقوق اور ذمہ داریوں کا علم ہوتا کہ نہ تو وہ دوسروں سے غلط توقعات وابستہ کرے اور نہ ہی اپنے حوالے سے کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ نیز دوسرے بھی اُس سے غلط توقعات وابستہ نہ کریں۔ حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین بہت سے ایسے جھگڑوں سے بچاتا ہے جس کے باعث خاندانوں کے شیرازے بکھر جاتے ہیں، تنظیموں میں انتشار و افراق پیدا ہوتا ہے اور چلتے ہوئے کاروبار تباہ و برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

کلم راع و کلم مسئول عن رعیتہ. (۱۸)

”تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور اُس سے اُس کی ذمہ داری کے متعلق پوچھا جائے گا۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ جس بھی جگہ پر جس بھی حیثیت میں ہے اُس کے اوپر کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن کو پورا کرنا اُس پر لازم ہوتا ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو بطریق احسن سرانجام دینے کی کوشش کرے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں، اپنے اردگرد کے ماحول کی نظروں میں اور خود اپنی نظروں میں بھی سرخرو ہو جائے۔ جب ہر شخص اپنے فرائض دیا ننداری سے ادا کرے گا تو دوسروں کے حقوق خود بخود ادا ہوتے جائیں گے اور کسی کو اپنے حقوق مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی اور یوں معاشرے میں ہر طرف امن و سکون ہوگا اور باہمی تعلقات خوشگوار ہوں گے۔ ہمارے ہاں بد قسمتی سے عمومی رجحان یہ بن چکا ہے کہ ہر شخص کی نظریں اپنے حقوق پر مرکوز ہیں کہ مجھے فلاں فلاں مراعات ملنی چاہئیں مگر اس حوالے سے سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی جاتی کہ میرے فرائض کیا ہیں اور کیا میں اُن کو واقعی درست طریقے سے ادا کر رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تقریباً ہر سرکاری و پرائیویٹ محکمے میں ”تخلف حقوق“ کی انجمنیں تو بے شمار نظر آتی ہیں مگر کوئی ایسی تنظیم دکھائی نہیں دیتی جس کا مقصد ”ادا بیگی فرائض“ ہو۔ یہ مزاج ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور بہت

سارے جھگڑوں اور فساد کا سبب بنتا ہے۔

(۷) دیانت داری

انگریزی زبان میں ایک مشہور قول ہے:

Honesty is the Best Policy^(۱۹)

”دیانت داری بہترین حکمت عملی ہے“

اس قول کے اندر جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ ہر زمانے میں دو جمع دو چار کی طرح اٹل ہے۔ ماحول اور معاشرے میں ہماری قدر و منزلت کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم کس حد تک راست باز اور دیانتدار ہیں۔ ہماری دیانتداری سے ہی دوسروں میں ہمارے متعلق اعتماد پیدا ہوتا ہے جو جذباتی اکاؤنٹ میں گراں قدر اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اس کے برعکس اس صفت کی عدم موجودگی میں ہمارا یہ اکاؤنٹ اکثر و بیشتر ”جمع“ کی بجائے ”اخراج“ کی حالت میں رہتا ہے، مثلاً ہم اپنے ارد گرد کے افراد کو سمجھنے کی کوشش بھی کریں، ان کی دلجوئی کا حتی الوسع خیال بھی رکھیں۔ ان سے کئے جانے والے وعدوں کو بھی ہر ممکن پورا کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے حقوق سے تجاوز بھی نہ کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اگر ہمارے ظاہر و باطن میں تضاد ہے اور ہماری شخصیت میں دوغلا پن ہے تو ہم سب کچھ کرنے کے باوجود بھی دوسروں کے ساتھ باہمی اکاؤنٹ میں اعتماد کا خزانہ بھرنے میں ناکام رہیں گے۔

ہمارے ہاں ایک کہاوت یوں بیان کی جاتی ہے کہ ”بد اچھا بد نام بُرا“ (۲۰) مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں ہمارا جو شخص بنتا ہے اسی کے مطابق وہ ہمارے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کے بارے میں یہ تاثر ہو کہ وہ چوری کرتا ہے، جب کوئی چیز چوری ہو جائے تو لامحالہ اُس کی طرف دھیان جاتا ہے اور اُس سے پوچھا جاتا ہے۔ وہ اگر کہے کہ میں نے چوری نہیں کی اور وہ سچ بول بھی رہا ہو تو پھر بھی ہمارا اُس پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ اور یوں ہمارے ذہن میں اُس کے جذباتی اکاؤنٹ میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جسے ہم نے اکثر معاملات میں دیانت دار پایا ہو اور دیانتداری اُس کی فطرت ثانیہ بن چکی ہو اُس سے اول تو ہمیں پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ اُس نے چوری کی ہے کہ نہیں۔ لیکن اگر کبھی رسماً یا کسی قانونی تقاضے کے تحت پوچھ بھی لیا جائے اور وہ

چوری کا انکار کر دے تو ہم پورے اعتماد کے ساتھ اُس کی بات پر یقین کر لیتے ہیں۔ اور یوں ہماری نظروں میں اُس کے اکاؤنٹ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی حالانکہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے چوری کی ہی ہو۔ دراصل دائمی دیانتداری اور وقتی دیانتداری میں بہت فرق ہے اور اس فرق کو لفظی جامہ پہنایا جائے یا نہ پہنایا جائے یہ ہمارے باہمی تعلقات میں اہم کردار ادا کرتا رہتا ہے۔ ہمارے دین کے اندر دیانتداری اور راست بازی کے اس شخص کو برقرار رکھنے کی تاکید کی گئی ہے کہ ہمیں اپنی تمام حرکات و سکنات میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ دوسروں کی نظروں میں ہمارا شخص خواہ مخواہ مجروح نہ ہونے پائے۔ حضور ﷺ کا بندہ مومن کو تہمت والے مواقع سے بچنے کا حکم دینا نیز آپ ﷺ کا رات کے وقت اپنی ایک اہلیہ کے ساتھ جاتے ہوئے پاس سے گزرنے والے شخص کو روک کر وضاحت کرنا کہ میرے ساتھ جانے والی عورت میری بیوی ہے کوئی غیر نہیں ہے، اس نکتے کی بڑی واضح مثالیں ہیں۔

دیانتداری کا مطلب ہے کہ ہمارا کردار بالکل صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ اُس میں کوئی داغ اور دھبہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے قول و فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے ظاہر اور باطن میں ہم آہنگی اور یکسانیت ہونی چاہیے۔ ہمازی سیرت جھوٹ، منافقت، دھوکہ دہی وغیرہ جیسی بُری خصلتوں سے پاک ہونی چاہیے اور ہمیں سچائی، راست بازی اور بلندی کردار کے اُس مرتبے پر ہونا چاہیے کہ لوگ آنکھیں بند کر کے ہم پر اعتماد کر سکیں۔

(vi) مخلصانہ معافی مانگنا

انسان خطا کا پتلا ہے لہذا اس سے غلطی ہو جانا کوئی بُری بات نہیں ہے یہ اعزاز صرف انبیاء کرام کو حاصل ہے کہ وہ معصوم عن الخطا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عام لوگوں جیسی غلطیوں اور خطاؤں سے محفوظ رکھا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں کوئی بندہ کتنا ہی دانشور ہو وہ کہیں نہ کہیں غلطی کر سکتا ہے۔ غلطی کا ہو جانا زیادہ خطرناک بات نہیں ہے لیکن غلطی کو ماننے سے انکار کرنا اور اس پر اصرار کرنا یہ غلطی کے ساتھ سرکشی کا اضافہ کرنا ہے۔ جہاں تک غلطی کا تعلق ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی قابل معافی ہے اور بندوں کے ہاں بھی قابل معافی ہے۔ لیکن غلطی کے ساتھ سرکشی کا اضافہ اسے ناقابل معافی بنا دیتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان کا قصہ اس کی بڑی واضح مثال ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام

سے ایک لغزش ہوگئی جس کے اندر خود قرآن کے بقول ان کے عزم اور ارادے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے معافی مانگی تو اللہ تعالیٰ نے معاف بھی کر دیا اور خلافتِ ارضی کا تاج بھی پہنا دیا۔ دوسری طرف شیطان نے سجدہ کا انکار کر کے غلطی کی۔ پھر بجائے اُسے تسلیم کرنے اور اُس پر معذرت کرنے کے وہ اُسے درست ثابت کرنے پر دلائل دینے لگا۔ یہ غلطی کے ساتھ سرکشی کا اضافہ تھا جس نے اُس کے جرم کو ناقابلِ معافی بنا دیا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رائدہ درگاہ بنا دیا گیا۔

روزمرہ کی زندگی میں سماجی تعلقات کے دوران ہم سے جگہ جگہ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، جن کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔ کہیں ان غلطیوں میں کسی نہ کسی درجے میں ہمارے ارادہ و اختیار کا بھی عمل دخل ہوتا ہے، کہیں لاپرواہی اور بے احتیاطی ہوتی ہے اور کہیں سہو و خطا ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب بھی ہم کسی کے ساتھ دانستہ یا نادانستہ طور پر غلط رویہ اختیار کرتے ہیں تو اُس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اور یہ چیز باہمی تعلقات کے جذباتی اکاؤنٹ میں غلطی کی شدت اور نوعیت کی مناسبت سے رقم نکلوانے کا باعث بن جاتی ہے۔ اور دوسرے شخص کی نگاہوں میں ہماری قدر و منزلت کو کم کر دیتی ہے۔ پھر اگر ہم اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے دوسرے سے مخلصانہ معافی مانگ لیں تو وہ رقم دوبارہ جمع ہو جاتی ہے اور اعتماد کا سابقہ درجہ بحال ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم معافی بھی نہ مانگیں اور آئندہ بھی اپنے غلط طرزِ عمل کو دہراتے رہیں تو پھر یہ چیز تعلقات کو خراب سے خراب تر کرتی چلی جاتی ہے اور بالآخر نوبت تعلقات کے مکمل خاتمے تک پہنچ جاتی ہے اور کبھی یہاں تک بھی ہوتا ہے کہ دوستی دشمنی میں بدل جاتی ہے۔

کردار سے عاری اور اندرونی طور پر عدم تحفظ کا شکار لوگ غلطی کا اعتراف کرنے اور اُس پر معافی مانگنے کو اپنی کمزوری سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح دوسروں کی نظروں میں اُن کا مرتبہ گھٹ جائے گا اور وہ اُن کے مقابلے میں کمزور ہو جائیں گے اور دوسرے اُن کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھالیں گے۔ اُن کے احساسِ تحفظ کی بنیاد چونکہ دوسروں کی آراء پر کھڑی ہوتی ہے، لہذا انہیں یہ فکر لگی رہتی ہے کہ معافی مانگنے کی صورت میں لوگ کیا سوچیں گے، حالانکہ یہ اُن کی خام خیالی ہے۔ حقیقت اس کے بالکل ہی برعکس ہے جب انسان خلوص دل سے اپنی غلطی پر دوسروں سے معافی مانگتا ہے تو وہ خود بھی اپنے آپ کو پہلے سے بہتر محسوس کرتا ہے اور دوسروں کی نظروں میں بھی اُس کا مرتبہ گھٹنے کی بجائے بڑھ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی اُس کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا یہ

ہے کہ:

من تواضع لله رفعه الله. (۲۱)

”جو اللہ کے لئے عاجزی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے بلندی عطا فرمادیتا ہے“

عام لوگوں کے برعکس اعلیٰ کردار اور مضبوط و مستحکم شخصیت کے مالک لوگ اپنی غلطی کو تسلیم کرنے اور اُس پر معذرت کرنے میں قطعاً ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ وہ اپنی ابا، مقام و مرتبے اور اپنی کم حوصلگی کو بالکل نہیں آڑے آنے دیتے۔ اُن کو اس چیز کی قطعاً پرواہ نہیں ہوتی کہ اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے پر دوسرے لوگ اُن کے متعلق کیا سوچیں گے۔ اُن کے اندرونی تحفظ کا احساس اپنی ذاتی قدر و قیمت اور اپنی مضبوط اقدار پر قائم ہوتا ہے نہ کہ دوسرے لوگوں کی آراء پر۔ چنانچہ اول تو وہ حتی الوسع ایسی غلطیوں کے ارتکاب سے گریز کرتے ہیں جن سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ تاہم اگر اتفاقاً ایسا ہو جائے تو وہ فوراً ہی احساس ہونے پر اپنی غلطی کو تسلیم کر لیتے ہیں اور اُس پر معافی مانگ لیتے ہیں اور یوں دوسروں کی نظر میں اُن کا مقام گھٹنے کی بجائے پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ اس کی بڑی خوبصورت مثال ہے کہ اُنہوں نے ایک مرتبہ حق مہر کی حد پر پابندی عائد کرنا چاہی تو مجمع عام میں سے ایک عورت نے اُٹھ کر قرآن مجید کی ایک آیت سے استدلال کرتے ہوئے اُس پابندی کو بلا جواز قرار دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر المومنین ہونے کے باوجود اپنے مقام و مرتبے کو ایک طرف رکھتے ہوئے مجمع عام میں اپنی رائے سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا:

امراة اصابت و رجل اخطا. (۲۲)

”عورت صحیح نتیجے پر پہنچ گئی اور مرد غلطی کر گیا۔“

ہم میں سے کوئی شخص بھی کسی بھی حوالے سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برابر یا اُن سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ لہذا ہمیں اپنے آپ کو ہر قسم کی غلطیوں اور لغزشوں سے منزہ و مبرا سمجھنے کی روش ترک کر دینی چاہئے اور اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف اور اُن کے حوالے سے معذرت کر لینے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے تاکہ دوسروں کے ساتھ ہمارے خوشگوار تعلقات نہ صرف برقرار رہیں بلکہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتے رہیں۔

چوتھی عادت کا مفہوم

انسانی تعلقات میں مضبوطی و استحکام اور انہیں خوشگوار بنانے کے چند عمومی اصول بیان کرنے کے بعد اب ہم تسخیر کائنات کے سفر کی طرف روانہ ہو رہے ہیں جس کا آغاز عادت نمبر ۴ سے ہوتا ہے۔ اور عادت نمبر ۴ کا عنوان ہے۔ ”جیتنا اور جیتنے دینا“

اسلام کے اندر اجتماعیت پر جتنا زور دیا گیا ہے اتنا شاید ہی دنیا کے کسی اور مذہب میں دیا گیا ہو۔ ہر نماز کی ہر رکعت میں لازمی طور پر پڑھی جانے والی سورہ فاتحہ کے مفہوم پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ایک بندہ مومن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے صرف اپنے لئے ہی خیر اور بھلائی نہ مانگے بلکہ دوسروں کے لئے بھی مانگے۔ یہی نہیں بلکہ قرآن و حدیث میں آنے والی بیشتر دعاؤں میں جمع کا صیغہ ہی استعمال کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلمان کو اپنی ذات کے تنگ حصار سے باہر آ کر تمام انسانوں کی خیر اور بھلائی کے متعلق سوچنا چاہیے۔ حضور ﷺ نے ایک صحابی کو دعا میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے سنا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو محدود نہ کرو۔ مطلب یہ تھا کہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی رحمت کا سوال کرو۔ اس بات کو مزید سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل حدیث پر غور کریں۔

الدین النصيحة قلنا لمن قال لله ولرسوله ولكتابه والائمة المسلمين و
لعامتهم. (۲۳)

”دین خیر خواہی ہے۔ ہم نے پوچھا کس کے لئے؟ فرمایا اللہ کے لئے، اُس کے رسول کیلئے، اُس کی کتاب کیلئے، مسلمانوں کے آئمہ کے لئے اور عام مسلمانوں کیلئے۔“

مذکورہ بالا حدیث میں ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی کا مفہوم جداگانہ ہے۔ تاہم ہمارے زیر بحث موضوع سے متعلقہ جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول ﷺ کے صحابہ کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ. (۲۴)

”محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کافروں (اللہ اور اُس کے دین

کے دشمنوں) کے ساتھ بڑے سخت ہیں اور آپس میں بہت رحمدل ہیں۔“

علامہ اقبالؒ نے اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن (۲۵)

ہمیں ہر ملاقات کے وقت بات چیت کا آغاز اسلام علیکم سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا فلسفہ یہی ہے کہ جب ایک بندہ دوسرے کو السلام علیکم کہتا ہے تو گویا وہ اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ میرے سینے میں تمہارے لئے سلامتی، ہمدردی اور خیر خواہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یعنی میں ہر حال میں تمہاری بھلائی چاہنے والا (well-wisher) ہوں۔ یہی عادت نمبر ۴ ہے۔

عادت نمبر ۴ کہتی ہے کہ روزمرہ کے معاملات میں ہمیں فقط اپنے نفع کے متعلق نہیں سوچنا چاہئے بلکہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے فائدہ کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ صرف اپنے حوالے سے سوچنا اور دوسروں کو نظر انداز کرنا خود غرضی، حرص اور لالچ کے رجحان کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس روش کو اسلام میں سختی سے ناپسندیدہ کیا گیا ہے۔ خود غرضی والی ذہنیت کے ساتھ دوسروں کے ساتھ کبھی بھی مضبوط اور پائیدار تعلقات معرض وجود میں نہیں آسکتے۔ اس عادت کو اگر خوشگوار تعلقات کی جڑ کہا جائے تو قطعاً مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ جس طرح درخت سے پھل حاصل کرنے کیلئے اُس کا آغاز جڑ سے کرنا ہوگا، اسی طرح اجتماعی زندگی کی برکات و ثمرات سے مستمتع ہونے کیلئے اس کا آغاز عادت نمبر ۴ سے کرنا ہوگا۔

معاشرتی زندگی کے عمومی رویہ جات

”جیتنا اور جیتنے دنیا“ کسی وقتی اور عارضی تکنیک یا حکمت عملی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ سوچ اور فکر کی ایک مخصوص کیفیت کا نام ہے۔ یہ ایک خاص مزاج، رویہ اور عادت کا نام ہے جس کا حامل شخص محض اپنے ذاتی مفادات، خواہشات اور اپنی انا کا قیدی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی ذات سے اوپر اُٹھ کر ہر کسی کا ہمدرد اور خیر خواہ ہوتا ہے اور اپنے مفادات کے ساتھ ساتھ دوسروں کے مفادات کا بھی خیال رکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ ایسے نفع پر لعنت بھیجتا ہے جو دوسروں کے نقصان کی قیمت پر حاصل کیا گیا ہو۔ اس بات کی مزید وضاحت کیلئے ہم انسانی تعلقات کے اندر پائے جانے والے باہمی زاویہ ہائے نظر کا جائزہ لیتے ہیں

جن کی روشنی میں عادت نمبر 4 کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

معاشرتی زندگی میں رہتے ہوئے باہمی معاملات کو طے کرتے ہوئے مندرجہ ذیل پانچ قسم کے رویہ جات پاسے جاسکتے ہیں۔

(i) جیت / جیت

یہ دل و دماغ کی ایک کیفیت یا سوچ کا ایک انداز ہے جو ہر انسانی تعلق میں باہمی فائدے کی تلاش میں رہتا ہے۔ یہ رویہ تمام انسانی معاملات میں سب کی مشترکہ بھلائی چاہتا ہے اور باہمی معاملات میں ایسے معاہدے اور حل تلاش کرتا ہے جن سے تمام متعلقہ فریقوں کو فائدہ اور اطمینان حاصل ہو اور تمام لوگ طے شدہ فیصلے کے بارے میں اچھا محسوس کریں اور طے پا جانے والی چیزوں کو اپنی ذمہ داری سمجھیں۔ اس نظریے کے مطابق آپ دوسرے لوگوں کا خیال رکھتے ہیں اور اپنی کامیابی کی خواہش کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی کامیاب ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق کامیابی کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہے اور جو شخص بھی اس میں داخل ہونے کی ہمت رکھتا ہے، وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ کامیابی صرف کسی خاص شخص کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر شخص کا حق ہے۔

(ii) جیت / ہار

جیت / جیت کا ایک متبادل نظریہ جیت / ہار ہے۔ اس نظریے کی بنیاد اس نکتے پر ہے کہ ”اگر میں جیتوں گا تو تم ہارو گے“ چنانچہ اس نکتہ نظر کا حامل شخص نہ صرف خود جیتنا چاہتا ہے بلکہ دوسرے کو ہرانا بھی چاہتا ہے۔ اس مقصد کیلئے اُسے ناجائز اور پُر فریب حربے اور ہتھکنڈے بھی استعمال کرنا پڑیں تو وہ گریز نہیں کرتا۔ وہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی پوزیشن، طاقت، مرتبے اور اثر و رسوخ کو بھی غلط طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہ رویہ خود غرضی پر مشتمل ہے جو اسلامی اقدار کے سراسر منافی ہے۔ ایسا شخص کسی بھی جگہ پر قائدانہ کردار ادا کرنے کی حقیقی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔

(iii) جیت

یہ بھی ذہن کا ایک رویہ ہے جس میں کہ انسان صرف اپنی جیت کے متعلق سوچتا ہے۔ اُسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ دوسرے جیت رہے ہیں یا ہار رہے ہیں۔ اس رویہ کے حامل شخص کے سامنے

صرف اپنے خواب اور اہداف ہوتے ہیں جن کی تکمیل کے لئے وہ تن، من، دھن سے مصروف عمل رہتا ہے۔ وہ دوسروں کی خواہشات اور اُن کا حصول اُنہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ مہذب معاشروں میں عموماً یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ تاہم چونکہ اس نظریہ میں بھی انسان کی سوچ اپنی ذات کے اردگرد ہی گھومتی ہے اور اس میں بھی خود غرضی کا پہلو پایا جاتا ہے (اگرچہ جیت / ہار کے رویے کی نسبت کمتر درجے میں ہوتا ہے) اس لئے اسلام کی آئیڈیالوجی میں اسے کوئی مثالی رویہ (ideal behaviour) قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(iv) ہار / جیت

جیت / ہار کے بالکل برعکس ایک اور رویہ ہے جسے ہار / جیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مریضانہ رویہ ہے جس کا حامل شخص احساس کمتری کا شکار اور کمزور ذہنیت کا مالک ہوتا ہے، چنانچہ وہ ہر معاملے میں ہر شخص کے مقابلے میں آسانی سے ہار مان لیتا ہے اور اپنی دانست میں اسے امن پسندی سمجھتا ہے۔

زندگی میں بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جہاں خاموشی اختیار کر لینا، مقابلے سے دستبردار ہو جانا اور بے مقصد بحث و تمہیص سے بچنے کی خاطر ہار مان لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے طبیعت اور مزاج کا حصہ بنا لیا جائے تو پھر یہ رجحان خطرناک ہوتا ہے۔ ایسا شخص عزت نفس اور خود اری سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جگہ جگہ اپنی اقدار پر سمجھوتہ کرتا ہے۔ اپنے احساسات اور سوچوں کو دباتا رہتا ہے جو بعض اوقات خطرناک نفسیاتی بیماریوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں انسان سے ایسی حماقتیں ہو جاتی ہیں کہ دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی خواہش کے باوجود تعلقات میں بگاڑ آ جاتا ہے۔

دراصل جیت / ہار اور ہار / جیت دونوں کمزور پوزیشنیں ہیں اور دونوں کی بنیاد میں ذاتی عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے۔ البتہ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اولد کر سوچ کے ابتدائی طور پر کچھ اچھے نتائج مل جاتے ہیں لیکن موخرالذکر سوچ تو شروع سے ہی ایک کمزور اور بے ہنگم سوچ ہوتی ہے، جو انسان کو دوسروں کے سامنے کھلونا بنا دیتی ہے اور وہ فٹ بال کی طرح ہر سمت میں لڑھکتا چلا جاتا ہے۔

یہ مندرجہ بالا چاروں رویوں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک (Dangerous) ہے جس کا حامل شخص ہر قیمت پر دوسرے کو ہرانا چاہتا ہے اور اُسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ خواہ اس کے نتیجے میں خود اُسے بھی ہارنا پڑے یا نقصان اٹھانا پڑ جائے۔ اس نظریے کے حامل شخص کو اپنی جیت سے اتنی غرض نہیں ہوتی جتنی دوسرے کے ہارنے سے ہوتی ہے۔ لہذا وہ اُسے ہرانے کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ یہ صورتحال عموماً اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب دو جیت ر ہار کی سوچ رکھنے والے مضبوط اناؤں والے ڈھینٹ قسم کے لوگ ایک دوسرے کے مد مقابل ہوتے ہیں۔ جب تمام فریق صرف اپنی جیت اور دوسروں کی ہار چاہتے ہوں تو اکثر نتیجہ ”سب کی ہار“ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس نظریے کی سب سے بڑی مثال جنگ ہے جس میں ہر قیمت پر جیتنے کی خواہش ہوتی ہے چنانچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں اور املاک کو تباہ کیا جاتا ہے بالآخر جو فریق جنگ جیت لیتا ہے وہ بھی اپنا بہت کچھ نقصان کر چکا ہوتا ہے۔ انتقام بھی اس نظریے کی ایک قسم ہے، انتقام لینے والا بظاہر یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ جیت رہا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ اپنی روح کو زخمی کر رہا ہوتا ہے اور بعض اوقات بظاہر بھی اُسے نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک قاتل جب دوسرے کو قتل کر کے خود پھانسی پر چڑھ جاتا ہے تو یہ بھی بدترین قسم کی ہار ر ہار کی سوچ کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔

بار ر ہار کی سوچ ایک منفی اور تخریبی سوچ ہے جو ہر قیمت پر دوسروں کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ یہ اُس شخص کی سوچ ہے کہ جس کا دوسروں پر شدید انحصار ہو، جس کے پاس اندرونی سنت کوئی نہ ہو اور وہ عدم تحفظ کا شکار ہو۔ ایسا شخص اپنے کسی حقیقی یا فرضی دشمن کو اپنے سر پر سوار کر لیتا ہے اور منفی انداز میں اس سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنے دشمن کو اپنا مرکز بنا لیتا ہے اور اُس کے رویے کو اس طرح اپنے اوپر حاوی کر لیتا ہے کہ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے دشمن کو ہارتا ہوا دیکھے چاہے اس میں وہ خود بھی ہار جائے۔ ”بار ر ہار“ کا فلسفہ مکمل طور پر تباہی اور بربادی کا فلسفہ ہے۔

بہترین رویہ کون سا ہے؟

انسانی زندگی کے اندر اتنی انواع و اقسام کی حالتیں اور مواقع ہیں کہ کسی بھی ایک فارمولے کو ہر

جگہ پر لاگو نہیں کیا جاسکتا، مثلاً کھیل کے میدان میں جب دو ٹیموں کے درمیان مقابلہ ہوگا تو لازماً ایک کو جیتنا اور دوسری کو ہارنا ہے۔ لہذا وہاں جیت ر جیت والا اصول عمل میں نہیں لایا جائے گا، اسی طرح کاروبار کے میدان میں جب دو بڑی کمپنیوں کا آپس میں مقابلہ ہوگا تو اُن میں سے کسی ایک کے آگے بڑھنے کی صورت میں لازماً دوسری پیچھے رہ جائے گی، تاہم یہ سب استثنائی حالتیں (Exceptional Cases) ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں باہمی تعلقات میں جہاں ایک دوسرے پر انحصار کرنا ہوتا ہے وہاں جیت جیت کا اصول اپنانا ہی بہترین اور خوشگوار تعلقات کو پروان چڑھانے کا سنہری اصول ہوتا ہے۔

دوسری طرف انسانی زندگی میں کچھ مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں کسی بھی طرح کا مقابلہ ہونا ہی نہیں چاہیے، لیکن انسان وہاں بھی بعض اوقات غیر شعوری طور پر مقابلے میں اتر آتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ محبت اور دوستی جیسے انمول رشتے مقابلہ بازی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ یہ رشتے ہی ایسے ہیں کہ جہاں انسان جیت کر بھی ہار جاتا ہے۔ اپنی تمام تر پائیداری کے باوجود یہ رشتے بہت نازک ہوتے ہیں، جو نہی ہار اور جیت کا تصور ان میں داخل ہوتا ہے یہ کچھ دھاگے کی مانند ٹوٹ جاتے ہیں۔

جیت ر جیت کا اصول نہ صرف دنیوی زندگی کے اندر تعلقات کو خوشگوار بنانے اور اُنہیں فروغ دینے کا سبب بنتا ہے، بلکہ یہ اسلام کا ایک اعلیٰ اصول بھی ہے اور ہماری ایمانی اور روحانی زندگی کی نشور نما کا لازمی تقاضا بھی ہے۔ اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ دوسروں کو اپنے جیسا سمجھتے ہوئے اُن کیلئے وہی پسند کرنا جو انسان اپنے لئے کرتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا:

لا یومن احدکم حتی یحب لآخرہ ما یحب لنفسہ۔ (۲۶)

”تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کیلئے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے کرتا ہے۔“

اسلام نے کتنی خوبصورتی کے ساتھ معاشرتی زندگی کے اس سنہری اصول کو ایمان کا تقاضا بنا دیا ہے اور ایمان کی حقیقت اور کمال کو پانے کے لیے اس اصول کو اپنی شخصیت اور کردار کا حصہ بنانے پر زور دیا ہے۔ ہر انسان اپنے لئے خوشی، مسرت، کامیابی اور نفع وغیرہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایمان کا مطالبہ یہ ہے کہ یہی چیزیں وہ دوسروں کے لئے بھی چاہے۔ وہ ایسی روش اور طرز عمل کو اپنانے سے گریز کرے جس کے نتیجے میں دوسرے لوگ مندرجہ بالا چیزوں سے محروم ہوتے دکھائی دے رہے ہوں۔ جس طرح وہ

اپنا ہمدرد اور خیر خواہ ہوتا ہے اسی طرح وہ دوسروں کا بھی ہمدرد اور خیر خواہ بن جائے۔ اور معاملات کا ایسا حل تلاش کرے جو اُس کو خوشی اور کامیابی کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ایسا محسوس کرنے کا موقع فراہم کرے۔ اسی صورت میں انسان حقیقی معنوں میں خوشی و مسرت کو حاصل کر سکتا ہے اور دوسروں کے ساتھ تعلقات کو بھی پائیدار بنیادوں پر استوار کر سکتا ہے۔ بصورت دیگر صرف اپنی کامیابی اور خوشی کے متعلق سوچنے اور دوسروں کے جذبات و محسوسات کو نظر انداز کرنے سے نہ وہ صحیح خوشی اور کامیابی حاصل کر سکے گا اور نہ ہی دوسروں کے ساتھ خوشگوار، مضبوط، اور پائیدار تعلقات کو برقرار رکھ سکے گا۔

”جیت / جیت“ کا رویہ کیا ہے؟

اس کو سمجھنے کے حوالے سے ایک بہترین مثال حضور ﷺ کا نبوت سے پہلے پیش آنے والا ایک واقعہ ہے۔ تعمیر کعبہ کے دوران حجر اسود کو خانہ کعبہ کی دیوار میں نصب کرنا تھا، ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ یہ سعادت اُس کے حصے میں آئے بلا آخر طے پایا کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہوگا وہی یہ فیصلہ کرے گا۔ حسن اتفاق سے حضور ﷺ سب سے پہلے داخل ہوئے۔ چنانچہ طے شدہ اصول کی مطابق اب آپ ﷺ نے طے کرنا تھا کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آئے گی؟ آپ نے ایک چادر منگوا کر اُس پر حجر اسود کو رکھ کر ہر قبیلے کے سردار کو بلا کر اُس کے ہاتھ میں چادر کا ایک کونہ پکڑایا، اس طرح سب نے مل جل کر حجر اسود کو نصب کیا۔ چنانچہ ہر فریق خوش تھا کہ یہ سعادت اُس کے حصے میں بھی آگئی۔ (۲۷)

اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر جو معاہدہ طے پایا اس میں اگرچہ آگے چل کر اسلام کو فائدہ پہنچنا تھا لیکن فی الوقت معاہدے کا دوسرا فریق (کفار مکہ) اس بات پر مطمئن تھا کہ یہ معاہدہ اُن کے لئے بہت فائدہ مند ہے۔ چنانچہ شروع میں تو دونوں طرف بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس پر عمل کیا گیا، تاہم بعد ازاں جب کفار مکہ کو احساس ہوا کہ اس معاہدے میں عملی طور پر اُن کا نقصان ہو رہا ہے تو انہوں نے معاہدہ توڑ دیا۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی معاہدے میں فریقین اسی وقت خوش دلی سے عمل کرتے ہیں جب اُن کو اُس میں اپنے لئے نفع محسوس ہو رہا ہو، جہاں ایک فریق محسوس کرے کہ اُسے نقصان ہو رہا ہے تو وہ معاہدہ توڑ دیتا ہے یا پھر خوش دلی سے اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا

اور ایسی حالت میں خوشگوار تعلقات کو برقرار رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

جیت / جیت یا ”کوئی معاہدہ نہیں“ (No Deal)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات کسی معاملے میں فریقین میں اتنا اختلاف اور تضاد ہوتا ہے کہ اسے ختم کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا، نہ ہی کوئی درمیانی حل ہوتا ہے ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جیت / جیت کا متبادل اوپر بیان کردہ بقیہ چار نظریات میں سے کوئی بھی نہیں بن سکتا، جب جیت / جیت کا حل ممکن ہی دکھائی نہ دے رہا ہو تو پھر بہترین حل یہ ہے کہ باہمی تعلقات کو برقرار رکھتے ہوئے ”کوئی معاہدہ نہیں“ (No Deal) پر اتفاق کر لیا جائے۔ No Deal کا مطلب ہے کہ جب فریقین محسوس کریں کہ ان کی اقدار اور اہداف دو مختلف سمتوں میں جا رہے ہیں اور کسی مشترکہ نکتے پر متفق ہونا ممکن ہی نہیں۔ تو پھر بجائے کوئی ایسا معاہدہ کرنے کے جس میں دونوں یا ایک فریق مطمئن نہ ہو اور نتیجتاً تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس بات پر رضا مندی کر لی جائے کہ ”ہم رضا مند نہیں ہو سکتے۔“ اس طرح کوئی ٹوٹا پھوٹا معاہدہ معرض وجود میں ہی نہیں آئے گا اور ایک دوسرے سے بے جا توقعات بھی وابستہ نہیں ہوں گی کہ جن کے پورا نہ ہونے سے تعلقات میں خرابی آ سکتی ہے۔

No Deal کی ایک مثال یہ ہے کہ جب کافروں نے کہا کہ آپے ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کر لیتے ہیں اور دوسرے سال آپ ہمارے خدا کی عبادت کر لیں، اس طرح ہمارے درمیان جھگڑا مستقل طور پر ختم ہو جائے گا، تو اس کے جواب میں قرآن مجید کی سورۃ الکافرون اُتری۔ جس میں اس تجویز (Suggestion) کو سختی سے رد کر دیا گیا اور چونکہ یہاں کوئی درمیانی راستہ ممکن ہی نہیں تھا کہ توحید اور شرک ایک دوسرے کی مکمل ضد ہیں اور توحید کسی بھی صورت میں اور کسی بھی درجے میں شرک کو گوارا ہی نہیں کرتی، چنانچہ کافروں کو ”کوئی معاہدہ نہیں“ (No Deal) کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝ (۲۸)

”تمہارے لئے تمہارا دین اور ہمارے لئے ہمارا دین“

بیشتر حالات میں جیت / جیت کا حل ممکن ہوتا ہے، تاہم اگر سوچ بچار کے بعد کسی جگہ یہ

صورت حال ممکن دکھائی نہ دے تو پھر ”کوئی معاہدہ نہیں“ (No Deal) والی راہ (Option) ہی بہترین ہوتی ہے۔ یہ انسان کو خاصی آزادی عطا کرتی ہے۔ جب انسان کے ذہن میں No Deal کا امکان موجود ہو تو پھر وہ جیت / جیت کے حل کیلئے کوشش کرتا ہے اور اپنی توانائی اور صلاحیتوں کو استعمال میں لاتے ہوئے ہر ممکن طریقے سے اس تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ خواہ مخواہ دوسروں کے ساتھ محاذ آرائی کرنے، اُن پر اپنی رائے ٹھونسنے اور اُن پر اپنے ایجنڈے کو مسلط کرنے سے گریز کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر جیت / جیت کا معاہدہ ممکن نہ ہو سکا تو پھر متبادل کے طور پر ”کوئی معاہدہ نہیں“ (No Deal) کا انتخاب (Choice) موجود ہے۔

جیت / جیت والی سوچ کیسے اپنائی جائے؟ (تین تقاضے)

باہمی تعلقات میں جیت / جیت کی سوچ کو اپنانا بلند حوصلہ اور اعلیٰ ظرف لوگوں کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ اس خوبی کو اپنی شخصیت میں پیدا کرنے کے لئے اپنے فطری عطیہ جات (خود آگاہی، تخیل، ضمیر، خود مختار ارادہ) کو بھرپور طریقے سے استعمال میں لانا پڑتا ہے۔ اس سے انسان کے اندر ایسی بصیرت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ حقائق کا کھلے دل سے اعتراف کر سکے۔ دوسروں کو اپنی جگہ اور اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ پر رکھ کر سوچ سکے۔ دوسروں کو صحیح معنوں میں سمجھ سکے اور اپنی بات موثر طریقے سے انہیں سمجھا سکے۔ دوسروں کے ساتھ تعاون کر سکے اور اُن سے اپنے لئے تعاون حاصل کر سکے، اور باہمی تعلقات کو سب کی بھلائی اور بہتری کے حصول کا ذریعہ بنا سکے۔ اس مقصد کیلئے جس اعلیٰ درجے کے کردار کی ضرورت ہوتی ہے اُس کے اندر مندرجہ ذیل تین چیزیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔

(i) تشخیص

تشخیص کا مطلب ہے کہ انسان کی سیرت و کردار میں امانت و دیانت کا پہلو اس قدر راسخ ہو چکا ہو کہ ماحول اور معاشرے کی نگاہوں میں دیانت داری اور راست بازی اُس کی پہچان بن چکی ہو۔ ایک شخص کے اندر اگر سو خوبیاں ہوں لیکن ایک دیانتداری نہ ہو تو لوگوں کی نظر میں اُس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی اور نہ ہی کوئی اُس کی بات سننے پر آمادہ ہوگا۔ دوسری طرف کسی بھی معاہدے کا اولین شرط اعتماد ہوتا ہے تو ایسی صورت میں جیت / جیت کا حل سوچنا اور اُس پر عمل پیرا ہونا ممکن ہی نہیں۔ حضرت شعیبؑ یہ السلام کی بیٹی نے اپنے باپ کے سامنے حضرت موسیٰؑ کو ملازم رکھنے کی تجویز

پیش کرتے وقت اُن کی جو دو خوبیاں بیان کی تھیں اُن میں سے ایک دیانتداری تھی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ (۲۹)

”بے شک جو بہتر ملازم تو رکھنا چاہے، وہ ہے جو طاقت ور اور دیانتدار ہو۔“

حضور ﷺ کو اعلان نبوت سے پہلے کفار مکہ نے جو دو القاب منسوخ کر رکھے تھے وہ تھے ”صادق اور امین“ یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور ان دونوں کا تعلق دیانتداری سے ہی ہے۔

دیانتداری اور راست بازی کا مفہوم بہت وسیع ہے اس کا مطلب ہے کہ انسان اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اپنے کردار میں سموئے ہوئے ہو، اُس کے ظاہر و باطن میں یکسانیت اور ہم آہنگی ہو اور قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ وہ ہر کسی کا ہمدرد اور خیر خواہ ہو۔ اپنے اور دوسروں کیلئے یکساں معیار رکھتا ہو وغیرہ۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ خوبی اُس کی شخصیت میں رچ بس چکی ہو نہ کہ کسی خاص موقع پر کبھی کبھار اظہار ہو۔ جب یہ ہے کہ ہماری ہر لمحہ کی حرکات و سکنات اور جملہ اعمال و افعال دوسروں کی نگاہوں سے گزر کر اُن کے ذہن کے کمپیوٹر میں جا کر ہماری ایک تصویر بناتے چلے جاتے ہیں۔ جس طرح کا طرز عمل ہم اپناتے ہیں اسی طرح کی ہماری تصویر لوگوں کے ذہنوں میں بنتی ہے اور اُسی کے مطابق لوگوں کے ذہنوں میں ہمارے حوالے سے اعتماد کا لیول قائم ہوتا ہے۔ اس تصویر کا بننا یا بگڑنا ایک دن کی بات نہیں بلکہ یہ ایک مسلسل اور متواتر عمل ہے۔ لہذا جب ہم مستقل طور پر اس خوبی کو اپنائے ہوں گے اور ہر موقع پر اپنے عمل سے اس کا اظہار کریں گے تو لوگوں کے ذہنوں میں ہمارے حوالے سے اعتماد کی سطح بلند سے بلند تر ہوتی چلی جائے گی۔ چنانچہ اس خوبی کی موجودگی میں ایک طرف تو ہمارے لئے جیت ر جیت والے حل سے متعلق سوچنا آسان ہوگا اور دوسری طرف دوسرے لوگوں کو اس کی طرف مائل کرنا آسان ہوگا۔

(ii) بالغ نظری

عام طور پر بالغ نظری سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ انسان کی عقل میں اتنی پختگی آ جائے کہ وہ معاملات کا بہتر انداز میں جائزہ لے سکے اور درست نتائج اخذ کر سکے۔ لیکن یہاں بالغ نظری کا لفظ ایک خاص مفہوم میں استعمال کیا جا رہا ہے اور وہ ہے:

”اپنے حوصلے اور دوسروں کی پرواہ کے درمیان صحیح توازن پیدا کرنا“

جب انسان اپنے جذبات اور عقائد کا پوری حوصلہ مندی سے اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے جذبات اور عقائد کا بھی پورا پورا لحاظ کرنے لگے تو گویا اُسے بالغ نظری کی صفت حاصل ہو گئی بالفاظ دیگر

بالغ نظری = اپنے اوپر اعتماد + دوسروں کی عزت

جیت ر جیت کی سوچ پر عمل پیرا ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ہمارے رویے میں ان دونوں چیزوں کے درمیان توازن ہر وقت برقرار رہے۔ اگر ایک انسان کے پاس حوصلہ مندی یا ذاتی اعتماد اعلیٰ درجے میں موجود ہو لیکن وہ دوسروں کی پرواہ کرنے میں کمزور ہو اور دوسروں کے جذبات و احساسات کی اُس کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہ ہو تو وہ ہر وقت اپنی جیت اور دوسروں کی ہار کے چکر میں ہی رہے گا۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص میں حوصلہ مندی اور ذاتی اعتماد پست درجے میں ہو لیکن وہ دوسروں کی بہت زیادہ پرواہ کرنے والا ہو اور اُن کے جذبات اور خواہشات کو بہت اہمیت دیتا ہو تو وہ اپنی ہار اور دوسروں کی جیت کیلئے آمادہ ہو جائے گا۔ جیت ر جیت کی سوچ اُسی وقت معرض وجود میں آتی ہے جب ایک انسان کے پاس ذاتی حوصلہ مندی اور دوسروں کی عزت دونوں اعلیٰ درجے میں موجود ہوں اور دونوں کے درمیان توازن پایا جا رہا ہو۔

(iii) کشادہ دلی

کشادہ دلی کا مطلب ہے کھلے دل و دماغ کا مالک ہونا اور معاملات کو طے کرتے وقت تنگ نظری اور تعصب کی بجائے وسیع النظری اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا، یہاں کشادہ دلی کا لفظ جس خاص مفہوم میں استعمال کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے

”بہت ہے کی ذہنیت اپنانا“

اس کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے جو بے حد و حساب خزانوں کا مالک اور لامحدود خوبیاں رکھنے والا ہے۔ اُس نے اپنی پیدا کی ہوئی کائنات میں بھی ان گنت امکانات رکھ دیئے ہیں۔ جس وجود کو بھی اُس نے پیدا کیا ہے اُس کی ضرورت اور تعمیر و ترقی کے جملہ لوازمات یہاں موجود ہیں، لہذا یہاں ہر شخص کے لئے پانے کے لئے بہت کچھ موجود ہے۔

ایک حدیث قدسی کے الفاظ یوں ہیں:

یا عبادی لو ان اولکم و اخرکم و جنکم و انکم اجتمعوا فی صعید واحد
 فنسئونی جمیعاً فاعطیت کل انسان منهم مسئلتہ لم ینقص ذلک مما عندی
 الا ینقص المخیط اذا غمس البحر (۲۰)

”اے میرے بندو! اگر تمہارے سب اگلے پچھلے، جن و انسان ایک میدان میں جمع ہو جائیں
 اور سب مجھ سے مانگیں اور میں ان میں سے ہر ایک کا سوال پورا کر دوں تو یہ دنیا میرے
 خزانے میں کمی نہیں کرنے گا۔ مگر اتنی جتنی کے سمندر میں ڈوبنے سے سوئی سمندر کے پانی میں
 کمی کرے گی۔“

”جیت / جیت“ کی سوچ کو اپنانے کیلئے بہت ضروری ہے کہ انسان اس ”بہت ہے کی ذہنیت
 “ کو اپنا چکا ہو اور اپنے دل و دماغ کی تختی پر یہ حقیقت نقش کر چکا ہو کہ یہاں ہر شخص کے پانے کیلئے
 ہر چیز بے حد حساب مقدار میں موجود ہے۔ مال و دولت، علم و عقل اور عزت و شہرت وغیرہ میں سے کوئی
 بھی چیز ایسی نہیں جس کی کوئی کمی ہو۔ جب انسان اس سوچ کو اپنے من میں اتار لے گا تو پھر اس کیلئے
 دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنا، انہیں نعمتیں پاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونا اور ان کے فائدے کے
 متعلق سوچنا قطعاً مشکل نہیں ہو گا کیونکہ وہ اس بات کو جانتا ہو گا کہ دوسروں کو ملنے کا مطلب کسی بھی
 درجے میں یہ نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں سے محروم رہ جائے گا، بلکہ اُس کیلئے بھی آگے بڑھنے اور ہر چیز کو
 پانے کے مواقع پوری طرح موجود ہیں۔

اس کے برعکس جو شخص تنگ دل اور تنگ نظر ہوگا، وہ اس وہم میں پڑ جائے گا کہ یہاں ہر چیز
 بہت محدود مقدار اور قلیل تعداد میں موجود ہے۔ لہذا جس طرح بھی ممکن ہو کوشش کر کے یہ محدود چیزیں
 اپنے لئے زیادہ سے زیادہ تعداد اور مقدار میں حاصل کر لینی چاہئیں۔ ایسے شخص کا ذہن جیت / جیت کی
 سوچ کو اپنانے کی طرف مائل ہی نہیں ہوگا۔ کیونکہ اُس کے نزدیک ایک کی جیت دوسرے کی ہار کے
 مترادف ہوگی، چنانچہ وہ دوسروں کے اندر موجود خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف نہیں کر سکے گا بلکہ اُلٹا ان
 کے حوالے سے حسد محسوس کرے گا۔ اپنی طرف سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا تو دور کی بات ہے وہ دیگر
 ذرائع سے ان کو ملنے والی کامیابیوں اور فوائد کے حوالے سے بھی اپنے دل ہی دل میں جلنے اور کڑھنے
 والی روش کا شکار ہوگا۔ مادی فوائد تو ایک طرف وہ کسی دوسرے کی تعریف سن کر بھی اندر سے جل بھن کر

رہ جائیگا۔ جیسے روپے پیسے کی طرح تعریف بھی کوئی محدود سی چیز ہے۔ اور اس میں سے کچھ کم ہو گیا تو شاید اس کیلئے کچھ نہ بچے گا۔ وہ دوسروں کی کامیابی، تعریف اور اعلیٰ کارکردگی کا صرف ایک مطلب لے گا کہ وہ ان کے مقابلے میں چھوٹا ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ اندر ہی اندر دوسروں کی ناکامی، بدنامی اور نقصان کی امید لگائے رکھے گا، تاکہ دوسرے پیچھے رہ جائیں اور وہ خود ان سے آگے نکل جائے۔ ایسا شخص کبھی بھی جیت / جیت والی روش کو نہیں اپنا سکے گا۔ کیونکہ اس طرز عمل کو اپنانے کیلئے جس بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے اس کے پاس وہ بنیاد ہی موجود نہیں ہے۔

خلاصہ کلام

تسخیر کائنات کا پہلا قدم ہے جیت / جیت کی سوچ کو اپنانا ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنی ذات کے تنگ حصار سے باہر نکل کر اپنے آپ کو انسانیت کے وسیع سمندر میں شامل کر لینا محض اپنے نفع کی طرف دیکھنے کی بجائے ہر ایک کے نفع کو ملحوظ خاطر رکھنا، اپنی ذات کی طرح ہر ایک کا ہمدرد اور خیر خواہ ہونا، ہر کسی کی بھلائی کے متعلق سوچنا، اپنے آپ کو جاننے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی جاننا اور ان کے جذبات و احساسات کا لحاظ رکھنا، باہمی معاملات میں ایسے طریقے اپنانا جن میں تمام متعلقہ لوگوں کیلئے فائدہ اور اطمینان کا پہلو ہو۔ اس مقصد کیلئے بہت ضروری ہے کہ انسان پہلے تسخیر ذات کا مرحلہ طے کر چکا ہو۔ نیز جیت / جیت کی سوچ کے تین بنیادی تقاضوں یعنی شخص، بالغ نظری، اور کشادہ دلی جیسی صفات کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی سیرت و کردار کا حصہ بنا چکا ہو۔

عملی مشورہ جات

۱۔ چوتھی عادت تسخیر کائنات کا پہلا قدم، تسخیر کائنات کیلئے تسخیر ذات بنیادی شرط ہے جس طرح پہلی منزل کو تعمیر کئے بغیر دوسری منزل تعمیر نہیں کی جاسکتی، اسی طرح اپنے آپ کو فتح کیے بغیر ماحول اور معاشرے کو فتح کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ لہذا ایک مرتبہ پلٹ کر جائزہ لیں کہ کیا آپ پہلی تینوں عادات کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنی شخصیت کے اندر اتار چکے ہیں اور انہیں اپنی سیرت و کردار کا حصہ بنا چکے ہیں؟ اگر اس حوالے سے کوئی کمی ہے تو پہلے اسے دور کریں۔

۲۔ اپنی سوچ کی ساخت پر گہرے انداز میں غور کریں اور زندگی کے بارے میں اپنے عمومی رویے کا جائزہ لیں کہ یہ اوپر بیان کردہ مختلف نقطہ ہائے نظر میں سے کس زمرے میں آتا ہے؟ اس کے آپ کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور دوسروں کے ساتھ آپ کے تعلقات پر کیا اثر پڑ رہا ہے؟ اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ آپ کی موجودہ زندگی میں سوچ کی یہ ساخت کس حد تک آپ کے مقاصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بن رہی ہے؟ پھر اس حوالے سے جہاں کہیں انحراف دکھائی دے اُسے دور کرتے ہوئے اپنی سوچ کو جیت ر جیت کی طرز پر استوار کریں۔ اور تب تک اس پر خصوصی توجہ دیں جب تک یہ سوچ آپ کے مزاج اور کردار میں شامل ہو کر پختہ عادت کی شکل اختیار نہیں کر لیتی۔

۳۔ کسی ایسی ماڈل شخصیت کے بارے میں سوچیں جسے جیت ر جیت کی سوچ کے حوالے سے رول ماڈل کہا جاسکتا ہو، پھر حتی الامکان اُس شخص کو اپنے لئے مثال بنانے کی کوشش کریں۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کی ذات بغیر کسی شک و شبہ اور کسی بھی قسم کی مبالغہ آرائی کے بہترین قرار دیا جاسکتا ہے کہ جن کے متعلق خود قرآن نے فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿۳۱﴾

”اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہان والوں کے لئے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے“

چنانچہ حضور ﷺ کی ساری زندگی میں ہمیں یہ صفت بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے کہ آپ ﷺ باہمی معاملات میں ہر فریق کی بہتری چاہتے تھے، اس نقطہ نظر سے سیرت طیبہ کا مطالعہ انسان کیلئے خوشگوار حیرت کے نئی باب کھول دیتا ہے اور اس کے لئے اس سوچ کو اپنانا آسان سے آسان تر ہو جاتا ہے۔

۴۔ جب بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ کوئی معاملہ حل طلب ہو تو پوری دیانتداری کے ساتھ اپنے آپ کو اُس کی جگہ پر رکھ کر سوچیں کہ اگر آپ وہ ہوتے تو آپ کیا چاہتے، پھر اپنی سوچ کو جاننے کے ساتھ ساتھ اُس کی سوچ کو جانتے ہوئے کسی بہترین نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

۵۔ کسی بھی حل طلب مسئلے کے ضمن میں عموماً دو پہلو تو نمایاں ہوتے ہیں جن میں سے ایک پہلو کو لینے کی صورت میں ایک فریق زیادہ فائدے میں رہتا ہے جبکہ دوسرا پہلو دوسرے کے فائدے میں جا رہا ہوتا ہے۔ انسانی سوچ عموماً ان دو پہلوؤں تک ہی محدود رہتی ہے، حالانکہ انسان غور کرے تو بیشتر حالات میں وہاں ایک تیسرا پہلو بھی موجود ہوتا ہے جسے مسئلے کا تیسرا حل (Third Option) یا زیادہ بہتر الفاظ میں برتر حل (Superior Solution) قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ تیسرا حل عموماً جیت ر جیت کی سوچ کا حامل ہوتا ہے اور دونوں فریقین کیلئے اطمینان اور خوشی کا باعث بنتا ہے۔ لیکن یہ تیسرا حل بالعموم سطح کے نیچے ہوتا ہے اور اسے پانے کیلئے وقتِ نظر، باریک بینی، اور اعلیٰ ظرفی کے ساتھ جائزہ لینا پڑتا ہے۔ لہذا اپنے اندر وہ بصیرت اور انداز فکر پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ہر معاملے میں اُس تیسرے حل تک پہنچ جایا کرے، تاکہ زندگی کے دامن کو حقیقی خوشیوں، مسرتوں اور کامیابیوں سے بھرا جاسکے اور دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی بھلائیاں اور سعادتیں بھی حاصل کی جاسکیں۔

حواشی

- ۱- World Famous Quotations, P 617
- ۲- الحجرات، ۴۹: ۱۰
- ۳- القف، ۶۱: ۴
- ۴- بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم: ۲۰۸۸۶، ۱۰/۲۳۶
- ۵- وحید الدین خاں، مولانا، تعمیر حیات، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۳
- ۶- وحید الدین خاں، مولانا، اقوال حکمت، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۸
- ۷- بخاری، الصحیح، رقم: ۱۳/۱، ۱۳
- ۸- رائے محمد حنیف، اسلام کی روحانی قدریں۔ موت نہیں زندگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۳۵
- ۹- النور، ۲۴: ۲۶
- ۱۰- Dale Carnegie, How To Win Friends And Influence People, e-book.
ISBN-0-671-42517-X, P95
- ۱۱- ہندی، حسام الدین، کنز العمال، رقم ۱۰۵/۱۰، ۲۹۲۸۲
- ۱۲- زیدی، علی جواد، انیس کے سلام، (مرتبہ) قومی کونسل برائے فروغِ اُردو، نیودہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۸
- ۱۳- لدھیانوی، برکت علی، ابوانیس محمد، مکشوفات منازل احسان، المعروف بہ مقالات حکمت، ۱۰۶۵/۱
- ۱۴- خطیب تبریزی، ولی الدین أبو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ (م ۷۳۱ھ)۔ مشکوٰۃ المصابیح۔ المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۸۵ء، رقم: ۳۹۹۶، ۳/۱۳۹۲
- ۱۵- محمد طاہر القادری، ڈاکٹر، خطاب بعنوان ”آداب طریقت“ (حسن خلق، تقویٰ، مجاہدہ، ترکِ شہوات)، آڈیو کیسٹ نمبر ۲۸/۲۔ ۱۶، ۳ دسمبر ۱۹۸۵ء
- ۱۶- المومنون، ۲۳: ۸
- ۱۷- ابن حبان، الصحیح، رقم: ۱۹۳، ۱/۳۲۲
- ۱۸- بخاری، الصحیح، رقم: ۸۵۳، ۱/۳۰۳

- ۱۹- Baig, Mirza Ghulam Muhammad, Professor, Current English Dictionary, Ch. Ghulam asool & Sons, Lahore, P408
- ۲۰- فیروز اللغات، ص ۱۸۶
- ۲۱- طبرانی، المعجم الاوسط، رقم: ۸۳۰۷/۸، ۱۷۲/۸
- ۲۲- ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ: ۱۳۱؛ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ۱: ۳۶۸؛ سیوطی، درمنثور، ۲: ۳۶۶؛ کنز العمال، ۱۶: ۲۶۶
- ۲۳- مسلم، الصحیح، رقم: ۵۵/۱، ۷۴
- ۲۴- الفتح، ۲۸: ۲۹
- ۲۵- محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، ص ۵۵۸
- ۲۶- بخاری، الصحیح، رقم: ۱۳/۱، ۱۳
- ۲۷- الازہری، محمد کرم شاہ، حیر، ضیاء النبی ﷺ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۳۱۳ھ، ۲/۱۵۲
- ۲۸- الکفر ون، ۱۰۹: ۶
- ۲۹- القصص، ۲۸: ۲۶
- ۳۰- مسلم، الصحیح، رقم: ۲۵۷۷/۲، ۱۹۹۴
- ۳۱- الانبیاء، ۲۱: ۱۰۷

پہلے سمجھنا پھر سمجھانا

پانچویں عادت کا مفہوم

پانچویں عادت کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل مثالوں پر غور کریں۔

(۱) فرض کریں کہ آپ کو آنکھوں کی تکلیف ہو جاتی ہے، آپ کس ماہر عینک ساز کے پاس جاتے ہیں اور اُسے اپنا مسئلہ بتاتے ہیں، وہ آپ کی بات کو سرسری انداز میں سن کر اپنی آنکھوں سے عینک اُتار کر آپ سے کہتا ہے کہ ”یہ عینک لگالیں آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میرے پاس اور ہے میں وہ لگا لوں گا۔“

آپ عینک لگاتے ہیں تو ہر چیز دھندلی دکھائی دینے لگتی ہے اور معاملہ پہلے سے بھی زیادہ خراب محسوس ہوتا ہے، آپ اُسے بتاتے ہیں کہ اس عینک کے لگانے سے آپ کی بینائی پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئی ہے، وہ کہتا ہے۔

”میں ایک سال سے یہ عینک استعمال کر رہا ہوں مجھے تو اس نے بہت فائدہ پہنچایا ہے اور ہر

چیز صاف دکھائی دیتی ہے پھر آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“

آپ اُسے بتاتے ہیں کہ یہ عینک بہر حال آپ کے حسبِ حال نہیں ہے اور بجائے فائدہ کے نقصان دے رہی ہے لیکن وہ آپ کی بات کو سنی اُن سنی کرتے ہوئے دوبارہ کہتا ہے۔

”آپ خواجواہ منفی انداز میں سوچ رہے ہیں۔ میں نے تو آپ کی مدد کی بہت کوشش کی لیکن

آپ ناشکری کا رویہ اپنا رہے ہیں۔“

مندرجہ بالا مکالمے کے بعد امید ہے کہ آپ وہاں سے اُٹھ کر آ جائیں گے اور دوبارہ کبھی اُس کی دوکان کا رخ نہیں کریں گے۔

(ب) آپ جوتے خریدنے کیلئے ایک دوکان پر جاتے ہیں جہاں سیلز مین آپ سے پوچھتا ہے کہ آپ کیسے ”جوتے پسند کریں گے؟“ آپ اُسے کچھ بتانے لگتے ہیں کہ وہ آپ کی بات کاٹ کر کہتا ہے۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ کو کس قسم کے جوتے کی ضرورت ہے؟“ یہ کہہ کر وہ الماری کے ایک خانے کی طرف بڑھتا ہے اور جوتوں کا ایک جوڑا آپ کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے جو پہلی نظر میں دیکھنے پر ہی آپ کو بالکل اچھا نہیں لگتا۔ آپ اُسے کہتے ہیں کہ مجھے یہ جوتے پسند نہیں ہیں کوئی اور دکھائیں۔ لیکن وہ اصرار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ”میں دس برس سے دوکان چلا رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ جوتے بہت عمدہ ہیں۔“

آپ پھر کہتے ہیں کہ میں ان سے مختلف چاہتا ہوں، وہ جواباً دوبارہ کہتا ہے کہ ”آج کل ہر کوئی جوتوں کے اس ڈیزائن کو پسند کر رہا ہے آپ کو کیوں پسند نہیں آرہے۔“ مندرجہ بالا مکالمے کے بعد اُمید ہے کہ آپ وہاں سے نکل آنے میں ہی عافیت سمجھیں گے اور اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں ہے کہ آپ جوتے خریدنے دوبارہ وہاں جائیں گے۔

مندرجہ بالا دونوں مثالوں میں ایک ہی قسم کی غلطی ہے جو ہر جگہ دہرائی جا رہی ہے اور وہ ہے تشخیص کے بغیر تجویز، مسئلہ کو جانے بغیر حل تجویز کرنا، سمجھے بغیر سمجھانے کی کوشش کرنا۔

یہی غلطی عام لوگ تقریباً ہر معاملے میں کرتے ہیں۔ لوگ عموماً دوسرے کی پوری بات سنے بغیر اور اس بات کو جانے بغیر کہ وہ اصل میں کہنا کیا چاہتا ہے فوراً ہی اپنے نکتہ نظر سے معاملے کو دیکھتے ہوئے کوئی حل تجویز کر دیتے ہیں۔ دراصل ہم میں چیزوں پر جھپٹ پڑنے کی اور انہیں نصیحت سے درست کر دینے کی بہت تیزی ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر ہم تشخیص کے لئے درکار وقت صرف نہیں کرتے اور مسئلے کو پہلے گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ محض سرسری انداز میں بات کو سنتے ہوئے یا کسی سطحی سا جائزہ لیتے ہوئے بغیر غور و فکر کے فوری طور پر اپنی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔ یہ چیز ہماری اثر انگیزی کو بہت محدود کر دیتی ہے اور دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ پانچویں عادت ہماری اس کمزوری کا علاج بتاتی ہے اور پہلے دوسروں کو سمجھنے اور پھر انہیں سمجھانے کی ترغیب دیتی ہے۔ چنانچہ پانچویں عادت کا عنوان ہے ”پہلے سمجھنا پھر سمجھانا“

پانچویں عادت کا اہم تقاضا

اس عادت میں مہارت کیلئے جس اہم ترین لفظ کو جاننا ضروری ہے وہ ہے ”سننا“ اپنے متعلقین کو غور سے سننے، ہمہ تن گوش ہو کر سننے، لیکن محض جواب دینے، انہیں قائل کرنے، اپنی بات منوانے یا ان سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ محض انہیں سمجھنے کے لئے سننے، یہ دیکھنے کے لئے کہ دوسرا شخص معاملات کو کس طرح سے دیکھتا ہے اور وہ حقیقت میں کہنا کیا چاہتا ہے۔ ایک مرتبہ جب اس کے اصل نکتہ نظر سے آگاہی حاصل ہو جائے تو پھر اس کے بعد اپنا نکتہ نظر اس کے سامنے پیش کیا جائے گزشتہ صفحات میں ”بالغ نظری“ کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ یہ ”حوصلے“ اور ”پرواہ“ میں توازن کا نام ہے۔ دوسروں کو ”سمجھنے“ کی خواہش ”پرواہ“ کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان کے اندر اتنی مروت ہوئی چاہیے جو دوسروں کے جذبات و احساسات کی قدر کر سکے اور ان کی باتوں کو غور سے سنتے ہوئے ان کے اصل مفہوم کو اخذ کر سکے اور دوسروں کو سمجھانے کی خواہش ”حوصلے“ کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان کے اندر اتنی جرات ہوئی چاہئے کہ انسان جو کچھ بتانا چاہتا ہے اسے اس انداز میں دوسروں کے سامنے رکھ سکے کہ لوگ اس کی باتوں کو مکمل طور پر سمجھ سکیں اور اس کے اصل نکتہ نظر سے آگاہ ہو سکیں۔ اگر ہم پرواہ کے معاملے میں کمزوری دکھائیں تو نتیجہ ”ہماری جیت اور دوسروں کی ہار“ کی صورت میں نکل سکتا ہے اور اگر ہم ”حوصلے“ کے معاملے میں کمزور ہوں تو نتیجہ ”دوسروں کی جیت اور ہماری ہار“ کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ جیت اور جیت کی سوچ تک پہنچنے کیلئے ان دونوں چیزوں کا اعلیٰ درجے میں موجود ہونا ضروری ہے۔

سمجھ اور ادراک

جب بھی کوئی شخص یا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ہم اسے ایک نظر دیکھتے ہیں تو اس کے بارے میں ہمارا پہلا تاثر ادراک (Perception) کہلاتا ہے۔ ادراک گویا سمجھ کی پہلی منزل ہے۔ ادراک کی بنیاد ہمارے ذاتی تجربے، مطالعے، تصورات، تخیلات اور عقائد پر ہوتی ہے گویا دوسرے لفظوں میں ہم برائی چیز، نئے مسئلے یا انسان کو اپنی ذاتی عینک سے دیکھتے ہیں، ذاتی عینک سے مراد ہمارے تعصبات ہیں۔ سمجھ اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہم چیزوں، مسائل اور انسانوں کو اپنے تعصبات کی عینک اتار کر دیکھتے ہیں اور محض حواسِ خمسہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے سطحی نظر سے دیکھ کر کوئی رائے قائم کرنے کی بجائے غور و فکر کو اعلیٰ درجے میں استعمال کرتے ہوئے اس کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔ مثلاً جب

آسمان کے دور والے کنارے کو دیکھتے ہیں تو ہمارا ادراک ہمیں بتاتا ہے کہ وہاں آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے ہیں مگر ہماری سمجھ ہمیں بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اُن کے درمیان یکساں فاصلہ موجود ہے گویا یہاں ہماری بصارت ہمیں دھوکہ دے گئی لیکن عقل اور غور و فکر نے اس فریب نظر کا پردہ چاک کر دیا۔ اسی طرح تمام معاملات میں کہیں خواصِ خمسہ اور کہیں اندرونی تعصبات کی وجہ سے ہم فریب نظر کا شکار ہو سکتے ہیں اور چیزوں کو غلط رُخ سے دیکھتے ہوئے غلط نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے اندر فہم و بصیرت اور دور اندیشی موجود ہوں تو ہم خالق کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں اور درست نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ حضور a کی دعاؤں میں سے ایک دعا یوں تھی۔

اللهم ارنا الاشیاء كما هی و ارنا الحق حقا و اردقنا

اتباعه و ارنا الباطل باطلا و اردقنا اجتنابه (۱)

”اے اللہ ہمیں چیزوں کو اسی طرح دیکھنے کی توفیق عطا فرما، جیسی وہ ہیں اور ہمیں حق کو حق کی صورت میں دیکھنے اور پھر اُس کی پیروی کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل کے روپ میں دیکھنے اور پھر اس سے اجتناب کرنے کی توفیق عطا فرما۔“

حق و باطل کو اُن کی اصلی صورت میں دیکھنے کیلئے خواصِ خمسہ کی محدودیت سے باہر نکلے اور اندرونی تعصبات سے اوپر اُٹھ کر کھلے دل و دماغ سے حالات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اُس کے مطابق اپنے طرزِ عمل کو متعین کرنے کیلئے جرات اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ بہت مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان حق و باطل کو پہچاننے میں ہی غلطی کر جاتا ہے۔ اور کبھی حق و باطل کو پہچاننے کے باوجود بزدلی، پست ہمتی، انانیت یا کسی مصلحت کی بناء پر صحیح طرزِ عمل کو پانے کا حوصلہ اور جرات نہیں کر پاتا۔

ابلاغ کی اقسام

لکھنا، پڑھنا۔ بولنا اور سننا یہ چاروں ابلاغ کی بنیادی قسمیں ہیں جن کے ذریعے سے ماحول اور معاشرے سے ہمارا رابطہ ہوتا ہے۔ ان ہی کے ذریعے ہم دوسروں تک اپنی آراء پہنچاتے ہیں اور اُن سے اطلاعات و معلومات وصول کرتے ہیں۔ گویا دوسروں کے ساتھ ہمارے تعلقات اور دوسروں کو اپنی بات سمجھانے اور اُن کی بات سمجھنے کیلئے یہ چاروں چیزیں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں اور ہم اپنے وقت

کا بیشتر حصہ انہی میں خرچ کرتے ہیں۔ کامیاب اور موثر زندگی گزارنے نیز دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار کرنے کیلئے بہت ضروری ہے کہ ہم ان چاروں میں ماہر ہوں اور ان کو بہترین انداز میں استعمال کرنا جانتے ہوں۔ مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم لکھنے اور پڑھنے میں مہارت حاصل کرنے کیلئے تو اپنی زندگی کے بہت سارے قیمتی سال صرف کرتے ہیں لیکن سننے اور بولنے کا فن سیکھنے کیلئے کوئی خاص جدوجہد کی کوشش نہیں کرتے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم ان دونوں میں کمزور رہ جاتے ہیں۔ نہ دوسرے لوگوں کی بات اچھے طریقے سے سننے کا فن ہمیں آتا ہے اور نہ ہی اپنی بات موثر طریقے سے سمجھانے سے آشنا ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہماری اثریت محدود ہوتی ہے ہماری کامیابی کی راہ میں رکاوٹیں آتی ہیں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارے تعلقات قدم قدم پر متاثر ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو بالکل ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ پانچویں عادت ہماری اسی کمزوری کا ازالہ کرتی ہے اور ہمیں دوسروں کی بات اچھی طرح سے سمجھنے اور اپنی بات دوسروں کو سمجھانے کی ترغیب دیتی ہے اور اس سلسلے میں اس ترتیب پر بہت زور دیتی ہے کہ پہلے ہمیں دوسروں کی بات صحیح معنوں میں سمجھنا ہوگی اور پھر ہی ہم انہیں اپنی بات سمجھا سکتے ہیں۔ جب تک ہم ایک اچھے سامع (Listener) نہیں بن جاتے تب تک ہم ایک اچھے مقرر (Speaker) بھی نہیں بن سکتے۔

سننے کے ناقص انداز

جب کوئی دوسرا شخص بات کر رہا ہو تو عام طور پر اُس کی بات کو ہم مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک انداز سے سنتے ہیں۔

(i) بے دھیانی سے سننا

سننے کا یہ سب سے ناقص انداز ہے جس میں ہم اپنے ہی خیالات میں کھوئے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہم دوسرے شخص کی بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں کوئی اور کہانی چل رہی ہوتی ہے اور اُس میں منہمک ہونے کی بناء پر ہم مخاطب کی بات پر توجہ نہیں دے پاتے اور یوں ہمارا سننا اور نہ سننا برابر ہو جاتا ہے، ہر انسان پر ایسا وقت کبھی نہ کبھی آتا ہے جب وہ اُس کیفیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مگر جو شخص اکثر و بیشتر ایسا کرے اور بے دھیانی سے باتیں سننے کو اپنی عادت ہی بنا لے تو دوسروں کی نظر میں اُس کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے اور جذباتی اکاؤنٹ میں اُس کے ڈیپازٹس کم ہوتے چلے

جاتے ہیں۔

(ii) سننے کی اداکاری کرنا

سننے کا یہ انداز بہت عام ہے اور اکثر لوگوں میں یہ عادت پائی جاتی ہے کہ وہ دوسروں کی باتوں کو توجہ سے سن نہیں رہے ہوتے ہیں بلکہ محض سننے کی اداکاری کر رہے ہوتے ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کی گفتگو کے دوران اُن کا ذہن تو کہیں اور کھویا ہوتا ہے تاہم دوسرے کو یہ احساس دلانے کیلئے کہ وہ اُس کی باتوں کو سن رہے ہیں وقتاً فوقتاً ”ہاں“، ”ٹھیک ہے“ اور ”ہوں ہوں“ وغیرہ جیسے الفاظ بول دیتے ہیں۔ لیکن بولنے والے کو جلد یا بدیر اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ اُس کی باتوں کو توجہ سے نہیں سنا جا رہا اور اُسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا اُس پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔ یوں ہم اُس کی نظروں میں اپنا تاثر خراب کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی باتوں کو گہرے انداز میں سمجھنے سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

(iii) مخصوص باتیں سننا

سننے کے اس انداز میں ہم مخاطب کی گفتگو کے ان حصوں پر توجہ دیتے ہیں جن میں ہماری دلچسپی کا کوئی پہلو موجود ہوتا ہے اور اُن تمام باتوں کو نظر انداز کرتے چلے جاتے ہیں جو ہمارے لئے کوئی کشش کا پہلو نہ رکھتی ہو۔ خواہ وہ حقیقتاً کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں یا ہمارے مخاطب کی نظروں میں بہت زیادہ وزنی ہوں۔ مثلاً ہمارا کوئی دوست ہمیں اپنے بھائی کے متعلق بتانا چاہ رہا ہے جو کسی مخصوص سکول میں پڑھتا ہے۔ ہم اُس کی بقیہ بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس سکول پر تبصرہ شروع کر دیتے ہیں اور اپنی ہی کہے چلے جاتے ہیں۔ اب وہ تو بنیادی طور پر ہمیں اپنے بھائی کے متعلق کچھ بتانا چاہتا تھا مگر ہم نے اُس کی بات کے اہم نکتے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی توجہ کو سکول پر مرکوز (Focus) کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ اُس کی نظروں میں ہمارا پہلے جیسا تاثر قائم نہیں رہ سکے گا۔

(iv) صرف الفاظ سننا

سننے کے اس انداز میں ہم مخاطب کے الفاظ پر تو غور کرتے ہیں لیکن اُن کا مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور یہ نہیں جان پاتے کہ وہ اصل میں کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ نتیجتاً ہم اہم بات سننے سے محروم رہ

جاتے ہیں۔ الفاظ ابلاغ کا بہت بڑا ذریعہ ہیں مگر کبھی الفاظ ہی ابلاغ کے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کے نزدیک ہمارے ابلاغ (Communication) میں الفاظ کا حصہ صرف سات فیصد ہوتا ہے بقیہ از میں فیصد لہجے (آواز کے اتار چڑھاؤ وغیرہ کا) اور پچپن فیصد جسمانی حرکات و سکنات (Body language / physiology) کا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل فقرے پر غور کیجیے۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ ”تمہارے“ رویے میں کوئی مسئلہ ہے۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ تمہارے ”رویے“ میں کوئی مسئلہ ہے۔

مندرجہ بالا فقرے میں دونوں جگہوں پر الفاظ یکساں ہیں مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ دو مختلف الفاظ پر زور دینے کی صورت میں دونوں جگہوں پر اُس کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے اسی طرح کسی بات کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کیلئے مخاطب کے دل میں جھانک کر دیکھنا ہوتا ہے۔ صرف الفاظ کے سن لینے سے ہم کسی کے دل کی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

(۷) ذاتی نقطہ نظر سے سننا

یہ بھی سننے کا ایک اور ناقص انداز ہے جس میں لوگوں کی اکثریت مبتلا ہوتی ہے اس کا طریقہ کا یہ ہے کہ سننے والا اپنے ذاتی نقطہ نظر سے سن رہا ہوتا ہے۔ وہ دوسرے شخص کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہوئے یہ فرض کر لیتا ہے کہ دوسرا شخص بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہے جس میں وہ خود سوچ رہا ہے، چنانچہ بعض اوقات دوسرے شخص کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا جاتا ہے کہ ”میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں“۔ حالانکہ یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ دوسرے کی بات کو واقعتاً اور حقیقتاً سمجھ لیا گیا ہو۔ دراصل اس انداز سماعت میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جس رنگ کی عینک میں نے لگا رکھی ہے۔ اسی رنگ کی ہر ایک نے لگا رکھی ہے لہذا معاملات کو جس انداز میں میں دیکھ رہا ہوں اسی انداز میں سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ یہ سوچ حقائق تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوسرا شخص خاموش ہو جاتا ہے اور وہ اپنا حال دل بیان کرنے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔

تین اقسام کے رد عمل

سماعت کے اس انداز میں عموماً مندرجہ ذیل تین طرح کے رد عمل ظاہر کیے جاتے ہیں۔

(i) تحقیق کرنا

اس کیفیت میں ہم دوسروں کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اُن کی کیفیت کا اندازہ لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ والدین عموماً بچوں کے معاملے میں یہ غلطی کرتے ہیں بعض اوقات دوسرے کو کریدتے ہوئے سوالات پوچھتے جاتے ہیں اور یہ سب کچھ ہم اپنی آپ بیتی کے مطابق کر رہے ہوتے ہیں۔ گویا ہم منطق کی زبان استعمال کر رہے ہوتے ہیں اور منطق کی زبان جذبات کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوسرا ہمارے سامنے اپنا حال دل سنانے اور اندرونی جذبات کو بیان کرتے سے گریز کرتا ہے۔ نیز وہ ہمارے پاس بیٹھنے میں تنگی اور گھٹن محسوس کرتا ہے بہت سے بچوں کے والدین سے دور رہنے کی ایک بڑی وجہ والدین کی یہی تفتیش و تحقیق اور مستقل کرید ہوتی ہے۔

(ii) نتائج اخذ کرنا

ذاتی نقطہ نظر کے مطابق سننے کے نتیجے میں جو دوسرا رد عمل ظاہر ہوتا ہے وہ ہے بات کے مکمل ہونے سے پہلے ہی نتیجہ اخذ کر لینا۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم دوسرے کی بات سنتے ہیں تو ذہن میں کوئی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ وہ کہنا کیا چاہ رہا ہے اور جب ہم نتیجہ اخذ کرنے میں مصروف ہوں تو ظاہر ہے کہ اُس وقت دوسرے کی بات پورے دھیان کے ساتھ نہیں سن سکتے۔ یہ چیز بھی سماعت کے راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہے اور دوسروں کے ذہنوں میں ہمارے بارے میں تاثر کو متاثر کرتی ہے۔

(iii) نصیحت کرنا

ذاتی نقطہ نظر سے سننے کی تیسری بڑی خامی یہ سامنے آتی ہے کہ ہم دوران گفتگو ہی پوری بات کو سننے بغیر نصیحت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرا شخص بات کر رہا ہوتا ہے تو اُس کی بات کے مکمل ہونے سے پہلے ہی ہم اپنے تجربات کی روشنی میں اُسے کوئی نہ کوئی مشورہ دینا یا نصیحت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ گویا اپنی عینک اتار کر دوسرے کو تھما دینے کے مترادف ہے۔ یہ کام ہم کتنے ہی خلوص سے کریں لیکن دوسرے کے اوپر کوئی خوشگوار اثرات مرتب نہیں کرے گا۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ

ہمیں سننے کی بجائے سنانے سے دلچسپی ہے۔ لوگوں کی نظروں میں ہماری طرف سے آنے والے مشوروں اور نصیحتوں سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہیں سنا جائے اور سمجھا جائے کہ وہ حقیقتاً کہنا کیا چاہتے ہیں۔

روزمرہ کی زندگی میں دوسروں کو سننے کے معاملے میں مندرجہ بالا قسم کی غلطیاں عموماً ہم سے سرزد ہوتی رہتی ہیں اور ہم ہر وقت ان کے گرد گھومتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے دوسروں کو حقیقی معنوں میں ہماری سمجھنے کی صلاحیت متاثر ہوتی رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ہماری اثریت کا دائرہ سکڑتا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف دوسروں کے ساتھ تعلقات متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

حقیقی سماعت۔۔۔۔ ہم نفس سماعت

سننے کے مندرجہ بالا پانچوں انداز ناقص ہیں جن میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خامی پائی جاتی ہے۔ سننے کا بہترین اور اعلیٰ ترین انداز جسے حقیقی سماعت کہا جا سکتا ہے اُس کا نام ہے ”ہم نفس سماعت“۔

”ہم نفس سماعت“ کا مطلب ہے کہ دوسروں کی سطح پر آ کر سننا۔ اس سے مراد ایسا سننا ہے کہ جس میں نیت سمجھنے کی ہو۔ بالفاظ دیگر دوسروں کو سننے کے دوران ہماری شدید خواہش اور بھر پور کوشش ہو کہ ہم نے دوسرے شخص کے خیالات، جذبات اور احساسات کو سمجھنا ہے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا محسوس کر رہا ہے اُس کے نقطہ نظر کو جاننا ہے کہ زیر بحث معاملہ میں اُس کی حقیقی رائے کیا ہے اور اُس کی سوچ اور فکر کا انداز کیا ہے؟“

یہ گویا دوسرے شخص کے تناظر اور خیالات کے اندر داخل ہو جانے کے مترادف ہے۔ اس کے ذریعے سے ہم زندگی کو یوں دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں جس طرح کہ دوسرا دیکھتا ہے ہم اُس کے زاویہ نظر کو سمجھنے لگتے ہیں اور اُس کے احساسات کو محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دوسرے شخص کے ہم خیال بن جائیں، بلکہ اس کا مطلب تو فقط یہ ہے کہ ہم دوسرے شخص کو ذہنی اور جذباتی لحاظ سے مکمل طور پر سمجھ جائیں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ وہ اصل میں کہنا کیا چاہتا ہے۔ اس کیفیت میں سننا ایک طرف تو ہمیں حقائق کی تہہ تک پہنچا دیتا ہے اور ہم صحیح نتائج اخذ کرنے اور پھر بہتر لائحہ عمل طے کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف دوسروں پر اس کا بہت زبردست خوشگوار

اثر پڑتا ہے اُن کے ساتھ ہمارے جذباتی اکاونٹ میں ڈیپازٹس کی سطح کافی بلند ہو جاتی ہے۔ وہ ہمارے اوپر زیادہ اعتماد کرنے لگتے ہیں اور زیادہ آزادانہ طریقے سے ہمارے ساتھ اپنے خیالات، جذبات اور احساسات وغیرہ کا تبادلہ کرنا شروع کر دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہماری بات کو زیادہ بہتر طریقے سے سننے اور ہماری طرف سے آنے والے مشوروں اور نصیحتوں کو قبول کرنے کیلئے ذہنی و قلبی طور پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور یہی عادت نمبر ۵ کا منتہائے مقصود ہے۔

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات اس حوالے سے کیا ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝ (۲)

”بے شک سماعت، بصارت اور دل ان سب کے متعلق سوال کیا جائے گا۔“

یہاں سماعت اور بصارت جو کہ حصول علم کے ذرائع ہیں اور دل جو کہ غور و فکر اور نتائج اخذ کرنے کا آلہ ہے ان تینوں کو اللہ رب العزت کی نعمتیں قرار دیتے ہوئے بتایا جا رہا ہے کہ قیامت والے دن ان کے استعمال کے حوالے سے لازماً سوال پوچھا جائے گا کہ ان کا استعمال درست کیا تھا یا غلط؟ گویا جس خالق و مالک نے یہ عظیم الشان نعمتیں انسان کو بغیر کسی استحقاق اور مطالبے کے عطا فرمائی ہیں وہ چاہتا ہے کہ انسان ان کی قدر و قیمت کا احساس کرتے ہوئے انہیں بھرپور طریقے سے استعمال میں لائے اور اُن کے ذریعے سے حقائق کو سمجھے اور اگر وہ اس حوالے سے کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے یا ان کا غلط استعمال (Misuse) کرتا ہے تو یہ جرم قیامت والے دن قابل مواخذہ ہے۔

جو لوگ ان نعمتوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ہیں اُن کے متعلق ارشاد فرمایا:

صُمُّ بَكْمٍ عُمَىٰ فَهَمَّ لَا يَرْجِعُونَ ۝ (۳)

”بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، پس وہ نہیں لوٹیں گے۔“

یہ آیت کافروں اور منافقوں کے حوالے سے ہے جس میں اُن کو بہرے، گونگے اور اندھے قرار دیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہاں کے سارے منافق اور کافر گونگے، بہرے اور اندھے نہیں تھے۔ پھر اُن کیلئے کیوں یہ الفاظ استعمال کئے گئے؟ اس کی وجہ دوسری آیت میں یوں بیان کی گئی۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ
بِهَا (۴)

”ان کے پاس دل ہیں مگر ان سے سوچتے نہیں ہیں اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں ہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں ہیں۔“

مطلب یہ کہ جو آنکھیں حق کو دیکھ نہیں سکتیں اور جو کان حق کی آواز کو سن نہیں سکتے اور جو دل حق کے پیغام کو سمجھ نہیں سکتے ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہی ہوتا ہے کیونکہ کسی بھی چیز کی قدر و قیمت کا دار و مدار اس کی افادیت پر ہوتا ہے ورنہ وہ بے کار ہوتی ہے۔

پھر آگے حواسِ خمسہ کا انحصار غور و فکر پر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

فَبِأَنفِهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۵)

”پس بے شک آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔“

اور جب دل اندھے ہو جائیں تو پھر آنکھوں کی بصارت بھی انسان کو کوئی خاص فائدہ نہیں دے پاتی۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

دل بیجا بھی کر خدا سے طلب

آنکھ کا نور دل کا نور نہیں ہے (۶)

چنانچہ سماعت اور بصارت سے بھرپور استفادہ کرنے کیلئے دل کی بصیرت کا ساتھ ملانا ضروری ہے جس کا بہت بڑا ذریعہ غور و فکر ہے۔ لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ ہر بات کو دھیان سے سنے اور ہر منظر کو بھرپور توجہ سے دیکھے اور پھر ان پر غور و فکر کرتے ہوئے حقائق کو سمجھ سکے، پہنچے اور صحیح نتائج اخذ کر کے صحیح روش کو اختیار کرے۔ گویا صحیح طرز عمل اپنانے کیلئے صحیح طرز فکر کا ہونا ضروری ہے اور صحیح طرز فکر تک پہنچنے کیلئے حواسِ خمسہ کا درست اور بھرپور استعمال ضروری ہے۔ حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے صحابہ اکرام ا کو جب کبھی کوئی بات سمجھ نہ آ پاتی تو وہ دوبارہ دہرانے کی فرمائش کرتے ہوئے کہتے:

یا رسول اللہ ﷺ! راعنا.

”اے اللہ کے رسول ﷺ! ہماری رعایت کیجیے۔“

کافروں اور منافقوں نے اس لفظ کو بگاڑ کر اس کو غلط مفہوم میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اللہ رب العزت کی طرف سے یہ پیغام آیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا^(۷)

”اے ایمان والوں! ”راعنا“ نہ کہو اور اس کی بجائے ”انظرنا“ کہو اور (اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ) توجہ سے سنو۔“

یہ آیت اگرچہ بارگاہ نبوی ﷺ کے آداب کے ضمن میں نازل ہوئی، تاہم اس میں ”توجہ سے سننے“ کا جو حکم دیا گیا ہے وہ عمومی زندگی میں بھی پسندیدہ اور مطلوب ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر اہل ایمان کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

مطلب یہ کہ وہ قرآن مجید کی آیتوں کے ساتھ اندھوں اور بہروں والا سلوک نہیں کرتے بلکہ جو آیت بھی پڑھتے یا سنتے ہیں اُسے توجہ اور دھیان کے ساتھ پڑھتے اور سنتے ہیں اور پھر اس پر غور و فکر کر کے اُس کے اندر موجود پیغام کو قبول کرتے ہوئے اپنی زندگی کی راہوں کو روشن اور منور کرتے ہیں۔ غور و فکر اور تفکر و تدبر پر جتنا زور اسلام نے دیا ہے شاید ہی دنیا کے کسی اور مذہب یا تہذیب نے دیا ہو۔ رآن مجید میں جا بجا افلا تتفكرون، افلا تتدبرون، افلا تعقلون وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال اور حضور ﷺ کا فرمان کہ

تفكر ساعة خير من عبادة سنة. (۸)

”ایک گھڑی کا تفکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔“

اس حقیقت کی واضح مثالیں ہیں۔

حضور ﷺ کی حیات مبارکہ قیامت تک کیلئے آنے والے انسانوں کے لئے ہر معاملے میں بہترین نمونہ ہے۔ حسن خلق کا وہ کون سا شعبہ اور گوشہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے محبوب ﷺ میں بدرجہ کمال رکھ نہ دیا ہو۔ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (۹)

”اور بے شک آپ ﷺ اخلاق کے اعلیٰ ترین مرتبے پر فائز ہیں۔“

چنانچہ جب ہم عادت نمبر ۵ کے حوالے سے حضور ﷺ کی شخصیت مبارکہ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ میں اتنے خوبصورت انداز میں یہ عادت چھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ حضور ﷺ حسن سماعت کا شاندار نمونہ تھے آپ ﷺ اپنے مخاطب کی بات کو اچھی طرح سننے کیلئے ہمہ تن گوش متوجہ ہو جایا کرتے تھے اور دوسرے کی بات کو اتنے صبر و تحمل اور توجہ سے سنا کرتے تھے کہ ساری زندگی آپ ﷺ نے کبھی کسی بات کرنے والے کی بات کو نہیں ٹوکا۔ یعنی کسی کی گفتگو کو درمیان میں روک کر اپنی سنانے کی کوشش کبھی آپ ﷺ نے نہ کی۔ بلکہ ہمیشہ پہلے دوسرے کو اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی بات مکمل کرنے دی اور اُس کو پورے انہماک سے سنا اور پھر اپنی بات سنائی۔

حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں دوسرے کی بات کو توجہ سے سننے کی کئی مثالیں ہیں۔ مندرجہ ذیل تین مثالیں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

۱۔ حضور ﷺ نے جب اسلام کی دعوت علی الاعلان دی تو قریش حیران و پریشان ہو گئے۔ انہوں نے آپ ﷺ کو رد کرنے کیلئے عقبہ بن ربیعہ کو آپ ﷺ کے ساتھ مذاکرات کرنے کیلئے بھیجا، تاکہ وہ آپ ﷺ کو ان کی بات قبول کرنے پر آمادہ کرے۔ اُس نے آکر حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ”میں آپ ﷺ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ غور سے سنیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کو ان میں سے کچھ اچھی لگیں اور آپ ﷺ مان لیں۔“

اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ”ابو ولید! تمہیں جو کچھ کہنا ہے کہو میں سنوں گا۔“ چنانچہ عقبہ کو جو کچھ کہنا تھا اُس نے وہ دل کھول کر کہا جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو آپ ﷺ نے فرمایا ”ابو الولید تمہیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے ہو؟“ اُس نے کہا ”جی ہاں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا ”تو اب میری بات سنو۔“ اُس نے کہا ”ضرور سنوں گا“ رسول ﷺ نے سورہ فصلت (حم السجدہ) کی تلاوت کی۔^(۱۰)

۲۔ حضور ﷺ کی بارگاہ میں ایک نوجوان حاضر ہو کر زنا کرنے کی اجازت مانگتا ہے حضور ﷺ کسی قسم کی ناگواری کو چہرے پر لائے بغیر اُس سے سوال پوچھتے ہیں کہ کیا وہ یہ کام اپنی ماں سے کرنا چاہتا ہے وہ اس کا جواب نفی میں دیتا ہے پھر حضور ﷺ باری باری بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ کا نام لیکر پوچھتے ہیں

کہ ان میں سے کسی سے کرنا چاہتا ہے وہ ہر بار جواب نفی میں دیتا ہے تو تب آقا ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کے ساتھ بھی کرو گے وہ کسی کی ماں، بیٹی، پھوپھی یا خالہ ہوگی۔ اس انتہائی پر حکمت انداز میں سمجھانے کے بعد آپ ﷺ اُس کے سر پر ہاتھ مبارک رکھ کر اللہ تعالیٰ سے اس کے سابقہ گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور آئندہ زنا سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں چنانچہ پھر اُس شخص نے ساری زندگی یہ کام نہ کیا۔ (۱۱)

۳۔ فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان کی بیوی ہندہ آتی ہے جو اسلام دشمنی میں پیش پیش رہی تھی اسی کے کہنے پر حضور ﷺ کے انتہائی پیارے چچا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بڑی بے دردی سے شہید کیا گیا۔ اس خاتون کے جرائم کی فہرست اتنی طویل تھی کہ اُسے کسی بھی درجے میں یہ توقع نہیں تھی کہ اُسے بھی معافی مل سکتی ہے۔ چنانچہ زندگی سے مایوسی کی کیفیت میں وہ حضور ﷺ کے پاس آئی تو اُس نے طرح طرح کی تلخ و ترش باتیں شروع کر دیں اور انتہائی سیدھے سادھے سوالوں کے جواب بھی بہت منفی انداز میں دیئے۔ حضور ﷺ بہت تحمل کے ساتھ اُس کی ساری باتوں کو سنتے رہے۔ جب اُس نے اپنے اندر کا سار غبار نکال لیا تو آپ ﷺ نے فقط لہقا فرمایا ”ہندہ! جاؤ ہم تمہیں بھی معاف کرتے ہیں۔“ اتنی بات سننے کے بعد بے اختیار اُس کی زبان سے یہ جملہ نکلتا ہے ”آج سے پہلے روئے زمین پر میرے نزدیک آپ ﷺ سے بُرا کوئی شخص نہیں تھا لیکن آج کے بعد روئے زمین پر آپ ﷺ سے پیارا کوئی نہیں ہے“ چنانچہ وہ مسلمان ہو گئی۔ (۱۲)

مندرجہ بالا تینوں مثالوں میں واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ حضور ﷺ پہلے مخاطب کی بات کو بھرپور توجہ سے سن رہے ہیں اور وہ جو کہنا چاہتا ہے اُسے پوری آزادی سے اور بغیر کسی مداخلت یا روک ٹوک کے کہنے دیتے ہیں۔ جب وہ اپنی بات مکمل کر لیتا ہے تو پھر آپ ﷺ اپنی بات سناتے ہیں۔ یہی کامیاب زندگی کا راز ہے اور یہی عادت نمبر ۵ کا نچوڑ ہے۔

انسانی دل کی اہم ترین خواہش یہ ہوتی ہے کہ کوئی اُس کو سمجھے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اُس کی عزت اور قدر کی جائے۔ لوگ اُس وقت تک اپنا راز کسی کے سامنے نہیں کھولتے جب تک اُنہیں حقیقی توجہ اور پیار نہ ملے۔ اگر اُنہیں یہ چیزیں مل جائیں تو وہ توقع سے زیادہ باتیں بتانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک مشہور قول ہے کہ ”لوگ جب تک یہ نہ جان لیں کہ آپ کس قدر پرواہ کرتے ہیں اُس وقت

تک انہیں یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ آپ کس قدر جانتے ہیں، اس قول کی صداقت کو جانچنے کیلئے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہم خود اپنے حوالے سے غور کریں کہ اگر کوئی شخص ہماری بات سننے یا سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کرتا تو ہم اُس پر کبھی اپنا راز نہیں کھولیں گے۔

لیکن دوسری طرف لوگوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ ان کو سننے سے زیادہ سنانے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ چنانچہ زیادہ تر لوگ اس نیت سے نہیں سنتے کہ اگلے کی بات کو سمجھیں، وہ اس لئے سنتے ہیں کہ انہیں جواب دینا ہوتا ہے۔ بیشتر لوگ یا تو بول رہے ہوتے ہیں اور یا پھر بولنے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کاموں کو کرتے ہوئے دوسرے کی بات کو بھرپور توجہ سے سننا اور اُس کو صحیح معنوں میں سمجھنا ممکن نہیں رہتا۔

دوسری طرف جب ہم ”ہم نفس سماعت“ کے تحت سنتے ہیں تو یہ ایک زبردست طاقتور عمل ہوتا ہے جو ہمیں دوسروں کے خیالات، جذبات اور احساسات سے حقیقی معنوں میں آشنا ہونے میں مدد دیتا ہے۔ اس طرح سنا ایک طرف تو ہمیں وہ تمام ضروری معلومات (Data) فراہم کرتا ہے کہ جس کی روشنی میں ہم کسی بہتر حل تک پہنچ سکتے ہیں۔ دوسری طرف دوسرے بندے کو نفسیاتی تسکین فراہم کرتا ہے کہ اُسے بہتر طور پر سمجھ لیا گیا ہے چنانچہ وہ بھی پھر دل و دماغ کی آمادگی کے ساتھ ہماری بات سننے اور سمجھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

”ہم نفس سماعت“ کے تین تقاضے

”ہم نفس سماعت“ کے لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے اندر دوسروں کو سمجھنے کی شدید خواہش موجود ہو۔ جب تک یہ خواہش موجود نہ ہو ”ہم نفس سماعت“ ممکن ہی نہیں۔ بعد ازاں ہمارے اندر اس کی صلاحیت بھی موجود ہونی چاہیے۔ اگر یہ دونوں موجود ہوں تو پھر ”ہم نفس سماعت“ معرض وجود میں آتی ہے۔ خواہش کو تو ہم جانتے ہی ہیں۔ جہاں تک صلاحیت کا تعلق ہے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ ”ہم نفس سماعت“ ایک ہنر ہے جسے جاننے کیلئے مندرجہ ذیل تین تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

(i) آنکھ کان اور دل سے سننا

”ہم نفس سماعت“ کو اپنانے کیلئے محض کانوں سے سن لینا کافی نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہمارے ابلاغ کے اندر الفاظ کا حصہ صرف سات فیصد ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم

دوسرے شخص کو صرف اُس کے کہے ہوئے الفاظ کی بنیاد پر سمجھنا چاہیں تو ہم بہت محدود ہو جاتے ہیں۔ لہذا اگر ہم اچھے سامع بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے کانوں کے ساتھ ساتھ آنکھوں اور دل کو بھی استعمال میں لانا ہوگا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات، جسمانی حرکات و سکنات، آواز کے اتار چڑھاؤ اور لہجے کی مدد سے بہت ساری اُن کہی باتوں کو بھی سمجھنا ہوگا اور یہ جاننا ہوگا کہ وہ واقعتاً کہنا کیا چاہتا ہے۔

(ii) دوسرے کی دلی کیفیت پڑھنا

ہر انسان کے ذہن میں کئی قسم کے خوف، مصلحتیں اور اندیشے ہوتے ہیں جن کی بناء پر وہ سب کچھ کہہ نہیں پاتا جو اُس کے دل میں ہوتا ہے۔ لہذا حقیقی سامع بننے کیلئے ہمیں دوسرے شخص کے دل میں جھانکنا ہوگا اور اُس کے اندر روئی جذبات سے آگاہ ہونا ہوگا۔ نیز پوری دیانتداری کے ساتھ اُس کے انداز میں سوچنا ہوگا کہ وہ کس نقطہ نظر اور کس مقام فکر سے چیزوں کو دیکھ رہا ہے۔ ورنہ ہم اُسے صحیح طور پر نہیں سمجھ سکیں گے اس کی مثال یوں ہے کہ دو اشخاص نے مختلف رنگوں کی عینکین لگا رکھی ہوں تو دونوں کو چیزیں اپنے اپنے رنگ کے مطابق دکھائی دیں گی۔ اور دونوں اپنے اپنے مشاہدے کے مطابق بیان کر رہے ہوں گے۔ دونوں کے بیانات میں تضاد ہوگا مگر وہ اپنی اپنی جگہ خود کو صحیح سمجھ رہے ہوں گے لہذا حقیقت تک پہنچنے کیلئے پہلے تو دوسرے کی عینک کے رنگ کو سمجھنا ہوگا کہ وہ کس زاویہ نگاہ سے چیزوں یا معاملات کو دیکھ رہا ہے اور پھر اپنی آنکھوں سے مخصوص رنگ (تعصبات اور پسند و ناپسند وغیرہ) کی عینک کو اتار کر قدرتی رنگ کی عینک سے (غیر جانبدارانہ انداز میں) معاملات کا جائزہ لینا ہوگا۔

(iii) دوسرے کی طرح محسوس کرنا

ہم نفسِ سماعت کا تیسرا تقاضا ہے کہ اپنے احساس کو دوسرے شخص کے احساس کی سطح پر لا کر اُس کی کیفیات کو خود محسوس کرنا۔ لہذا پہلا تقاضا صرف دوسروں کی لفظی اور غیر لفظی زبان (verbal & non verbal language) کو غور سے سننے کا مطالبہ کرتا ہے دوسرا تقاضا ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے دوسرے کے انداز میں سوچنے کی بات کرتا ہے تیسرا تقاضا اس سے بھی آگے بڑھ کر دوسرے کے اوپر بیتنے والی کیفیات کو خود اپنے اوپر وارد کرتے ہوئے انہیں محسوس کرنے کی تلقین کرتا ہے اور یہاں آ کر ”ہم نفسِ سماعت“ کا مضمون مکمل ہو جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

مثل المؤمنین فی توادھم وتراحمهم وتعاطفهم کمثل الجسد الواحد ان

(۱۳)

اشتکی عضو منه تداعلی له سائر الجسد بالسهر و الحمی.

”آپس میں محبت و مودت، رحمت و شفقت اور ہمدردی و خیر خواہی کے حوالے سے مومنوں کی مثال ایک جسم کی ہے کہ اگر اُس کے کسی عضو میں درد ہو تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

مندرجہ بالا حدیث مبارکہ میں بڑی خوبصورت تمثیل کے ذریعے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ دوسروں کی کیفیات کو محسوس کرنا کیا ہوتا ہے؟ پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو آنسو آنکھوں سے بہہ رہے ہوتے ہیں اور پورے جسم کا ہر عضو اس طرح بے قرار ہو جاتا ہے جیسے یہ معاملہ خود اُس کے ساتھ بیت رہا ہو۔

جو بات یہاں مسلمانوں کے باہمی معاملات کے ضمن میں کہی گئی ہے وہی کچھ ہمیں ہم نفس سماعت (ہم نفس سماعت) کے ضمن میں بھی کرنا ہے۔ اس بات کو مزید بہتر انداز میں سمجھنے کے لیے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ سے ایک مثال لیتے ہیں۔ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ایک شخص زما نہ جاہلیت کی رسوم کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اُس کی ایک بچی تھی جس کو وہ زندہ دفن کرنے کیلئے گھر سے لے جا رہا تھا۔ بچی راستے میں اپنے معصومانہ انداز میں باپ سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ پھر ایک ویرانے میں جا کر گڑھا کھودا۔ بچی بے خبری میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی پھر اُسے اٹھا کر گڑھے میں پھینک دیا۔ بچی ”ابو“ ”ابو“ کہتی رہی اور اس شخص نے اُس کی چیخ و پکار کو خاطر میں نہ لائے بغیر اوپر مٹی ڈال کر اُسے دفن کر دیا۔ یہ واقعہ سنانے کے بعد جب صحابی حضور ﷺ کے چہرہ اقدس کی طرف دیکھا تو چشمان مقدس سے آنسو جاری دکھائی دیے۔ اب یہ واقعہ کئی سال پہلے کا تھا اور اب محض اُس کی کہانی سنائی جا رہی تھی مگر حضور ﷺ اُس واقعے کو اس طرح محسوس کر رہے تھے جیسے ابھی ہو رہا ہو اور خود آقا ﷺ پر بیت رہا ہو۔ جب تک اُن محسوسات کو اپنے اوپر طاری نہ کیا جائے آنکھوں میں آنسو نہیں آسکتے اور انسان محض اسے ایک کہانی سمجھ کر ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہے۔

ہم نفس سماعت کے فوائد

”ہم نفس سماعت“ کے نتیجے میں حیران کن فوائد حاصل ہوتے ہیں جن میں سے چند ایک نمایاں

ہیں:

- ۱- ”ہم نفس سماعت“ کے تحت سنا ایک طاقتور عمل ہے یہ ہمیں تمام ضروری معلومات (Data) فراہم کر دیتا ہے جس کی مدد سے ہم کسی بھی زیر بحث مسئلے یا معاملے میں حقائق تک پہنچ جاتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں صحیح تشخیص کر لیتے ہیں اور جب تشخیص صحیح ہو جاتی ہے تو پھر نسخہ تجویز کرنا (یعنی معاملے کو حل کرنا) بہت آسان ہو جاتا ہے۔
- ۲- ”ہم نفس سماعت“ کے تحت سننے میں دوسرے شخص کو اپنی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اُسے اہمیت دی جا رہی ہے۔ چنانچہ قدرتی طور پر اُس کے دل میں ہمارے لئے احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ چیز تعلقات کے جذباتی اکاؤنٹ میں بہت بڑی رقم جمع کروانے (Deposit) کے مترادف ہوتی ہے اور اعتماد کی سطح کو بلند کر دیتی ہے۔
- ۳- جب ”ہم نفس سماعت“ کے تحت سنا جاتا ہے تو دوسرے شخص کا اعتماد بڑھتا چلا جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ ہمارے ساتھ کھلتا چلا جاتا ہے اور بہت سی ایسی باتیں بھی بتانے پر آمادہ ہو جاتا ہے جو پہلے بتانے کیلئے تیار نہیں تھا۔ یہ گویا پیاز کو چھیلنے والی بات ہے جس میں ہم ایک کے بعد ایک تہہ اُتارتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر اندرونی نرم حصے تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم دوسرے شخص کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیتے ہیں اور پوری توجہ اور ہمدردی سے اُسے سننے ہیں تو وہ زیادہ آزادانہ ماحول میں اپنے مسائل بیان کرتا ہے۔ پھر بہت مرتبہ تو یوں ہوتا ہے کہ اس خوشگوار فضا میں اپنے مسائل کو بیان کرتے ہوئے اُن کے حل بھی خود اُس کے اپنے ذہن میں آنا شروع ہو جاتے ہیں اور جہاں کوئی بات اُس کی اپنی سمجھ میں نہ آرہی ہو وہاں ہم اُس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ اُسے بہتر مشورہ دے سکیں۔
- ۴- جب ”ہم نفس سماعت“ کے تحت سنا جاتا ہے اور دوسرے کو اپنی بات اطمینان سے مکمل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے تو اُسے ایک نفسیاتی تسکین مل جاتی ہے۔ پھر قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اُس کے اندر ہماری طرف سے آنے والے مشورے یا نصیحت کے لئے قبولیت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اُسے اچھی طرح سے سمجھ لیا گیا ہے اور اب اُسے جو مشورہ ملے گا وہ یقیناً اپنے اندر اُس کے لئے بہتری کا پہلو لئے ہوئے ہوگا۔ یہ ایک فطری اصول ہے کہ دوسروں کو متاثر کرنے کیلئے پہلے ہمیں اُن سے متاثر ہونا پڑتا ہے۔ متاثر ہونے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ ہم دوسرے شخص کے نظریات کو من و عن قبول کر لیں۔ اس کا

مطلب تو فقط یہ ہے کہ ہم اُس کی بات کی تائید یا تردید کرنے سے پہلے اُس کی بات کو اچھی طرح سمجھ اور محسوس کر لیں کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُس کی انفرادیت کو تسلیم کر لیں۔ جب تک ہم دوسروں کی انفرادیت سے اثر انداز نہیں ہوں گے تب تک وہ ہماری طرف سے آنے والی نصیحت کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ گویا ہمیں دوسروں سے اہمیت لینے کیلئے پہلے انہیں اہمیت دینا ہوگی۔

۵۔ جب ”ہم نفس سماعت“ کے تحت سنا شروع کیا جاتا ہے تو ہمارے ذہنی افق (vision) میں بہت زیادہ وسعت آنا شروع ہو جاتی ہے اور ہمیں اندازہ ہونے لگتا ہے کہ لوگوں کے ادراک میں کتنا زیادہ فرق ہے اور اس فرق کا کتنا زیادہ اثر اُن کے رویوں پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے باہمی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص لاہور کے نقشہ کو ایک طرف سے دیکھے گا تو اُسے کچھ اور دکھائی دے رہا ہوگا اور دوسرا کسی دوسری جانب سے دیکھے گا تو اُسے کچھ اور دکھائی دے گا اور پھر دونوں اپنے اپنے مشاہدے کے مطابق تشریح کریں گے تو ان میں بہت اختلاف ہوگا جبکہ حقیقت میں وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہوں گے۔ اس طرح ایک شخص زندگی کے مسائل، مصائب، مشکلات اور رکاوٹوں پر غور کرنے لگے تو اُسے دنیا ”مسائلستان“ دکھائی دے گی اور دوسرا شخص زندگی کی خوشیوں، مسرتوں، راحتوں اور نعمتوں پر نگاہوں کو مرکوز کر لے اُسے دنیا جنت کا نمونہ دکھائی دینے لگے گی۔ تو لوگوں کا زاویہ نگاہ اور انداز فکر اُن کے مشاہدات میں بہت زیادہ فرق پیدا کر دیتا ہے۔ عام لوگ اس فرق کو باہمی اختلافات اور تنازعات کا سبب بنا لیتے ہیں۔ جبکہ حقیقی سماعت کے فن سے آشنا لوگ اپنے وسیع ذہنی تناظر کی بدولت اس فرق کو سمجھ کر نئے امکانات تک پہنچے اور مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

۶۔ ”ہم نفس سماعت“ میں وقت ضرور لگتا ہے مگر بعد میں یہی چیز ہمارے لئے وقت بچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ حقیقی سماعت کو نہ اپنا کر جو غلط فہمیاں اور گلے شکوے پیدا ہوتے ہیں اُن کو حل کرنے میں صرف ہونے والا وقت اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے متعلقین کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے میں وقت لگاتے ہیں تو وہ وقت کھلے ابلاغ کے منافع کی صورت میں ہمیں واپس مل جاتا ہے۔ جب دوسروں کے ساتھ ہمارا صحیح ابلاغ قائم ہو جاتا ہے تو پھر بہت سارے مسائل جو کسی بھی اجتماعیت (گھر، خاندان، دفتر وغیرہ) میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ

پیدا ہی نہیں ہوتے اور جو ہوں انہیں بھی خوش اُسلوبی سے حل کر لیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب ہم واقعی ایک دوسرے کو گہرے طور پر سمجھنے لگتے ہیں تو پھر ہم مسائل کے حقیقی حل اور تبدلات کا دروازہ کھولتے ہیں۔ ہمارے اختلافات ابلاغ اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے بلکہ وہ اتحاد عمل کی طرف بڑھنے میں ہمارے مددگار بن جاتے ہیں۔

چند اشکالات اور اُن کے جوابات

”ہم نفس سماعت“ کے تحت سننے کے حوالے سے ذہنوں میں چند اشکالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ اشکالات اور اُن کے جوابات ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ اس حوالے سے پہلا سوال جو ذہنوں میں آسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح تو ہم اپنے آپ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں جس کے نتیجے میں عین ممکن ہے کہ ہم دوسروں سے متاثر ہو جائیں اور ہماری زندگی کی روش تبدیل ہو جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نفس سماعت کے تحت سننا ہمارے سفر کا آغاز نہیں ہے۔ اس سے پہلے ہم کافی سفر کر چکے ہیں۔ شاہراہ کامیابی پر چلتے ہوئے یہ ہمارے سفر کے دوسرے مرحلے کا ایک حصہ ہے۔ جس کا تعلق تسخیر ماحول کے ساتھ ہے۔ پہلے مرحلے میں جب ہم تسخیر ذات کی تین عادات کو اپنے اندر سمو چکے ہوں گے اور اپنے اندر مضبوطی اور استحکام پیدا کر چکے ہوں گے، ہماری زندگی میں ایک واضح نصب العین آچکا ہوگا اور ہماری اقدار حیات متعین ہو چکی ہوں گی تو پھر اس بات کا کوئی امکان نہیں ہوگا کہ ہم محض دوسروں کو سننے میں ہی اُن سے متاثر ہو جائیں اور اپنے طے شدہ اصولوں سے انحراف کر لیں۔ اس کی بجائے یوں ہوگا کہ ہر چیز کے حسن و قبح کو پرکھنے کیلئے ہمارے پاس ایک اپنا معیار (standard) ہوگا جس پر جانچ کر ہم ہر معاملے کی حقیقت تک پہنچ سکیں گے۔ ہم نفس سماعت کے تحت سننا ہمیں دوسروں کے نقطہ نظر کو بالکل صحیح سمجھنے کے قابل بنا دے گا اور پھر ہم اپنے ذہنی تناظر میں اُس کا جائزہ لیتے ہوئے جوابات صحیح ہوگی اُسے قبول کر لیں گے اور جہاں کہیں دوسرا فکری لغزش کا شکار ہو رہا ہوگا وہاں اُس کی غلطی کو بہتر انداز میں اُس پر واضح کر دیں گے۔

۲۔ اس حوالے سے جو دوسری بات ذہنوں میں آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح تو وقت کا بہت زیادہ ضیاع ہوگا اور وقت ہی تو ہمارے پاس سب سے قیمتی دولت ہے پھر ہم اُسے اتنے اسراف کے

ساتھ خرچ کرنے کے متحمل کیونکر ہو سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقی سماعت میں وقت ضرور لگتا ہے مگر۔۔۔۔۔ اس طرح ہم احساس کے تحت سننے میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ اُس سے زیادہ منافع کی صورت میں ہمیں مل جاتا ہے۔

۳۔ ایک تیسرا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے دن رات کا بیشتر حصہ عموماً دوسروں کے ساتھ بات چیت میں ہی صرف ہوتا ہے اگر ہم ہر جگہ ”ہم نفس سماعت“ کے تحت سننے لگیں گے تو یہ ایک خاصا مشقت طلب اور تھکا دینے والا کام ہے اس طرح تو زندگی ٹھنڈی کر رہ جائے گی اور اکتاہٹ اور بوریٹ کا شکار ہو جائے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ہر وقت اس فارمولے کو اپنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے ہم اُس وقت استعمال کریں گے جب کسی اہم یا سنجیدہ موضوع پر گفتگو ہو رہی ہو یا جہاں کوئی معاملہ طے کرنا ہو یا کوئی مسئلہ حل طلب ہو وغیرہ۔ جہاں تک روزمرہ کی عمومی گفتگو اور بلکی پھلکی بات چیت کا تعلق ہے تو وہاں اُس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے اور وہاں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ نے کسی سنجیدہ معاملے میں دوسرے کو سنے اور سمجھے بغیر کوئی رائے، مشورہ یا نصیحت کرنے کی کوشش کی تو یہ بالکل ایسے ہی ہو گا جیسے ایک ڈاکٹر مریض سے یہ کہے کہ میرے پاس تشخیص کا وقت نہیں ہے۔ بس تم یہ نسخہ لے لو اور استعمال کر لو۔ لہذا جہاں کوئی نسخہ تجویز کرنا ہو تو پھر تو تشخیص کیلئے درکار وقت لگانا ہی چاہیے اور جہاں تفریح کے طور پر گفتگو ہو رہی ہو یا عام فہم گفتگو ہو رہی ہو تو وہاں اسے عمل میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر سمجھائیں

عادت نمبر ۵ کا پہلا نصف حصہ دوسروں کی بات سننے اور سمجھنے کے گرد گھومتا ہے جب کہ دوسرا نصف حصہ دوسروں کو اپنی بات سنانے اور سمجھانے پر زور دیتا ہے اور یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا پہلا نصف حصہ۔ پہلے حصے پر زور اس لئے دیا جاتا ہے کہ ہم لوگ عموماً اپنی بات کہنے کے جوش میں اسے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم پہلے حصے پر ہی زور دیتے رہیں اور دوسرے کو نظر انداز کر دیں تو نتیجہ ”دوسروں کی جیت“ اور ”ہماری ہار“ کی صورت میں نکلے گا اور یہ بھی کوئی مثالی صورت حال نہیں ہوگی۔ کیونکہ جس طرح ہمارا ادراک غلطی کر سکتا ہے اسی طرح دوسروں کی فکر بھی لغزش کا شکار ہو سکتی ہے چنانچہ ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جہاں ہم دوسروں کے اندر غلطی محسوس کریں تو انہیں آگاہ کر دیں تاکہ وہ انہیں دور کر سکیں اور

اس مقصد کیلئے اپنی بات سمجھانے کا حوصلہ ہمارے اندر ہونا ضروری ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

المومن مرءة المومن. (۱۴)

”مومن، مومن کیلئے آئینہ ہوتا ہے۔“

جس طرح آئینہ اپنے سامنے آنے والے کے خدوخال اور حسن و قبح بغیر کسی کمی بیشی کے اُس کے سامنے رکھ دیتا ہے اور پھر اُس کی روشنی میں اُس کے لئے اپنے آپ کو بہتر بنانا آسان ہو جاتا ہے۔ اُسی طرح ہمیں بھی ایک دوسرے کی ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبے کے تحت ایک دوسرے کی کمیوں، خامیوں، کوتاہیوں، غلطیوں اور لغزشوں کی نشاندہی کرنی ہوتی ہے۔ جس کے لئے دوسروں کو اپنی بات موثر انداز میں سمجھانے کے ہنر سے آشنا ہونا بہت ضروری ہے۔

اس حوالے سے قرآن مجید نے بنیادی اصول یہ دیا ہے:

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط (۱۵)

”اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ، حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور اُن سے بہترین انداز میں بحث کرو۔“

یہ آیت کریمہ اگرچہ دعوت و تبلیغ دین کے حوالے سے ہے تاہم جو اصول یہاں دیئے گئے ہیں وہی عمومی زندگی کے لئے بھی ہیں۔ یہاں ”بالحکمة“ اور ”موعظتہ الحسنۃ“ کے الفاظ اتنے جامع ہیں کہ وہ اپنے اندر حسنِ تکلم اور موثر گفتگو کے تمام لوازمات کو سموئے ہوئے ہیں۔ پھر اگلی ہدایت یہ دی گئی ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں بھی جو بحث مباحثہ کرنا ہے وہ اتنے احسن انداز میں ہونا چاہیے کہ نوبت لڑائی جھگڑے اور تعلقات کی خرابی تک نہ پہنچ جائے۔ بلکہ اختلافات کو خوش اسلوبی سے حل کرنا ہے۔

اپنی بات سمجھانے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک حوصلہ اور دوسرا فنِ گفتگو سے آشنائی۔ حوصلے سے مراد یہ ہے کہ انسان کے اندر اتنی اخلاقی جرات موجود ہو کہ وہ دیانتداری کے ساتھ جس بات کو جس انداز میں محسوس کرتا ہے وہ دوسروں کے سامنے بیان کر سکے۔ کوئی خوف اور مصلحت اُسے اپنی رائے کے اظہار سے روک نہ سکے۔

فن گفتگو کے لوازمات

جہاں تک فن گفتگو سے آشنائی کا تعلق ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ انسان گفتگو کی نزاکتوں اور لطافتوں سے آگاہ ہو اور جاننا ہو کہ موثر گفتگو کیسے کی جاتی ہے۔ گفتگو کے اُسلوب اور لہجے میں کن باریکیوں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے اور وہ کون سے تقاضے ہیں جن کو پورا کرنے سے گفتگو سننے والوں کے دلوں اور دماغوں کے دروازوں پر دستک دیتی چلی جاتی ہے اور اُن کے اندر اپنے لئے قبولیت کا مادہ پیدا کرتی چلی جاتی ہے اچھی اور موثر گفتگو کے بہت سارے لوازمات ہو سکتے ہیں تاہم اُن میں سے چند نمایاں درج ذیل ہیں۔

(i) لہجہ میں نرمی

موثر گفتگو کا ایک تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے رویے میں نرمی اختیار کرے کسی بھی موضوع پر گفتگو ہو رہی ہو تو اُس کے لہجے میں تلخی اور شدت نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ رب العزت نے نرمی میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ دلوں کو موہ لیتی ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ ۗ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۗ (۱۶)

”پس یہ اللہ کی خاص رحمت ہے کہ آپ ﷺ اُن کے لئے نرم دل ہیں۔ اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ ﷺ سے دور بھاگ جاتے۔“

چنانچہ حضور ﷺ نے جو لوگوں کے دلوں کو موہ لیا تھا تو اُس کے اندر آپ ﷺ کے بہترین اور اعلیٰ درجے کے کردار کے ساتھ ساتھ دوسروں کے ساتھ آپ ﷺ کا نرم رویہ بھی شامل تھا۔ حضور ﷺ نے نرمی کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ان الله رفيق ويحب الرفق و يعطى على الرفق ما لا يعطى على العنف وما لا يعطى على ما سواه. (۱۷)

”بے شک اللہ تعالیٰ نرمی کرتا ہے اور نرمی کرنے کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ دے دیتا ہے جو کچھ سختی پر نہیں دیتا۔ بلکہ کسی بھی اور طرح سے نہیں دیتا۔“

مضمون دوسروں سے ممتاز ہوتا تھا کہ پاس بیٹھنے والا یاد کر لیتا۔“

ایک بار حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیزی سے کوئی حدیث بیان کرنا شروع کی، ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اساتھ والے حجرے سے سن رہی تھیں، آپؓ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس طرح بات کرنے سے روکا اور فرمایا:

كان رسول الله ﷺ ليحدث الحديث لو شاء العاد ان يحصيه احصاه. (۲۱)

”رسول ﷺ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے تھے کہ کوئی شخص آپ ﷺ کے الفاظ گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔“

اس ضمن میں یہ بات بھی ہے کہ اہم بات کو دہرا دیا جائے تاکہ مخاطب کو اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

كان رسول الله ﷺ يعيد الكلمة ثلاثاً لتعقل عنه. (۲۲)

”رسول اللہ ﷺ بات کو تین مرتبہ دہراتے، تاکہ اُسے سمجھ لیا جائے۔“

لہذا دوسروں کو اپنی بات اچھی طرح سمجھانے کیلئے گفتگو میں ٹھہراؤ ہونا نیز اہم بات کو سننے والے کی سہولت کیلئے دہرا دینا بھی خوشگوار اثرات کا حامل ہوتا ہے۔

(iii) گفتگو میں اختصار

گفتگو کے اندر حسن اور جاذبیت پیدا کرنے والی ایک اور چیز گفتگو میں اختصار کرنا ہے۔ یعنی گفتگو کو ذرا اتنا طویل نہ کیا جائے کہ سننے والے کی طبیعت بوجھل ہو جائے اور اُس کے اندر اکتاہٹ پیدا ہونے لگے۔ ایسی صورت میں اثر انگیزی کم ہو جاتی ہے۔ لہذا گفتگو کو اتنا ہی ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعے سے بات بھی دوسرے کی سمجھ میں آجائے اور اس پر کسی قسم کا ناخوشگوار اثر بھی نہ پڑے۔ حضور ﷺ نے غیر ضروری طویل گفتگو کو ناپسند فرمایا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

امرت ان اتجوز في القول فان الجواز هو خير (۲۳)

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں، کیونکہ اختصار بہترین ہے۔“

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کی نصیحتیں بھی اکثر و بیشتر ایک دو جملوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے اہم سوالات کے جوابات بھی آپ ﷺ نے چند الفاظ یا جملوں میں بیان فرما دیئے۔ یہ تو خیر رسول کی خصوصیت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

أعطيت جوامع الكلم. (۲۴)

”مجھے جوامع الکلم بنایا گیا ہے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ صلاحیت دی ہے کہ میں چند الفاظ میں زیادہ مفہوم بیان کر سکتا ہوں۔ ہمیں بھی اپنی روزمرہ گفتگو میں (اپنے امکان کی حد تک ہی سہی) اختصار سے کام لینا چاہیے۔ عربی زبان کا ایک قول ہے

خير الكلام ما قل و دل.

”بہترین کلام وہ ہے جو (الفاظ میں) تھوڑا ہو اور (زیادہ معنی پر) دلالت کرے۔“

اس سے ملتا جلتا قول انگریزی زبان میں یوں ہے

Brevity is the soul of Wit. (۲۵)

”اختصار گفتگو کی جان ہے۔“

لہذا گفتگو میں اختصار کرنا چاہیے تاکہ اُس کے اندر حسن پیدا ہو لیکن اتنی مختصر بھی نہ ہو کہ مخاطب

کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہم کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ میانہ روی ہی بہترین ہے۔ کقولہ علیہ السلام.

خير الامور اوسطها. (۲۶)

(iv) مخاطب کی نفسیات کا لحاظ

کامیاب اور موثر گفتگو کیلئے بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مخاطب کی نفسیات کو سمجھیں اور اُسے

ملحوظ خاطر رکھ کر گفتگو کریں۔ مخاطب کی ذہنی سطح، علمی استعداد، عقل و فہم کا معیار، اُس کا ذوق، مزاج اور

رجحان وغیرہ جیسی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کی جائے تو اُسے جلدی سمجھ میں آ جاتی ہے اور اگر ان

چیزوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو نتائج حوصلہ افزا نہیں ملتے۔ مثال کے طور پر ایک پرائمری شخص کے

ساتھ Ph.D سطح (level) کی گفتگو شروع کر دی جائے تو گفتگو کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو نتیجہ صفر ہی نکلے گا۔

(۱۰) گفتگو کو موثر دلائل سے مزین کرنا

پُر اثر گفتگو کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جہاں ضروری اور مناسب ہو ہم اپنے موقف کے حق میں ٹھوس اور مضبوط دلائل پیش کریں تاکہ بات میں وزن پیدا ہو اور سننے والے کیلئے اُسے سمجھنا اور قبول کرنا آسان ہو جائے۔ یہ دلائل قرآن مجید کی آیات، احادیث مبارکہ اور مشاہیر کے اقوال ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں روزمرہ زندگی کی عقلی مثالوں، تجربات و مشاہدات، استعارات اور تشبیہات سے بھی حسب ضرورت کام لیا جاسکتا ہے۔ حضور ﷺ وقتاً فوقتاً بات کو سمجھانے کیلئے ان ساری چیزوں سے کام لیتے رہے ہیں اور خود قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے بھی جا بجا مختلف قسم کی مثالوں کا استعمال کیا ہے اور لوگوں کو غور و فکر اور عقلی استدلال کو استعمال کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ جب اس حوالے سے کافروں نے اعتراض کیا تو اللہ رب العزت نے جواب یوں دیا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةٌ فَمَا فَوْقَهَا (۲۷)

”بے شک اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ مچھر کی مثال دے یا اس سے بھی کم تر چیز کی۔“

لہذا گفتگو کو زیادہ موثر اور جاندار بنانے کیلئے اُس میں حسب ضرورت عقلی و نقلی دلائل کا استعمال

ضروری ہے۔

(۱۱) غلطی کی نشاندہی میں حکیمانہ اُسلوب اپنانا

بعض اوقات ہمارا مخاطب غلطی پر ہوتا ہے اور ہمیں اُس کی غلطی کی نشاندہی کرنا ہوتی ہے۔ یہ بہت نازک موقع ہوتا ہے۔ ہماری ذرا سی غلطی معاملے کو بگاڑ سکتی ہے اور دوسرے کے ذہن کو منفی رخ پر چلا سکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں عین ممکن ہے کہ وہ اُسے اپنی انا کا مسئلہ بنا کر ڈٹ جائے اور اصلاح کو قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہو۔ لہذا یہاں ہمیں حکیمانہ اُسلوب اپنانا ہوگا جس کیلئے مندرجہ ذیل دو باتوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

(ا) پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے آپ سے پوچھیں میری یہ بات دوسرے کی واقعی مدد کرے گی یا میں محض اپنی اہمیت جتانے کیلئے ایسا کر رہا ہوں۔ اور اپنی انا کی تسکین کیلئے دوسرے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو رُک جائیں۔ ایسی نصیحت دوسرے کو فائدہ دینے کی بجائے اُلٹا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اصلاح کا کام تو اُس وقت بار آور ہوتا ہے جب اُس کی تہہ میں ہمدردی و خیر خواہی کا چشمہ اُبل رہا ہو۔

(ب) دوسری اہم بات یہ ہے کہ غلطی کی نشاندہی ایسے الفاظ میں کی جائے کہ دوسرے کو بُرا محسوس نہ ہو اُسے خود اُس کی اپنی اور دوسروں کی نظروں میں شرمندگی اور رسوائی سے بچایا جائے۔ اس مقصد کیلئے الفاظ کا انتہائی محتاط استعمال بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ ہی ہیں جو پٹرول کا کام دیتے ہیں کہ آگ لگا دیتے ہیں اور وہ بھی الفاظ ہی ہیں جو پانی کا کام دیتے ہیں اور لگی ہوئی آگ کو بجادیتے ہیں۔ الفاظ سے آگ کا کام لینا ہے یا پانی کا، اس کا انحصار بولنے والے پر ہے کہ وہ انہیں کس طرح سے اور کن معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسی بات کو سمجھانے کیلئے ایک مشہور مثال دی جاتی ہے کہ اگر کسی منجے کو کہا جائے کہ ”آپ منجے کیسے ہوئے“ تو اُس پر کوئی اور اثر ہوگا اور اگر پوچھا جائے کہ ”آپ کے سر کے بال کیسے جھڑے“ تو اُس صورت میں کوئی اور اثر ہوگا۔ حالانکہ دونوں صورتوں میں بات ایک ہی ہے لیکن الفاظ کے چناؤ (selection) نے اثرات میں فرق پیدا کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص سے کہا جائے کہ ”وہ آپ کے والد صاحب آرہے ہیں“ تو وہ ذرا بھی محسوس نہیں کرے گا، لیکن اگر اس جملے کو بدل کر یوں کہہ دیا جائے کہ ”وہ آپ کی والدہ کے شوہر صاحب آرہے ہیں“ تو عین ممکن ہے کہ نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچ جائے۔ حالانکہ یہاں بھی دونوں صورتوں میں بات ایک ہی ہے صرف الفاظ کا فرق ہے۔ لہذا ہمارے لئے روزمرہ کی زندگی میں بالعموم اور دوسروں کی غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے بالخصوص الفاظ کے استعمال میں انتہائی محتاط ہونا بہت ضروری ہے۔

پانچویں عادت اور قدیم یونانی حکمت

”پہلے سمجھنا اور پھر سمجھانا“ کے حوالے سے قدیم اہل یونان میں تین الفاظ پر مشتمل ایک فلسفہ رہا ہے جسے اس عادت کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔ اس فلسفہ میں عادت نمبر ۵ کے تمام پہلو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمودے گئے ہیں۔ یہ تینوں الفاظ ترتیب وار ہیں اور یہ مندرجہ ذیل ہیں۔ (۲۸)

کامیاب لوگوں کی خصوصی عادات

(i) ایتھاس (Ethos)

(ii) پیتھاس (Pathos)

(iii) لوگاس (Logos)

(i) ایتھاس

اس سے مراد ہماری ذاتی دیانتداری ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو، ہمارا وہ صاف شفاف کردار ہے جو لوہے اور فولاد کی طرح مضبوط اور مستحکم ہو، ہمارا وہ تشخص اور اہلیت ہے جس پر دوسروں کو اعتماد ہو اور جس کے نتیجے میں لوگوں کے ساتھ ہمارے جذباتی اکاؤنٹ میں بہت بڑی رقم موجود ہو اور وہ ہم پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنے کیلئے تیار ہوں۔ جب تک ہماری شخصیت کی بنیاد میں ہمارا یہ کردار پیدا نہیں ہوتا، ہم دوسروں کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے اور ان سے اپنی بات منوانے کی کتنی ہی ترکیبیں (Techniques) استعمال کر لیں، وہ خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکیں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ”کہنے“ اور ”کرنے“ کی بجائے لوگوں کی نظروں میں ہمارا ”ہونا“ کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ”کہنے“ سے مراد وہ تمام باتیں ہیں جو ہم دوسروں سے کرتے ہیں اور ”کرنے“ سے مراد وہ تمام حرکات و سکنات ہیں جو ہم دوسروں کے سامنے کرتے ہیں، اور دوسروں کی نظروں میں اپنا تاثر بہتر بنانے کیلئے دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو جس طرح پیش کرتے ہیں اور ”ہونے“ سے مراد ہماری وہ اصل شخصیت ہے جو کہ ہم فی الواقع ہیں اور جو خاموشی کے ساتھ زبان حال سے بول کر ہمارے متعلق لوگوں کو آگاہ کر رہی ہوتی ہے۔

اگر ہمارے پاس کردار کی یہ ٹھوس بنیاد موجود نہیں ہے تو پھر ہماری زبان سے نکلنے والے الفاظ اور ہماری جسمانی حرکات و سکنات کی حیثیت فلم یا سٹیج کی اداکاری کی ہوتی ہے جو سننے اور دیکھنے والوں پر کوئی بھی گہرا اثر مرتب نہیں کرتی۔ اگر وقتی طور پر لوگ ہماری باتوں اور ظاہری روپ سے دھوکہ کھا بھی جائیں تو چند ہی دنوں میں یہ مصنوعی تہہ اتر جاتی ہے اور ہماری اصلیت لوگوں پر آشکار ہو جاتی ہے اور ہم نے اپنے آپ کو لوگوں کے ذہنوں میں عظمت کی جس مصنوعی مسند پر بٹھا رکھا تھا وہ وہاں سے ہمیں اتار کر ہماری اصلی جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ دوسری طرف جب ہم اپنے ”ہونے“ کو بہتر بنانے پر توجہ دیتے ہیں، یعنی اپنے کردار کو سنوارتے، نکھارتے اور اُسے بلند کرتے ہیں۔ تو ہمارا یہ کردار مستقل شعاعیں خارج کرتا

رہتا ہے جو ہمارے ارد گرد کے لوگوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ کر ہماری طرف لاتی رہتی ہیں اور ان کے دلوں میں ہمارے لیے عزت و تکریم کے جذبات پیدا کرتی رہتی ہیں۔ یہ وہی بات ہے جس کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا ۝ (۲۹)

”بے شک وہ لوگ جنہوں نے ایمان قبول کیا اور نیک عمل کئے عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے لئے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔“

لہذا عادت نمبر ۵ پر خوش اسلوبی سے عمل پیرا ہونے کیلئے ہمیں اولین توجہ اپنے کردار کو بہتر بنانے پر دینا ہوگی، جس کیلئے عادات نمبر ۱، ۲، ۳، ۴ ہمیں بہترین رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔

(ii) پڑھنا

یہ وہ جذبہ اور احساس ہے جو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم اپنے آپ کو دوسرے لوگوں کی جگہ پر رکھ کر دیکھتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ہم ان کے خیالات کو ایک کھلی کتاب کی طرح پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور ان کے جذبات اور احساسات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور نہ صرف انہیں باہر سے بلکہ اندر سے بھی جان اور پہچان رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم ان کی باتوں کے پیچھے موجزن ان کی کیفیات، ضرورتوں، مجبوریوں، خدشوں اور خواہشوں کو بھی خاطر میں لا رہے ہوتے ہیں۔ عادت نمبر ۴ ہمارے اندر سب کی بہتری اور بھلائی چاہنے کا جذبہ اور احساس پیدا کرتی ہے۔ اور عادت نمبر ۵ کا پہلا نصف حصہ ہمیں عملی طور پر اس میں سے گزرنے کے قابل بنا دیتا ہے جہاں ”ہم نفس سماعت“ کے اصول کو اپناتے ہوئے ہم دوسروں کے دل و دماغ میں جھانکتے ہوئے ان کے زاویہ نگاہ سے حالات اور معاملات کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے احساسات کو ان کے احساسات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے وہ سب کچھ محسوس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جو دوسرے محسوس کر رہے ہوں۔

(iii) لوگاس

اس سے مراد وہ دلائل ہیں جو ہم اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر دوسروں کو اپنی بات سمجھانے کیلئے اپنی رائے کو دلیل کے ساتھ پیش کرنا لوگاس ہے۔

عادت نمبر ۵ کا دوسرا نصف حصہ اسی کے متعلق ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

اب ذرا ترتیب پر غور کریں۔ پہلے ایتھاس پھر پیتھاس اور آخر میں لوگاس۔ سب سے پہلے ہمارا کردار، پھر ہمارے تعلقات، اور آخر میں منطق اور دلائل کا نمبر آتا ہے لیکن زیادہ تر لوگ ایتھاس اور پیتھاس کو نظر انداز کرتے ہوئے براہ راست لوگاس پر پہنچ جاتے ہیں۔ گویا دوسروں کو اپنے کردار، اپنی بے لاگ دیانتداری اور اپنے قابل اعتماد ہونے کا یقین دلانے نیز اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر ان کا ہدم اور ہم احساس ہونے کو اولیت دینے کی بجائے اُسے پس پشت ڈالتے ہوئے براہ راست دلائل اور منطق سے دوسروں کو قائل کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور پھر مطلوبہ نتائج نہ ملنے پر خواہ مخواہ دوسروں کو الزام دینا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ ہماری بات سنتے، سمجھتے اور مانتے نہیں ہیں۔

حضور ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے دوسروں کو سمجھانے سے پہلے اپنے کردار کو اس حد تک بلند کر لیا تھا کہ آپ ﷺ کا لقب ہی ”صادق“ اور ”امین“ پڑ گیا تھا، اور آپ کی دیانتداری کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ان مراحل میں سے گزرنے کے بعد چالیس سال کی عمر مبارک میں آپ ﷺ نے دوسروں کو سمجھانا شروع کیا۔

تعلقات کی بحالی۔۔۔۔۔ اولین ترجیح

عادت نمبر ۵ کا بہت گہرا تعلق دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے سے ہے جو ایک طرف تو سماجی زندگی کی اولین ضرورت ہے اور دوسری طرف ہماری تمام تر ترقیوں، کامیابیوں اور کامرانیوں کا دار و مدار بھی خوشگوار تعلقات پر ہے۔ کیونکہ اسی طرح ہمیں دوسروں کی طرف سے وہ مطلوبہ تعاون میسر آ سکتا ہے جو کسی بڑے معرکے کو سر کرنے کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ اگر ہمارے اپنے متعلقین میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلقات خراب ہو جائیں تو ہمیں پہلی فرصت سے بھی پہلے بالمشافہ ملاقات کے ذریعے بات چیت کر کے افہام و تفہیم کے ذریعے تعلقات کو معمول پر لے آنا چاہئے۔ اس حوالے سے غفلت آگے چل کر سنگین نتائج کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے ریل کی پٹری کا کاٹنا جب بدلتا ہے تو ابتداء میں فاصلہ چند انچ کا ہوتا ہے لیکن آگے چل کر یہی فاصلہ میلوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ باہمی تعلقات کا بھی ہے اگر باہمی رنجشوں، گلوں، شہوؤں اور غلط فہمیوں کو بروقت دور نہ کر لیا جائے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رائی کا پہاڑ بنتا چلا جاتا

ہے اور محبت کو نفرت میں اور دوستی کو دشمنی میں بدل ڈالنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

پانچویں عادت کی اہمیت

پانچویں عادت آپس میں خوشگوار اور پائیدار تعلقات قائم کرنے اور انہیں برقرار رکھنے کے ضمن میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس عادت کو استعمال کر کے ہم دوسروں کو گہرے طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً انہیں صحیح معنوں میں سراہنے کے قابل بھی ہو جاتے ہیں اور جو اب ان کی طرف سے ہمیں بھی عزت، پیار اور احترام ملتے ہیں۔ یہ عادت ہمیں ہمارے خیالات کی پیشکش میں زیادہ درست اور عزت دار بنا دیتی ہے اور لوگوں کو اس بات کا یقین داتا ہے کہ چونکہ ہم نے بات کرنے سے پہلے ضروری حقائق اکٹھے کر لیے ہیں لہذا ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ سب کیلئے فائدہ مند ہوگی۔ چنانچہ وہ ہماری بات کو زیادہ بہتر انداز میں سننے، سمجھنے اور قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ عادت نمبر ۵ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ایک طاقتور عادت ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے اثر کے دائرے کے اندر واقع ہے۔ باہمی انحصار کی صورتحال میں بہت سے عناصر ہمارے تعلق کے دائرے میں ہوتے ہیں۔ مسائل، اختلاف رائے اور دوسرے لوگوں کے رویے وغیرہ جیسی چیزیں ہمارے تعلق کے دائرہ میں ہوتی ہیں اور ان پر ہمارا براہ راست کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ اگر ہم اپنی توانائیوں ان چیزوں پر مرکوز کر دیں تو پھر ہم وقت کو ضائع کرتے چلے جائیں گے اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن سب سے دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کرنا ایسی چیز ہے جو مکمل طور پر ہمارے اپنے ہی بس میں ہے اور اس کے نئے ہمیں کسی کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہذا جوں جوں ہم اس پر توجہ مرکوز کرتے ہیں ویسے ویسے دوسروں کو گہرے انداز میں سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے پاس کام کرنے کیلئے معلومات دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ہم مسائل کی تہ تک پہنچنے لگتے ہیں۔ ہمارے جذباتی اکاؤنٹ میں ”رتم“ بڑھنے لگتی ہے اور اس سب کے نتیجے میں ہم دوسروں کے ساتھ زیادہ موثر طریقے سے کام کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

حرف آخر

پانچویں عادت۔ ہمارے لیے بڑا اثر کارفرما ہے اور اس کے نتیجے میں ہم زیادہ سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔

تعالیٰ نے ہمیں سننے کیلئے دو کان اور بولنے کیلئے ایک زبان عطا فرما رکھی ہے۔ لہذا ہمیں ان کی اہمیت و ضرورت کے مطابق دانشمندانہ طور پر استعمال میں لانا چاہیے۔ نہ تو ان کا غلط استعمال (Miss use) کرنا چاہیے اور نہ ہی ان کا کمتر استعمال (Under use) کرنا چاہیے۔

عملی مشورہ جات

۱۔ پانچویں عادت کا تعلق دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے سے ہے اور دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی اولین شرط ہے خود اپنے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کر لینا۔ اپنے آپ کو ٹھوس، مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر کھڑا کر لینا۔ جب تک کوئی شخص اپنے ساتھ کامیاب نہیں ہوتا، اُس کا دوسروں کے ساتھ کامیاب ہونے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ لہذا پلٹ کر دیکھ لیں کہ کیا آپ پہلی تین عادات کے ذریعے اپنے آپ کو اپنے قدموں پر کھڑا کر چکے ہیں اگر اس حوالے سے کوئی کمی ہے تو اُسے پورا کریں۔

۲۔ جس طرح ایک درخت کے اندر پہلے جڑ ہوتی ہے اور پھر تپتا ہوتا ہے اسی طرح تسخیر کائنات کے ضمن میں عادت نمبر ۴ کی حیثیت جڑ کی ہے جبکہ عادت نمبر ۵ کی حیثیت تنے کی۔ جب تک عادت نمبر ۴ کے ذریعے جیت ر جیت کی سوچ ہمارے مزاج کا حصہ نہیں بنے گی، ہمارے لئے عادت نمبر ۵ پر خوش اسلوبی سے عمل پیرا ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ لہذا عادت نمبر ۴ کے حوالے سے بھی جائزہ لے لیں کہ کیا آپ نے گہری سوچ و بچار اور عملی اقدامات کے ذریعے اُسے اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیا ہے؟ اگر اس حوالے سے کوئی کمی ہو تو اُسے بھی پورا کر لیں۔

۳۔ کسی فارغ وقت میں بیٹھ کر غور کریں کہ آپ کا زیادہ وقت بولنے میں صرف ہوتا ہے یا سننے میں۔ پھر اس حوالے سے مناسب تبدیلی لائیں۔ کوشش کریں کہ بولنے کی نسبت سننا زیادہ ہو۔ کیونکہ بولنے کیلئے زبان ایک ہے جبکہ سننے کیلئے کان دو ہیں۔

۴۔ سننے کے پانچ ناقص انداز کے حوالے سے غور کریں اور دیکھیں کہ آپ کے اندر کون سا انداز پایا

جاتا ہے اور اُس میں بہتری لانے کیلئے کیا کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ جب لوگ باتیں کر رہے ہوں تو اُن کے الفاظ کو توجہ سے سننے کے ساتھ ساتھ اُن کے چہرے کے تاثرات اور جسمانی حرکات و سکنات کو بھی غور سے دیکھا کریں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کس انداز سے کہہ رہے ہیں؟ اُن کے جسم کی زبان (Body language) کس حد تک اُن کے الفاظ کی تصدیق اور تردید کر رہی ہے۔ اس کام کو اکٹھا ہٹ اور بیزاری سے کرنے کی بجائے دلچسپی اور تجسس سے کریں۔

۶۔ کسی ایسے تعلق کا انتخاب کریں جس کے ساتھ آپ کا جذباتی اکاونٹ تقریباً ختم ہو چکا ہو اور تعلقات سرد مہری کا شکار ہو چکے ہوں۔ ہر قسم کے تعصبات سے اوپر اٹھ کر غور کریں کہ آپ نے اُس کو سننے اور سمجھنے میں کہاں کہاں غلطی کی اور اُس کا ازالہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہو سکے تو اُس کے ساتھ ایک نشست رکھ کر اُن غلطیوں کی تلافی کریں۔ اُسے سمجھنے کی نیت سے غور سے سنیں۔ نتائج حیران کن ہوں گے۔

۷۔ اپنی گفتگو کے انداز کا بغور جائزہ لیں کہ آپ کیا کہتے ہیں اور کس انداز میں کہتے ہیں۔ گفتگو کی رفتار، آواز کے اتار چڑھاؤ اور لب و لہجہ میں کون کون سی کمیاں اور خامیاں ہیں جو گفتگو کی اثر انگیزی کو متاثر کر دیتی ہیں۔ اُن غلطیوں کو کوشش، محنت اور استقلال کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کریں۔

حواشی

- ۱۔ ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح، ۱۰/۱۱۰
- ۲۔ بنی اسرائیل، ۱۷:۳۶
- ۳۔ البقرہ، ۲:۱۸
- ۴۔ الاعراف، ۸:۱۷۹
- ۵۔ الحج، ۲۲:۳۶
- ۶۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۷۵
- ۷۔ البقرہ، ۲:۱۰۴
- ۸۔ ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح، ۱/۳۳۲
- ۹۔ انعام، ۶۸:۴
- ۱۰۔ الازہری، محمد کرم شاہ، حیر، ضیاء النبی ﷺ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۳۱۳ھ، ۲/۲۸۰
- ۱۱۔ ثناء اللہ محمود، مفتی، رسول اکرم ﷺ کا اندازِ تربیت، دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۳۲۸
- ۱۲۔ ملک غلام مرتضیٰ، ڈاکٹر، خطباتِ حرم، ملک سنز پبلشرز و بک سیلرز، لاہور، ص ۳۱۰
- ۱۳۔ مسلم الصحیح، رقم: ۲۵۸۶، ۳/۹۹۹
- ۱۴۔ مبارک پوری، ابو العلاء محمد عبد الرحمن بن عبد الرحیم (۱۲۸۳-۱۳۵۳ھ)۔ تحفۃ الاحوذی۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۶/۲۸
- ۱۵۔ النحل، ۱۶:۱۲۵
- ۱۶۔ آل عمران، ۳:۱۵۹
- ۱۷۔ مسلم الصحیح، رقم: ۲۵۹۳، ۳/۲۰۰۳
- ۱۸۔ طہ، ۲۰:۴۴
- ۱۹۔ ابوداؤد، السنن، رقم: ۴۸۳۹، ۳/۲۶۱
- ۲۰۔ ترمذی، السنن، رقم: ۴۶۳۹، ۵/۶۰۰

- ۲۱۔ ابوداؤد، السنن، رقم: ۳۶۵۳، ۳/۳۰
- ۲۲۔ ترمذی، السنن، رقم: ۳۶۴، ۵/۶۰۰
- ۲۳۔ ابوداؤد، السنن، رقم: ۵۰۰۸، ۳/۳۰۲
- ۲۴۔ مسلم، الصحیح، رقم: ۵۲۳، ۱/۳۷۱
- ۲۵۔ Current English Dictionary, p 99
- ۲۶۔ ابن ابی شیبہ، المصنف، رقم: ۳۵۱۲۸، ۷/۱۷۹
- ۲۷۔ البقرہ، ۲: ۲۶
- ۲۸۔ اسلام کی روحانی قدریں۔ موت نہیں زندگی، ص ۳۶۰
- ۲۹۔ مریم، ۱۹: ۹۶

فصل سوم:

تعاون کا اصول اپنانا

دوسری جنگ عظیم (1945-1939ء) میں جب سر نیشنل چرچل کو برطانیہ کی قیادت کی ذمہ داری سونپی گئی تو انہوں نے ایک تاریخی جملہ بولا:

"(1) All my life has prepared me for this hour"

”میری آج تک کی ساری زندگی مجھے اس لمحے کے لئے

تیار کر رہی تھی۔“

کچھ ایسا ہی معاملہ یہاں ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہماری پہلی پانچ عادتیں ہمیں اس چھٹی عادت کو اپنانے اور اسے عمل میں لانے کیلئے تیار کر رہی تھیں۔ چنانچہ چھٹی عادت کا عنوان ہے ”تعاون کا اصول اپنانا“

چھٹی عادت کا مفہوم

اس کا مطلب ہے کہ معاشرتی اور سماجی زندگی میں رہتے ہوئے اپنی اور اپنے ماحول میں رہنے والے دوسرے لوگوں کی بہترین صلاحیتوں کی ترقی و نشوونما اور ان کے اظہار، اعلیٰ مقاصد کے حصول اور کامیابی و ترقی کی نئی سے نئی منزلوں کو طے کرنے کیلئے جہاں جہاں ضرورت ہو وہاں دوسروں کے ساتھ کھلے دل کے ساتھ تعاون کرنا اور جہاں ممکن ہو دوسروں کا تعاون حاصل کرنا۔ بالفاظ دیگر مختلف افراد معاشرہ کا اپنی انفرادی صلاحیتوں کو باہم ملاتے ہوئے اتحاد عمل کے ذریعے ایسے نتائج پیدا کرنا جو انفرادی طور پر پیدا کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہ ہوں۔

اللہ رب العزت نے کائنات کا نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی بھی انفرادی وجود اپنے

آپ میں کوئی بہت بڑی طاقت نہیں رکھتا۔ لیکن جب وہ دوسروں کے ساتھ ملتا ہے تو ایک طاقت معرض وجود میں آ جاتی ہے۔ مثلاً پانی کا ایک قطرہ اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں مگر یہی قطرات جب ملتے ہیں تو سمندروں، دریاؤں اور طوفانوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ جو اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو خس و خاشاک کی مانند بہا لے جاتے ہیں۔ ریت کے ذرات جب الگ الگ ہوتے ہیں تو آندھیاں اور ہوائیں اُنہیں اُڑائے پھرتی ہیں۔ مگر جب پہاڑوں اور چٹانوں کی شکل میں یکجا ہوتے ہیں تو اُن کی مضبوطی ضرب المثل بن جاتی ہے۔ اسی طرح اینٹیں اگر انفرادی حیثیت میں ہوں تو کوئی بھی شخص اُنہیں اٹھا کر ادھر سے ادھر پھینک سکتا ہے، مگر وہی اینٹیں جب ایک خاص ترتیب میں جوڑ دی جاتی ہیں تو پھر اُن سے بڑے بڑے قلعے اور مضبوط مکان معرض وجود میں آتے ہیں جہاں انسان اپنے آپ کو بیرونی دنیا کے حملوں سے محفوظ تصور کرتا ہے۔ یہی معاملہ افراد کا بھی ہے کوئی بھی فرد اپنی ذات میں کتنا ہی با صلاحیت ہو پھر بھی وہ تنہا کچھ نہیں ہے۔ اُس کی طاقت اور قوت کا راز دوسروں کے ساتھ اتحاد و اشتراک میں ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ نہیں (۲)

ایک طرف تو ہر شخص اپنی بقاء، ارتقاء، نشوونما اور ضروریات زندگی کی تکمیل کیلئے بے شمار دوسرے لوگوں کی مدد اور تعاون کا محتاج ہے اور دوسری طرف کامیابی کی بلند ترین چوٹی پر پہنچنے، بڑی مہمات کو سر کرنے اور اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بھی دوسروں کی صلاحیتوں اور استعدادوں کو استعمال کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی تمام کامیابیوں، ترقیوں اور ایجادات کا جب منظر غائر جائزہ لیا جاتا ہے تو اُن کے پس منظر میں ایک سے زیادہ افراد کی مشترکہ اور منظم کاوشیں دکھائی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ جہاں بظاہر منظر پر صرف ایک شخص دکھائی دیتا ہے وہاں بھی پیچھے جھانک کر دیکھا جائے تو پس منظر میں چند اور لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں جن کا بالواسطہ یا بلا واسطہ تعاون اُسے کسی نہ کسی سطح پر حاصل رہا۔ قدرت کا یہ قانون اتنا اٹل ہے کہ اس سے پیغمبروں کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا حالانکہ وہ ساری کائنات کے تمام انسانوں میں سے انتہائی برگزیدہ، چنے ہوئے اور دوسرے لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ نیز انہیں اللہ رب العزت کی خصوصی نصرت اور تائید بھی حاصل ہوتی ہے۔ جب

ہم انبیاء اکرام علیہم السلام کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ انہوں نے بھی اپنے پیروکاروں اور جانثاروں کی ایک ٹیم تیار کی جس کے ذریعے سے مطلوبہ مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے جدوجہد کی۔ جب سیدنا عمر فاروقؓ نے اسلام قبول کیا تو جبرائیلؑ اُپر سے یہ آیت لے کر آگئے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۳)

”اے نبی ﷺ! آپ کیلئے اللہ اور آپ کی اتباع کرنے والے مومنین کافی ہیں۔“

تعاون..... فطرت کا اہم اصول

فطرت کے نظام میں تعاون کا اصول اور اُس کے ثمرات جگہ جگہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

- ۱- دو پودے اگر ساتھ ساتھ لگائے جائیں تو اُن کی جڑیں آپس میں مدغم ہو جاتی ہیں اور مٹی کی کوالٹی کو بہتر بنا دیتی ہیں اور دونوں کی نشوونما بہتر طور پر ہوتی ہے۔ یہ نسبت اس صورتِ حال کے کہ دونوں پودوں کو فاصلے پر لگایا جائے۔
- ۲- لوہے یا لکڑی کا ایک شتیر اگر سومن وزن اٹھا سکتا ہو تو ایک کی بجائے دو شتیروں کو اکٹھا لگا دینے کی صورت میں وہ دوسو کی بجائے اڑھائی سو یا تین سومن تک وزن اٹھالیں گے۔
- ۳- ہمارے جسم کے سر سے لیکر پاؤں تک تمام اعضاء ایک دوسرے کے ساتھ مکمل ہم آہنگی سے تعاون کرتے ہیں تو جسم کا نظام بہترین طریقے سے چل رہا ہوتا ہے۔ جب اس توازن اور ہم آہنگی میں فرق آجاتا ہے تو نظام میں بھی خلل آجاتا ہے اور کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔
- ۴- کسی بھی بڑی مشینری کے اندر چھوٹے بڑے سینکڑوں پرزے ہوتے ہیں جو بڑے مربوط انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے ہوتے ہیں۔ نتیجتاً مشین رواں دواں رہتی ہے۔ لیکن جہاں کسی پرزے میں خرابی آجاتی ہے تو سارا نظام متاثر (Disturb) ہو جاتا ہے۔
- ۵- کسی بھی کھیل کے میدان میں ٹیم کے اندر مختلف صلاحیتوں کے حامل کھلاڑی موجود ہوتے ہیں۔ وہ تمام ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر باہمی تعاون کے اصول کو اپناتے ہوئے اپنی اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہیں تو نتیجہ شاندار کھیل کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ لیکن

اگر ان کے اندر تعاون اور توازن کی کیفیت برقرار نہ رہے تو ٹیم کی مجموعی کارکردگی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

۶۔ ایک اچھا میوزیکل گروپ تعاون کی بہترین مثال ہے۔ یہ محض طبلہ، گٹار یا وائلن پر مشتمل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تمام آلات مل کر خوبصورت آواز تخلیق کرتے ہیں۔ گروپ کے تمام ارکان کی صلاحیتیں مل کر ایک اچھا گانا تشکیل دیتی ہیں اور اکیلا گلوکار ایسی پرفارمنس کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔

گینڈے کی پشت پر بیٹھ کر کیتھے لکڑے لکڑے کھانے والا پرندہ بھی تعاون کی ایک مثال ہے۔ اس طرح پرندے کو کھانا مل جاتا ہے جبکہ گینڈے کا جسم بھی صاف ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام مثالوں میں جو بھی نتائج دکھائی دے رہے ہیں وہ سب کے سب دو یا دو سے زیادہ افراد یا اشیاء کے متحدہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہو رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فطرت سے سیکھے گئے اس سبق کو سماجی تعلقات میں کامیاب اور موثر طریقے سے استعمال میں لایا جائے تاکہ وہ نتائج حاصل ہو سکیں جن کو انفرادی طور پر حاصل کرنا کسی بھی فرد واحد کیلئے ممکن نہیں ہوتا۔

www.kitabosunnat.com

تعاون کی دو قسمیں

تعاون کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔

(i) غیر تخلیقی تعاون

یہ وہ تعاون ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ افراد کسی مجبوری، مصلحت یا ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہوتے ہیں۔ اس تعاون میں ہر فرد کے سامنے اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ اُسے دوسرے فرد سے غرض نہیں ہوتی، محض اپنا فائدہ ہوتا ہے جو اُسے دوسرے کے ساتھ تعاون پر مجبور کر رہا ہوتا ہے۔ ایسے تعاون کے اندر سطحی قسم کے نتائج تو پیدا کئے جاسکتے ہیں لیکن کسی بہت بڑی کامیابی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ایسے تعاون کی بنیاد خود غرضی پر ہوتی ہے۔

(ii) تخلیقی تعاون

یہ وہ تعاون ہے جہاں دو یا دو سے زیادہ افراد کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کیلئے ایک دوسرے سے

تعاون کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں اور دماغوں میں اتحاد، یگانگت اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ وہ ذاتی اغراض اور مفادات کے بندے نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوتے ہیں۔ وہ کسی مجبوری، مفاد یا وقتی مصلحت کیلئے ایک دوسرے سے تعاون نہیں کر رہے ہوتے بلکہ تعاون کو زندگی کے ایک اعلیٰ اصول کے طور پر اپنائے ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کیلئے عزت اور احترام کے جذبات ہوتے ہیں اور ان کا باہمی تعلق ”یک جان دو قالب“ کا سا ہوتا ہے۔ اس تعاون کی بنیاد ایثار اور قربانی پر ہوتی ہے اور تاریخ کی تمام ترقیاں اور کامیابیاں اس طرح کے تعاون کی مرہون منت ہیں۔ یہی تخلیقی تعاون عادت نمبر ۶ کا منتہائے مقصود ہے۔

تخلیقی تعاون کیا ہے؟

آسان لفظوں میں اسکی تعریف کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب دو یا دو سے زائد افراد مل کر عمل کریں تو ان کے عمل کا نتیجہ ان کے انفرادی عملوں کے مجموعہ سے بڑا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک قول بہت مشہور ہے:

”ایک اور ایک گیارہ“ (۴)

یہ قول بڑے ہی بامعنی انداز میں تخلیقی تعاون کی طاقت کو بیان کر رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جب دو افراد باہم ملتے ہیں تو ان کی طاقت آپس میں جمع ہو کر دو گنا نہیں ہوتی بلکہ وہ کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے اکیلے رہ کر بہت کم اور اکٹھے ہونے کی صورت میں بہت زیادہ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس اصول کو اپنانے سے ہماری زندگی میں معجزاتی نتائج پیدا ہونے لگ جاتے ہیں اور مسائل کے حل کے ایسے نئے نئے متبادلات سامنے آ جاتے ہیں جن کا ہم نے پہلے تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔ چنانچہ جب دو یا دو سے زیادہ افراد باہم مل کر کوئی کام کرتے ہیں تو کسی بھی معاملے کا زیادہ بہتر حل نکال لیتے ہیں اور اپنی مطلوبہ منزل تک جلد اور آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ عادت نمبر ۶ اسی تخلیقی تعاون کو اپنانے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

تخلیقی تعاون زندگی کی سب سے اعلیٰ سرگرمی ہے یہ بقیہ عادات کے مجموعے کا اظہار بھی ہے اور ان کا امتحان بھی ہے اسے بقیہ عادات کا پھل بھی کہا جاسکتا ہے۔ تفصیلی اس اجمال کی یہ ہے کہ پہلی تین عادات کا تعلق ذاتی استحکام سے ہے جو ہمیں خود مختاری عطا کرتی ہیں۔ بلاشبہ خود مختاری ایک بہت بڑی

نعمت ہے لیکن خود مختاری سے بڑی نعمت ایک دوسرے پر انحصار ہے اور ایک دوسرے پر انحصار کی منزل تک پہنچنے کے لئے پہلے خود مختاری کی منزل کو سر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تاہم خود مختاری درمیانی مرحلہ ہے حتیٰ منزل نہیں۔ حتیٰ منزل باہمی انحصار تک پہنچنا ہی ہے اور باہمی انحصار کا مرحلہ تخلیقی تعاون پر آ کر ہی مکمل ہوتا ہے۔ اس سے پہلی دو عادات تو اس مرحلے کے ابتدائی اقدامات تھے جن میں سے عادت نمبر ۴ کو جڑ اور عادت نمبر ۵ کو تنا قرار دیا جاسکتا ہے۔ جڑ اور تنا ضروری تو ہوتے ہیں لیکن وہ آخری درجے میں مقصود نہیں ہوتے، مقصود تو پھل کا حصول ہی ہوتا ہے اور عادت نمبر ۶ ہی وہ پھل ہے جو ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے ترقی اور کامیابی کے اُن لامحدود امکانات میں داخل ہو سکیں جن تک پہنچنا ہمارے لئے انفرادی طور پر ممکن نہیں تھا۔

تخلیقی تعاون اصولوں پر مبنی لیڈر شپ کا نچوڑ ہے۔ تخلیقی قیادت کا اصل کام یہی ہے کہ وہ اپنے زیر اثر لوگوں کے درمیان تعاون کے ہر امکان سے بخوبی واقف ہو اور جن لوگوں کے درمیان تعاون کے مثبت نتائج نکل سکتے ہوں انہیں تعاون پر آمادہ کرے۔ نیز یہ اصولوں پر مبنی بچوں کی پرورش کا بھی عرق ہے۔ تخلیقی مزاج کے حامل والدین بچوں کی تربیت اس نہج پر کرتے ہیں کہ وہ اشتراک عمل کے اصولوں کو جانتے ہوں اور انہیں استعمال میں لاتے ہوئے معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔ عادت نمبر ۶ میں تعاون سے مراد یہی تخلیقی تعاون ہی ہے چنانچہ اگلے صفحات میں جہاں بھی لفظ تعاون آئے گا اُس سے مراد تخلیقی تعاون ہی لیا جائے گا۔

تعاون اور اسلام

اسلام ایک دین فطرت ہے جس کے تمام اصول انسانی فطرت سے مکمل مطابقت رکھتے ہیں۔ نیز فرد اور معاشرہ کی تعمیر و ترقی کے ضامن ہیں۔ چنانچہ باہمی تعاون کے حوالے سے اسلام نے جتنا زور دیا ہے اتنا شاید ہی دنیا کی کسی اور تہذیب نے دیا ہو۔ یہی نہیں بلکہ اسلام میں تعاون کی حدود اور اس حوالے سے اصول و ضوابط بھی بیان کیے گئے ہیں۔ وضاحت کیلئے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

قران مجید میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۗ (۵)

”اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ

کرد۔

یہاں اللہ رب العزت نے اہل ایمان کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کی تاکید فرمائی لیکن ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ یہ تعاون فقط نیکی اور پھلائی کے کاموں میں ہونا چاہیے جہاں تک گناہ اور زیادتی کا تعلق ہے تو اُن معاملات میں تعاون قطعاً نہیں کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں تعاون کو فقط مثبت مقاصد تک محدود کر دیا گیا۔ جن سے معاشرہ تعمیر و ترقی کی طرف گامزن ہو سکے اور منفی مقاصد جس کے نتیجے میں معاشرہ تخریب اور تنزلی کا شکار ہو اُن کے حوالے سے تعاون کرنے سے روک دیا ہے۔ یہی اسلام کا حسن ہے کہ یہ ہر اُس کام کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس کے نتیجے میں اعلیٰ اقدار کو پینے کا موقع ملے لیکن وہ تمام کام جو معاشرے کے حسن کو بگاڑیں اُن کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

حضرت ﷺ نے فرمایا:

أَنْصُرِ الظَّالِمَ أَوْ الْمَظْلُومَ. (۶)

”اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔“

صحابہ کرام نے سوال کیا کہ مظلوم کی مدد کرنے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن جو ہے ہی ظالم اُس کی مدد کیونکر کی جاسکتی ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اُس کا ہاتھ ظلم سے روک دینا ہی اُس کی مدد کرنے کے مترادف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو دوسرے لوگوں کو اُس کے ظلم سے نجات مل جائے گی اور دوسری طرف وہ خود ظلم کر کے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے آپ کو مجرم بنا رہا ہے اُس سے بچ جائے گا۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا. (۷)

”اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔“

یہاں اللہ کی رسی سے مراد قرآن مجید لی گئی ہے۔ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ قرآن مجید جو کہ کتاب ہدایت ہے اس کی تعلیمات پر مضبوطی سے کار بند ہو جاؤ اور باہمی معاملات میں ایسے تمام اختلافات سے بچو جن کی بنیاد انانیت اور نفس پرستی پر ہو۔ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تمہارے اندر

امتنار اور پراگندگی آجائے گی اور تمہاری اجتماعی قوت کا شیرازہ بکھڑ جائے گا جس کا حتمی انجام یہ ہوگا کہ دشمن کے دل سے تمہارا رعب جاتا رہے گا اور اُسکے لیے تمہارے اُوپر غالب آنا آسان ہو جائے گا۔ گویا یہاں بھی مسلمانوں کو آپس میں باہمی تعاون کی حالت میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

تعاون کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا برقرار ہونا اولین شرط ہے۔ اسلام ہر اُس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس کے نتیجے میں تعلقات میں بہتری آئے اور ہر اُس بات کی حوصلہ شکنی کرتا ہے جس کی وجہ سے تعلقات میں بگاڑ آسکتا ہو۔ اسلامی تعلیمات میں لڑائی جھگڑے، دشمنی، بغض اور نفرت وغیرہ سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں تخلیقی تعاون کا گلا گھونٹ دیتی ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے تخلیقی تعاون ممکن ہی نہیں رہتا۔ ایک مقام پر نفرت اور عداوت کو شیطان کی کارستانی قرار دیتے ہوئے فرمایا:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ. (۸)

”بے شک شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور نفرت پیدا ہو۔“

اسلام کے اندر قطع تعلق کو حرام قرار دیا گیا ہے اور حضور ﷺ نے تین دن سے زیادہ آپس میں بول چال کو بند رکھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ اسلام مسلمانوں کے معاشرے کو مضبوط سے مضبوط تر دیکھنا چاہتا ہے اور اُسے شاہراہ ترقی پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ جب افراد معاشرہ باہمی محبت و مودت کی لڑی میں پروئے ہوئے ہوں۔

جو شخص مسلمان ہوتے ہوئے اور اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لے اور ماحول سے منقطع ہو کر اپنا الگ جزیرہ بنانے کی کوشش کرے تو اسلام اُسے مسلمانوں کی اجتماعیت (Community) میں شمار ہی نہیں کرتا۔

اس حوالے سے حضور ﷺ نے فرمایا:

مَنْ لَا يَهْتَمُّ بِأَمْرِ الْمُسْلِمِينَ فَلَيْسَ مِنْهُمْ. (۹)

”جو شخص مسلمانوں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا وہ اُن میں سے نہیں ہے“

تعاون کس طرح طاقت اور قوت میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے اس کو حضور ﷺ نے ایک

خوبصورت تمثیل سے سمجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضاً (۱۰)

”مؤمن مؤمن کے لئے ایسے ہے جیسے دیوار کہ اُس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔“

بس شرح دیوار کی ہر اینٹ دوسری کیلئے تقویت کو باعث بن رہی ہوتی ہے اسی طرح اسلامی معاشرے کا ہر فرد دوسرے فرد کی تعمیر و ترقی اور مضبوطی و استحکام کا باعث بن رہا ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اور صرف تعاون کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔ ایسا تعاون جس کی بنیاد میں محبت، اخوت، ہمدردی، خیر خواہی اور ایثار و قربانی کے جذبات پائے جا رہے ہوں۔

تعاون کے تقاضے

تعاون کے معرض وجود میں آنے اور اُس کے ذریعے مطلوبہ نتائج کو حاصل کرنے کے چند تقاضے ہیں جن کو پورا کرنے سے ہی اعلیٰ درجے کا تعاون پیدا ہوتا ہے۔ اور بہترین نتائج کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس حوالے سے مندرجہ ذیل تین تقاضے بنیادی نوعیت کے حامل ہیں۔

(i) پہلا تقاضا..... اختلافات کی قدر کرنا

اس کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے جو لامحدود شانوں کا مالک ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید نے کہا:

كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۱۱)

”ہر دن اُس کی ایک نئی شان ہوتی ہے۔“

اُس کی اس صفت کا عکس اور پرتو اُس کی تخلیقات میں بھی جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ کائنات کے اندر اتنا تنوع اور اختلاف ہے کہ جس کو دیکھ کر عقل انسانی در طء حیرت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ مختلف انواع کی مخلوقات مثلاً جمادات، نباتات اور حیوانات وغیرہ میں سے ہر ایک کے اندر بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں۔ جو بعض اعتبارات سے یکساں ہونے کے باوجود کئی جہتوں سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ سبزیوں اور پھلوں وغیرہ کو ہی لیں تو اُن کی درجنوں اقسام پائی جاتی ہیں۔ جو ایک دوسری سے شکل و صورت، ذائقے اور خصوصیات کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ غور کیا جائے تو اسی کی وجہ سے

کائنات کے اندر اتنی خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اس کے بغیر کائنات یکسانیت کا شکار ہو کر خاصی بوریٹ کی حامل بن جاتی۔ مثلاً پھولوں کی ہی صرف ایک قسم ہوتی تو رنگ برنگے پھولوں سے جو خوشنما گلہستہ بنایا جاتا ہے وہ کبھی معرض وجود میں نہ آسکتا۔ اسی طرح اگر کھانے پینے کی اشیاء میں اتنے رنگ برنگے ذائقے نہ ہوتے تو لذت کام و دہن خاصی یکسانیت کا شکار ہو جاتی، اور زندگی کے اندر وہ کیف اور سرور دکھائی نہ دیتا جو اس وقت موجود ہے۔

جس طرح کائنات کے دیگر تمام موجودات میں طرح طرح کی نیزنگیاں اور بوقلمونیاں پائی جاتی ہیں جنہوں نے مل کر اس کائنات کے حسن اور خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ بالکل اسی طرح انسانی دنیا کے اندر بھی تنوع کی یہ شان اس کمال کے درجے میں پائی جاتی ہے کہ اربوں اور کھربوں کی تعداد میں بسنے والے انسانوں میں سے کوئی بھی دو انسان صد فیصد ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ ایک ہی والدین کے مختلف بچے کافی حد تک مماثلت اور مشابہت کے باوجود بڑی حد تک جسمانی خدوخال میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر دیکھیں تو ایک ہی وقت میں ایک ہی والدین سے پیدا ہونے والے دو جڑواں بچے جو بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں ان میں بھی کسی نہ کسی درجے میں کچھ نہ کچھ فرق بہر حال موجود ہوتا ہے۔ دو انسانوں کی شکل و صورت اور خدوخال کا ہو بہو ایک دوسرے کی نقل (Copy) ہونا تو دور کی بات ہے ان کے ہاتھوں اور بازوؤں کی انگلیوں کے پوروں کے نشانات (Finger Prints) بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات کو بنانے اور چلانے والا خدا کتنی عظمتوں، قدرتوں اور رفعتوں کا مالک ہے کہ کوئی بھی شخص اُس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ظاہری شکل و صورت اور جسمانی خدوخال کو ایک دوسرے سے مختلف رکھا ہے اسی طرح ہمارے ذوق، مزاج اور رجحان بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ مختلف لوگوں کے درمیان مختلف اقسام اور مختلف درجوں کی صلاحیتیں، توانائیاں اور استعدادیں پائی جاتی ہیں۔ کوئی کسی صلاحیت میں دوسرے سے زیادہ ہوتا ہے تو کسی کے اندر کوئی اور خوبی زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ سادہ لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی بھی دو انسان ظاہری اور باطنی کسی بھی لحاظ سے ایک دوسرے سے مکمل طور پر مشابہت نہیں رکھتے ہیں۔

اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر دیکھیں تو انسانوں کے درمیان اس کے علاوہ بھی کئی فرق دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً کوئی مرد ہے کوئی عورت، کوئی بوڑھا ہے کوئی جوان، کوئی عالم ہے کوئی جاہل، کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی صحت مند ہے کوئی بیمار، کوئی سیچا ہے کوئی مریض، کوئی افسر ہے کوئی ماتحت وغیرہ وغیرہ۔ یہ مختلف قسم کے فرق اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام تک میں رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ
دَرَجَاتٍ (۱۲)

”یہ رسول ﷺ جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے بعض سے کلام کیا اور ان میں سے بعض کے درجے بلند کیے۔“

گویا نفس رسالت میں تو تمام رسول برابر ہیں لیکن درجات و خصوصیات میں مختلف ہیں۔

تفاوت انسانی۔۔۔ رحمت یا زحمت

انسانی دنیا کے اندر جو مختلف قسم کے تضادات اور اختلافات پائے جاتے ہیں یہی تخلیقی تعاون کی اولین بنیاد ہیں۔ ہر انسان کے اندر کچھ خوبیاں ہیں اور دوسری طرف بہت ساری کمیاں ہیں جو اُسے دوسروں کی طرف مائل ہونے اور ان سے تعاون حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ کوئی بھی انسان نہ تو تمام خوبیوں کا مالک ہے کہ وہ دوسروں کا محتاج ہی نہ رہے اور نہ ہی ایسا ہے کہ وہ بالکل خالی ہو کہ اُس کے پاس دوسروں کو دینے کیلئے کچھ بھی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف لوگوں کے درمیان پائے جانے والے ان مختلف فرقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ
لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (۱۳)

”ہم نے ان کی دنیوی زندگی میں رزق کو تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کے بعض پر درجے بلند کیے تاکہ ایک دوسرے سے کام لیں۔“

مندرجہ بالا آیت کتنی وضاحت سے بتا رہی ہے کہ لوگوں کے درمیان جو مختلف فرق رکھے گئے

ہیں اُن کی حکمت اس دنیا کے نظام کو بطریق احسن چلانا ہے۔ ذرا سوچیں کہ تمام دنیا کے لوگ ایک جیسی صلاحیتوں کے مالک ہوتے تو دنیا کا نظام کیسے چلتا؟ اگر تمام لوگ امیر ہوتے تو کام کون کرتا؟ اگر تمام لوگ علم والے ہوتے تو اُن کے علم اور ذہانت کو استعمال کرنے کے مواقع کون فراہم کرتا؟ اگر تمام لوگ نیک ہوتے تو اچھائی یا برائی میں تمیز کیسے ہوتی؟ غرض یہ کہ دنیا کا سارا نظام تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا۔ جب ہر شخص اپنی جسمانی، دماغی، جذباتی، اور روحانی ضروریات کیلئے خود کفیل ہوتا تو پھر کوئی کسی کے ساتھ رہنا نہ چاہتا۔ جانوروں کی طرح ہر کوئی اپنے لئے جیتا اور نتیجتاً تمام انسانی ترقیاں رک جاتیں۔ لہذا دنیا کے نظام کو چلانے کیلئے ایک جیسے لوگوں کی نہیں بلکہ مختلف لوگوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس حکمت اور مصلحت کے تحت لوگوں کے درمیان مختلف قسم کے فرق رکھ دیئے تاکہ دنیا کا نظام حسن و خوبصورتی کے ساتھ چلتا رہے۔

تفاوت کی تین اقسام

یوں تو لوگوں کے درمیان بے شمار فرق پائے جاتے ہیں تاہم تعاون کے ضمن میں مندرجہ ذیل تین اقسام کے فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ہم مختلف انداز، اوصاف اور خصوصیات کے مالک ہیں

اللہ رب العزت نے ہر انسان کو جو شخصیت (Personality) دی ہے وہ اپنے اندر ایک انفرادیت (Individuality) رکھتی ہے۔ لہذا کسی بھی انسان کو مکمل طور پر دوسرے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ نہ تو اپنی کسی خوبی کی بناء احساس برتری میں مبتلا ہونا چاہیے۔ اور نہ ہی کسی خامی کی بناء پر احساس کمتری کا شکار ہونا چاہیے۔ اپنا موازنہ دوسروں کے ساتھ اور دوسروں کا موازنہ اپنے ساتھ نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی اپنے آپ کو یا کسی دوسرے شخص کو مکمل طور پر کامل سمجھنا چاہیے۔ ہر انسان خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی اور دوسروں کی انفرادی صلاحیتوں، مخصوص صفات اور جداگانہ تشخص کو سمجھا جائے اور باہمی معاملات میں انہیں ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

(۲) ہم مختلف انداز میں سوچتے ہیں

جس طرح ہمارے سر باہر سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح ہمارے دماغ بھی

ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا ہماری سوچ کا انداز بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تھامس آرمسٹرانگ نے ذہین بچوں کی سات اقسام دریافت کیں ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ایسے بچے اپنی نمایاں ذہانت کی بدولت زیادہ بہتر انداز میں سیکھتے ہیں اور ہر ایک کے سیکھنے کا انداز بھی مختلف ہو سکتا ہے۔ اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ (۱۴)

(i)	زبان دانی	پڑھنے لکھنے اور کہانیوں کی مدد سے سیکھنا
(ii)	منطقی اور حسابی انداز	استدلال، نمونوں، درجوں اور تعلقات سے سیکھنا
(iii)	جسمانی و حسیاتی انداز	جسمانی انداز اور چھونے سے سیکھنا
(iv)	موسیقی	آواز اور اُس کے اتار چڑھاؤ کی مدد سے سیکھنا
(v)	تصویری	مختلف اشکال اور تصاویر کی مدد سے سیکھنا
(vi)	معاشرہ	دوسروں سے میل جول اور بات چیت کے ذریعے
(vii)	ذات	اپنے احساسات کی مدد سے سیکھنا

سے سیکھنا

اہم بات یہ ہے کہ کوئی خصوصیت کسی دوسرے سے بہتر نہیں ہوتی، بس ذرا مختلف ہوتی ہے۔ نین ممکن ہے کہ ایک بچہ حسابی اور منطقی انداز سے زیادہ آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔ جبکہ دوسرے کو اشکال اور تصاویر کی مدد سے سیکھنے میں زیادہ آسانی محسوس ہوتی ہو۔ مگر وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر ذہین ہوں۔ سوچ کا یہ مختلف انداز بے شمار ترقیوں اور ایجادات کا باعث بنتا ہے۔ باہمی تعاون کے ضمن میں ہمیں دوسروں کی سوچ کے انداز کو ملحوظ خاطر رکھنے اور اُس کی قدر کرتے ہوئے اُس سے استفادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۳) ہم مختلف انداز میں دیکھتے ہیں

ہر شخص دنیا کو مختلف انداز میں دیکھتا ہے اور اپنے نقطہ نظر (Point of view) کے مطابق اُس کی تشریح کرتا ہے۔ بیرونی دنیا کے حقائق تو سب کے لئے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں مگر ہر شخص کا اُنہیں دیکھنے اور اُن کی تشریح کرنے کا ایک اپنا اور منفرد انداز ہوتا ہے جس کی تہہ میں اُس کے اپنے عقائد،

تصورات اور ماضی کے تجربات و مشاہدات کا فرما ہوتے ہیں۔ یہیں سے آراء کا فرق جنم لیتا ہے اور بعض اوقات یہ فرق اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ دو افراد کسی ایک ہی چیز کی تشریح کرتے وقت ایک دوسرے کے بالکل مختلف موقف اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ مثلاً دور سے ایک عورت کو دیکھتے ہوئے عین ممکن ہے کہ ایک شخص کو وہ بچوں دکھائی دے اور جبکہ دوسرے کی نگاہیں اُسے ایک جوان عورت کے روپ میں دیکھ رہی ہوں۔

ہمیں اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا اور زندگی وہی نہیں ہے جو ہمیں دکھائی دے رہی ہے، اُس کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے۔ کسی بھی معاملے میں ہمارا تصور ہی حرف آخر نہیں ہے کہ اُس میں کسی کمی بیشی یا رد و بدل کی گنجائش ہی نہ ہو۔ ایمانیات کے ضمن میں چند بنیادی باتیں جو دو + دو = چار کی طرح مسلمہ حقائق کا درجہ رکھتی ہیں، اُن کو چھوڑ کر باقی کسی بھی معاملے میں ہمارے تصور میں نظر ثانی کی گنجائش موجود ہوتی ہے اور حقیقت اُس سے مختلف ہو سکتی ہے۔ لہذا ہمیں اپنی رائے کو درست سمجھنا چاہیے مگر اس بات کے امکان کو رد نہیں کرنا چاہیے کہ اُس میں غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے کی رائے کو غلط سمجھنے کا حق ہمیں حاصل ہے مگر اتنی گنجائش رکھنی چاہیے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح ہی ہو، مگر اُس کا صحیح ہونا مجھ پر آشکار نہ ہو رہا ہو۔ لہذا اپنے دل و دماغ کے دروازوں کو سختی سے بند کرنے کی بجائے ہمیشہ کھلے رکھنا چاہیے تاکہ وہ باہر سے آنے والے نئے نئے تصورات (Ideas) پر غور کر سکیں۔ اور اُن کے اندر جہاں کہیں سچائی موجود ہو، اُسے اپنایا جاسکے۔

ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی معاملے میں اگر ایک فرد صحیح ہے تو لازماً دوسرا غلط ہوگا۔ یہ بات منطقی طور پر تو درست ہو سکتی ہے لیکن نفسیاتی طور پر درست نہیں۔ عین ممکن ہے کہ ایک شخص کسی چیز کو جس مقام نظر (Vantage Point) سے دیکھ رہا ہو دوسرا کسی اور سے دیکھ رہا ہو۔ اور پھر دونوں اپنے اپنے مشاہدات کے مطابق اس کی تشریح کر رہے ہوں اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ درست ہوں۔ مثلاً دو اشخاص آمنے سامنے بیٹھے ہوں ایک شخص اپنے ہاتھ کی مٹھی کھول کر اپنا ہاتھ دوسرے کے چہرے کے سامنے کر دیتا ہے اور دوسرے سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟ تو وہ کہے گا کہ مجھے گلابی رنگ کا ہاتھ دکھائی دے رہا ہے جس پر چند لکیریں پڑی ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پہلا شخص بھی وہی کچھ دیکھ رہا ہے؟ یقیناً نہیں۔ اُسے ہاتھ کا رنگ گلابی کی بجائے گندمی نظر آ رہا ہے ہاتھ پر ہلکے ہلکے بال اور اُنکلیوں کے کنارے پر ناخن بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ دونوں کی ایک ہی ہاتھ کے بارے میں

الگ الگ رائے ہے۔ دونوں میں سے درست کون ہے اور غلط کون ہے؟ جواب یہ ہے کہ دونوں ہی درست ہیں اور دونوں کی متفرق آراء مل کر ہی ہاتھ کی پوری حقیقت کو واضح کرتی ہیں۔

جب تک ہم اپنے اور اک کے فرقوں کی قدر نہیں کریں گے اور جب تک ہم ایک دوسرے کی رائے کا احترام نہیں کریں گے اور اس بات کے امکان کو نہیں مانیں گے کہ ہم دونوں صحیح ہو سکتے ہیں اور یہ کہ زندگی ہمیشہ ہاں یا نہیں میں نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ تیسرے متبادل کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ تب تک ہم کبھی بھی اپنے دیکھنے کے مخصوص انداز سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے اور نہ ہی دوسروں کے ساتھ تخلیقی تعاون کی حقیقی لذتوں سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

مندرجہ بالا مثال میں جب تک دونوں اشخاص اپنی اپنی رائے پر اڑے رہیں گے اور اپنے اپنے مشاہدے پر اصرار کرتے ہوئے اسے ہی سچ سمجھتے رہیں گے تب تک ان دونوں میں نہ اتفاق رائے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ وہ صرف اُس وقت آپس میں متفق ہو سکتے ہیں جب وہ اپنے اپنے مقامِ نظر سے اُدھر اُٹھ کر دوسرے کے مقامِ نظر سے دیکھنا شروع کریں گے۔ تو پھر پوری حقیقت ان پر آشکار ہو جائے گی اور ان کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق کرنا اور اکٹھے چلنا ممکن ہو جائے گا۔

یہی حقیقت زندگی کے جملہ معاملات میں کار فرما ہے۔ اپنی رائے پر اڑنے والا شخص کبھی پوری حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ رائے کے فرق کی قدر کرنے والا شخص ہی پوری حقیقت کو پاسکتا ہے۔ ادھوری حقیقت کو پوری حقیقت سمجھنے والا شخص ہمیشہ غیر موثر رہے گا۔ جبکہ فرق کی قدر کر کے پوری حقیقت تک پہنچ جانے والا شخص ہی موثر انسان بنے گا۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو وہ تمام انسانوں کو ایک ہی گروہ بنا سکتا تھا لیکن اُس نے انسانوں کے درمیان مختلف گروہ بنائے اور ان کے درمیان طرح طرح کے فرق اور تضادات پیدا کر دیئے۔ ہمیں ان اختلافات کو دل و جان سے قبول کرتے ہوئے ان کی قدر کرنی چاہیے۔ شاید اسی نکتے کی طرف ہی اشارہ کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

اختلاف اُمّتی رحمة (۱۵)

”میری اُمّت کے اندر اختلاف رائے باعثِ رحمت ہے۔“

یہ حقیقت ہے کہ اختلاف رائے کے مخلصانہ احترام سے ہی ہم حقیقت کے اُن پہلوؤں تک پہنچ

سکتے ہیں جو پہلے ہماری نظر سے پوشیدہ ہوتے ہیں اسی سے ہمارے علم کے اندر وسعت اور ترقی آتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک جیسی رائے رکھنے والے دو یا دو سے زائد لوگ جمع ہوں تو ان کے جمع ہونے سے علم کے نئے دروازے نہیں کھلتے ہیں اور معلومات کو دائرہ کار سبک کر رہ جاتا ہے۔ لہذا لوگوں کے درمیان پائے جانے والے جسمانی، ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی فرق کی قدر کرتے ہوئے ان سے استفادہ کرنا تعاون کی اولین شرط ہے۔

اختلاف کے حوالے سے لوگوں کی تین اقسام

اختلاف کا سامنا کرنے کے حوالے سے لوگوں کے اندر تین قسم کے طبقات پائے جاتے ہیں اور اسی حوالے سے تعاون کے معرض وجود میں آنے یا نہ آنے کا تعین ہوتا ہے۔

(۱) اختلاف سے نفرت

پہلا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اختلاف سے نفرت کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں۔ ان کو ہر وہ شخص بیگانہ اور اجنبی دکھائی دیتا ہے جو ان سے مختلف رنگ یا نسل یا قبیلے کا ہو یا کسی اور علاقے کا رہنے والا ہو یا جس کا طرز بود و باش ان سے مختلف ہو یا جس کے عقائد و نظریات ان سے مختلف ہوں۔ ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا راستہ ہی بہترین، درست اور واحد راستہ ہے اور جو لوگ بھی ان سے مختلف ہیں وہ غلط ہیں۔ چنانچہ وہ ان سے نفرت کرتے ہیں اور بعض اوقات تو یہ نفرت دشمنی تک میں بدل جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بعض انتہا پسند لوگوں کا اپنے نظریاتی مخالفین کو قتل تک کر دینا اس کی ایک واضح مثال ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے اندر کسی بھی قسم کے تعاون کا امکان سرے سے معدوم ہوتا ہے۔

(۲) اختلاف برداشت کرنا

دوسرا طبقہ ایسے لوگوں کا ہے جن کا خیال ہوتا ہے کہ ہر شخص کو دوسرے سے مختلف ہونے کا حق حاصل ہے۔ اگرچہ یہ لوگ اختلاف سے نفرت نہیں کرتے تاہم وہ اسے گلے بھی نہیں لگاتے۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ دوسرے اپنی راہ پر چلیں اور ہم اپنی راہ پر چلیں۔ دوسرے ہمیں زحمت نہ دیں اور ہم دوسروں کو زحمت نہ دیں۔ ایسے لوگوں کے درمیان بھی اول تو تعاون معرض وجود میں ہی نہیں آتا اور اگر کہیں آ بھی جائے تو وہ تخلیقی تعاون نہیں ہوتا، بلکہ غیر تخلیقی ہوتا ہے کیونکہ انہیں باہمی فرق ایک رکاوٹ دکھائی دیتا

ہے۔ اس لئے وہ خوش دلی سے باہمی تعاون پر آمادہ نہیں ہوتے۔

(۳) اختلاف قبول کرنا

یہ وہ لوگ ہیں جو اختلاف کو صرف مانتے ہی نہیں بلکہ اُسے دل و جان سے قبول بھی کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ اختلاف کو کمزوری سمجھنے کی بجائے طاقت سمجھتے ہیں۔ وہ خلوص دل سے محسوس کرتے ہیں کہ دو ایسے افراد جو مختلف انداز میں سوچتے ہیں، دو ایک جیسے سوچنے والوں کی نسبت زیادہ کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ انہیں احساس ہوتا ہے کہ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ چلنے کا یہ مطلب نہیں کہ تمام اختلافی امور پر لازماً متفق ہونا ہے، بلکہ بعض معاملات میں اختلاف کے برقرار رہنے کے باوجود بھی دیگر معاملات میں بھی مل جل کر آگے بڑھا جا سکتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں کافروں سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ (۱۶)

”اے اہل کتاب! آؤ اُس ایک بات پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اتفاق کر لیتے ہیں کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔“

یہاں کافروں اور مسلمانوں کے درمیان ظاہر ہے کہ بہت سے معاملات میں اختلافات تھے۔ تاہم انہیں کہا گیا کہ باقی اختلافی امور کو ایک طرف رکھتے ہوئے وہ ایک بات جو ہم دونوں کے نزدیک مسلمہ ہے، اُس پر اتفاق رائے سے چلتے ہیں۔

بہر حال یہ تیسرا طبقہ ہی وہ طبقہ ہے جو تعاون کے معیار پر صحیح معنوں میں پورا اترتا ہے اور اس قابل ہے کہ لامحدود امکانات سے بھری ہوئی اس رنگ برنگی دنیا میں نئے جہاں آباد کر سکے۔

(ii) دوسرا تقاضا..... تواضع و انکساری

تعاون کو معرض وجود میں لانے کیلئے دوسری شرط تواضع و انکساری کی صفت کو اپنانا ہے۔ تواضع کا مطلب ہے اپنی حدود و قیود کو جاننا اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو اپنی حیثیت اصلی سے زیادہ سمجھنے (Over estimate) سے گریز کرنا۔ تعاون کے ثمرات سے متمتع ہونے کیلئے اس صفت کو اپنے مزاج کا حصہ بنا لینا بہت ضروری ہے۔ تواضع کی ضد تکبر ہے، جس کا مطلب ہے اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنا۔ تکبر

کے ہوتے ہوئے انسان نہ تو اپنی ذات سے باہر کسی سچائی کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتا ہے اور نہ ہی اُس کی جھوٹی انا نیت اور خود پسندی اُسے دوسروں کی سطح پر آ کر اُن کے ساتھ تعاون کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ حضور ﷺ نے تکبر کی علامات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

الکبر بظن الحق و غمط الناس. (۱۷)

”تکبر یہ ہے کہ انسان حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔“

یہاں تکبر کی دو علامات بیان کی گئی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ تکبر آدمی کے سامنے جب کوئی سچائی آتی ہے جس کی زد اُس کے پہلے سے خود ساختہ عقائد و نظریات پر پڑ رہی ہو تو اُس کی انا نیت آڑے آتی ہے اور وہ اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کو تسلیم کر لینے سے اس کا مقام اور مرتبہ گھٹ جائے گا۔ چنانچہ اس کا آسان حل اُسے یہ دکھائی دیتا ہے کہ اُسے ماننے سے ہی انکار کر دیا جائے۔ اس کی ایک بڑی واضح مثال کفار مکہ کی ہے جن کے متعلق قرآن نے بتایا کہ:

يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ. (۱۸)

”وہ اُسے (آپ ﷺ) کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔“

یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں حضور ﷺ کے متعلق اتنی نشانیاں بیان کر دی گئیں تھیں کہ آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کو پہچانا اُن کے لئے ایسے ہی تھا جیسے اپنے بیٹوں کو پہچان لینا۔ پھر انہوں نے ماننے سے انکار کیوں کر دیا؟ اس کی وجہ اُن کا یہی تکبر اور گھمنڈ تھا جس کا وہ شکار تھے۔ تکبر کی دوسری علامت یہ بتائی گئی ہے کہ اُس میں انسان دوسرے لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے جس کی بناء پر اُن کے ساتھ برابری کی سطح پر معاملات طے کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں تعاون کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

کامیاب اور موثر لوگوں کے اندر اپنی عزت نفس کو برقرار رکھتے ہوئے تواضع اور انکساری کی شان پائی جاتی ہے جس کی بناء پر وہ اپنی سوچ اور احساسات کی حدود کو جانتے ہیں اور اس بات کو مانتے ہیں کہ اُن کا فہم و ادراک بہت محدود ہے۔ وہ دوسروں کے دل و دماغ میں موجود علم کے بے بہا ذرائع کے معترف ہوتے ہیں اور اُن سے رابطے اور تعلق کی بدولت جو علم انہیں حاصل ہوتا ہے اُس کی قدر کرنا

بھی جانتے ہیں۔ حقیقت کی پہچان کیلئے اپنے علم کے علاوہ انہیں دوسرے لوگوں سے جو علم حاصل ہو سکتا ہے وہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح جانتے ہیں حقیقت بھی یہی ہے کہ ہمارے علم میں اضافہ ہی اس وقت ہوتا ہے جب ہمیں وہ علم حاصل ہو جو ہمارے پاس پہلے موجود نہیں تھا اور یقیناً یہ دوسروں کے ذریعے سے ہی میسر آ سکتا ہے۔ جب ہم صرف اپنے تجربات تک محدود ہو جاتے ہیں تو پھر ہم مستقل معلومات کی کمی کا شکار رہتے ہیں۔

تواضع اور انکسار والے لوگ کس طرح حق کے متلاشی ہوتے ہیں اور اُس کے سامنے آنے پر اپنی انانیت کو ایک طرف رکھتے ہوئے کیسے اُسے فوراً قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی وضاحت کیلئے مندرجہ ذیل دو مثالوں پر غور کریں:

۱۔ سیدنا فاروق اعظمؓ کی اسلام دشمنی بڑی مشہور و معروف تھی اور شہر مکہ کے اندر وہ اسلام کے بدترین مخالفین کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ ایک دن یہ عداوت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ برہنہ تلوار لے کر سر نام معاذ اللہ حضور ﷺ کو قتل کرنے کے ارادہ سے چل پڑتے ہیں۔ جب وہ اس نیت سے چلے ہوں گے تو راستے میں کئی لوگوں کے علم میں آیا ہو گا کہ وہ کس ارادے سے جا رہے ہیں۔ آگے جا کر جب حق اُن کے سامنے آشکار ہو گیا، اور اُن کے دل و دماغ نے اُسے مان لیا تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر حضور ﷺ کی غلامی میں آ گئے۔ انہوں نے قطعاً نہ سوچا کہ جن لوگوں کے اندر میں اسلام دشمن کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہوں اور جن لوگوں نے آج مجھے تلوار لے کر آتے دیکھا ہے وہ سب میرے بارے میں کیا سوچیں گے اور کیا کہیں گے۔ اُن کی یہی وہ اعلیٰ ظرفی اور حقیقت پسندی تھی جس نے انہیں عمر سے فاروق اعظمؓ بنا دیا۔ (۱۹)

۲۔ قائد اعظم محمد علی جناحؒ قیام پاکستان سے پہلے ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کئی قیمتی سال ہندو مسلم اتحاد کیلئے کوششیں کرنے اور اس نظریے کے پرچار میں صرف کئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہیں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا لقب دے دیا گیا۔ پھر جب علامہ اقبالؒ نے بڑی درد مندی اور دلسوزی کے ساتھ سمجھایا کہ اُن کا نظریہ درست نہیں ہے اور اس کی بجائے انہیں مسلمانوں کیلئے ایک جداگانہ مملکت کے قیام کیلئے کوششیں کرنی چاہیے اور اُن کے دل و دماغ نے اس بات کو تسلیم کر لیا تو انہوں نے اپنے ماضی کی تاریخ سے رشتہ کاٹتے ہوئے اور معاشرے کے اندر اپنی

ساکھ کو داؤ پر لگاتے ہوئے فوراً ہی اپنے پہلے نظریے سے رجوع کرتے ہوئے نئے نظریے کو اپنالیا اور اپنی بقیہ زندگی کے قیمتی سال اس کے لئے کوششیں کرنے اور اس کی تعبیر حاصل کرنے میں صرف کر دیئے۔ تصور کریں کہ اگر وہ یہ سوچنے بیٹھ جاتے کہ میری تو عمر بھر کی اب تک کی جمع شدہ پونجی (معاشرے کے اندر عزت و وقار وغیرہ) لٹ جائے گی اور لوگ مجھے کہا کہیں گے تو دنیا کی تاریخ ہی مختلف ہوتی۔ نہ پاکستان کا قیام معرض وجود میں آیا ہوتا اور نہ ہی محمد علی جناح قائد اعظمؒ بنے ہوتے۔ (۲۰)

چنانچہ ایک طرف تو تواضع والے لوگ سچائی کو کھلے دل سے تسلیم کر لینے والے ہوتے ہیں خواہ وہ اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری طرف متواضع لوگوں کو حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی خوبیوں اور دوسروں کی خامیوں کو دیکھ دیکھ کر خواخواہ کے احساس بڑائی میں مبتلا نہیں ہوتے ہیں اور دوسروں کو حقیر نہیں سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ بلکہ وہ پوری دیانت داری سے محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے تحت مختلف لوگوں میں مختلف خوبیاں اور اوصاف رکھے ہوئے ہیں جن کا مقصد نظام کائنات کو بہتر انداز میں چلانا ہے نہ یہ کہ اس بناء پر کسی کو کمتر اور کسی کو برتر سمجھ لیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو معاشرے سے منفرد کوئی چیز سمجھنے کی بجائے خود کو ماحول اور معاشرے کا حصہ سمجھتے ہوئے دوسرے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر کام کرنے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔ دوسروں سے تعاون کرنے اور دوسروں سے تعاون لینے میں عار محسوس نہیں کرتے اور یوں وہ تعاون کے ثمرات سے بہرہ ور ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

(iii) تیسرا تقاضا..... باہمی اعتماد

تعاون کیلئے تیسری شرط ہے باہمی اعتماد کا ہونا، جب تک دو افراد کو ایک دوسرے پر اعتماد ہی نہیں ہوگا تب تک وہ کسی بھی طرح ایک دوسرے سے تعاون کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ بلکہ تعاون تو دور کی بات ہے وہ ایک دوسرے کے قریب آنے اور بات چیت کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوں گے۔ لہذا دوسروں کے ساتھ مل جل کر چلنے اور تعاون کے ذریعے بہترین حل تلاش کرنے کیلئے بہت ضروری ہے کہ پہلے دوسروں کی نظروں میں ہمارا اعتماد قائم ہو چکا ہو۔ یعنی دوسرے ہمارے اوپر اعتبار اور بھروسہ کرنے کیلئے تیار ہوں۔

دوسروں کی نظروں میں اعتماد کا بننا ایک دن کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک مسلسل اور متواتر عمل

ہے جو آہستہ آہستہ پروان چڑھتا ہے۔ اس اعتماد کو پیدا کرنے میں پہلی پانچوں عادات اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اصل میں تعاون سے مثبت نتائج حاصل کرنے کی اہلیت ہوتی ہی ان لوگوں میں ہے جو پہلی پانچ عادات کو اپنا چکے ہوں۔ ابتدائی تین عادتیں تو خود ہمارے اندر اپنے اوپر اعتماد پیدا کرتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ہمارے اندر خود اعتمادی پیدا کرتی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب تک خود ہمارا اپنا ہی ہماری ذات پر اعتماد نہیں ہو گا کوئی دوسرا ہمارے اوپر اعتماد کیسے کرے گا۔ پھر اگلی دو عادات دوسروں کی نظروں میں ہمارا اعتماد اور وقار پیدا کرتی ہیں اور ان کی نظروں میں ہماری وہ تصویر بناتی ہیں جس کی بناء پر لوگ ہمارے اوپر بھروسہ کر سکیں اور آنکھیں بند کر کے ہمارے اوپر اعتماد کر سکیں۔ جوں جوں لوگوں کی نظروں میں ہمارا اعتماد بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے تخلیقی تعاون کے لئے زمین ہموار ہوتی چلی جاتی ہے۔ سائنس کے اندر بعض متمدنوں میں راست تناسب کا تعلق پایا جاتا ہے یعنی کسی ایک کے بڑھنے یا گھٹنے سے اسی مناسبت سے دوسری بھی زیادہ یا کم ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ یہاں ہے کہ تعاون کا دار و مدار باہمی اعتماد پر ہے۔ جس درجے میں باہمی اعتماد ہو گا اسی درجے میں تعاون کو معرض وجود میں لایا جا سکتا ہے یہ ضروری نہیں کہ جہاں اعتماد ہو وہاں لازماً تعاون بھی اسی درجے میں پایا جا رہا ہو۔ مگر یہ ضروری ہے کہ جہاں تعاون ہو تو اس کی بنیاد میں اسی سطح کا اعتماد بھی موجود ہو۔

تعاون کا مقصود۔۔۔ بلند راستے کی تلاش

جب ہم اس بات کو سمجھ لیتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان موجود مختلف اقسام کے فرق کمزوری نہیں بلکہ طاقت کے حصول کا ذریعہ ہیں تو پھر گویا ہم ایک اُدنیے راستے کی تلاش کیلئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسا راستہ جو ہمارے انفرادی راستوں سے بلند ہو۔ تعاون سمجھوتے اور مدد سے بڑی شے ہے۔ سمجھوتے کو ہم $1+1=1/2$ ، مدد کو $1+1=2$ اور تعاون کو $1+1=3$ یا اس سے بھی زیادہ کہہ سکتے ہیں تعاون ایک ایسی چیز ہے جو الگ الگ حصوں کے مجموعے سے بھی زیادہ نتائج دیتی ہے۔

تعاون کے ذریعے کسی بھی شعبے میں جو بلند تر راستہ معرض وجود میں آتا ہے وہ فکری بھی ہو سکتا ہے اور فنی بھی۔ یہ راستہ کیسے وجود میں آتا ہے اس کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل دو مثالوں پر غور کریں۔

۱۔ اللہ رب العزت نے انسانی دماغ کو اپنی قدرت کا ایک شاہکار بنایا ہے۔ ماہرین نفسیات نے دماغ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دایاں حصہ۔ دایاں حصہ۔

دماغ کا بایاں حصہ منطقی انداز میں سوچتا ہے یہ حصہ تنقید، تجزیہ اور جائزہ لینے کیلئے ہے۔ حاصل ہونے والی معلومات کا عقل اور دلیل کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور اُن پر اپنے ردعمل کی تشکیل کرتا ہے اس کو تنقیدی حصہ کہا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف دماغ کا دایاں حصہ ہے۔ جو غور و فکر اور تخلیقی کام سرانجام دیتا ہے۔ خواب اور تخیلات اسی حصے میں پیدا ہوتے ہیں۔ نئے نئے تصورات اور آئیڈیاز (Ideas) یہیں پر رونما ہوتے ہیں۔ واقعات پر غور و فکر کرنا اور مسائل کا حل ڈھونڈنا اسی حصے کے اہم افعال میں شامل ہے۔ اس حصے کو تخلیقی کہا جاسکتا ہے۔

گویا کسی مسئلے کا تنقیدی جائزہ لینا اور تجزیہ کرنا بائیں حصے کا کام ہے۔ جب کہ مسائل کا حل ڈھونڈنا دائیں حصے کا کام ہے۔ اگر صرف بائیں حصے کو استعمال کیا جائے تو انسان صرف مسائل میں ہی الجھا رہتا ہے اور اگر صرف دائیں حصے کو استعمال کیا جائے تو انسان تصورات میں ڈوبا رہتا ہے۔ دونوں حصوں کو ملا کر استعمال کیا جائے تو مسائل کا تجزیہ کر نیکیے ساتھ ساتھ اُن کے بہترین تخلیقی حل بھی سامنے آتے ہیں اور یہ صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب دونوں حصے ہم آہنگی کے ساتھ اپنا اپنا کام بخیر و خوبی سرانجام دے رہے ہوں۔ یعنی ان میں باہمی تعاون کی کیفیت موجود ہو۔ چنانچہ دماغ کے دونوں حصوں کی نوعیت نوعیت لگ الگ ہونے کے باوجود جب اُن کے درمیان تعاون معرض وجود میں آتا ہے تو مسائل کے بہترین حل سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں اور یہی بلند راستہ ہے۔

۲۔ عورت اور مزد کے درمیان جنس کا جو فرق ہے یہ اتنا بڑا ہے کہ اس کی بنا پر دونوں کی نفسیات میں اور کئی قسم کے فرق معرض وجود میں آتے ہیں۔ لیکن جب وہ دونوں اس فرق کو تسلیم کرتے ہوئے اور اسے مثبت انداز میں استعمال کرتے ہوئے ازواجی تعلقات کی صورت میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں ایک نئی چیز تخلیق ہو جاتی ہے جس کو پیدا کرنا دونوں میں سے کسی ایک کیلئے بھی انفرادی طور پر ممکن نہیں تھا۔ یہی تیسرا راستہ ہے جو تعاون کی بدولت معرض وجود میں آیا۔ اب اگر دونوں اپنے درمیان موجود فرق کی بناء پر ایک دوسرے سے نفرت اور وحشت کرتے تو اُن کے درمیان تعاون معرض وجود میں نہیں آسکتا تھا اور نتیجے کے طور پر تیسرے وجود کا پیدا ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔

ڈاکٹر نیولین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

Through harmonious alliance of two or more minds, out of

which grows a Master Mind^(۲۱)

”دو یا دو سے زیادہ دماغوں کے ہم آہنگی کے ساتھ متحدہ عمل کرنے کے نتیجے میں شدہ دماغ
معرض وجود میں آتا ہے“

ڈاکٹر پولین بل کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی دو یا دو سے زیادہ دماغ کسی مسئلے کو
حل کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور مل کر اس پر سوچ بچار کرتے ہیں تو ان کے اشتراک عمل سے ایک
تیسرا دماغ جنم لیتا ہے جس کو انہوں نے شدہ دماغ (Master Mind) کا نام دیا ہے۔ ان کے خیال
میں یہ دماغ کسی بھی مسئلے کو اس سے بہتر سطح پر حل کر سکتا ہے جس سطح پر انفرادی دماغ حل کر سکتے تھے۔
اور ان کے الگ الگ حلوں کی نسبت کسی بھی مسئلے کا زیادہ بہتر حل تلاش کر سکتا ہے۔ اسی کو یہاں بلند
راستے کا نام دیا جا رہا ہے۔

تعاون کا عملی منصوبہ

تعاون کو عملی طور پر معرض وجود میں لانے کیلئے ذیل میں دیئے گئے پانچ درجاتی (Five
Steps) فارمونے پر عمل پیرا ہونا خاصے مفید نتائج فراہم کر سکتا ہے اور تعاون کے راستے پر گامزن
ہونے میں آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔

(i) مسئلہ یا موقع واضح کیجیے

سب سے پہلے اس بات کا تعین کیا جانا ضروری ہے کہ زیر بحث یا حل طلب مسئلہ کیا ہے؟ جس
کے بارے میں غور و فکر کرنا اور کسی بہتر نتیجے پر پہنچنا ہے۔

(ii) دوسروں کا راستہ

پہلے دوسروں کو موقع دیں کہ وہ اس مسئلے کے حوالے سے اپنے خیالات کو تفصیل سے بیان کر
سکیں اور اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کر سکیں پانچویں عادت کے ابتدائی نصف حصہ پر عمل پیرا ہوتے
نوسٹے خلوص دل کے ساتھ ان کے زاویہ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

(iii) میرا راستہ

بعد ازاں اپنا نچوین عادت کے دوسرے نصف حصہ کو عمل میں لاتے ہوئے زیر بحث موضوع کے حوالے سے اپنے خیالات بڑے مربوط انداز میں دلائل و براہین کے ساتھ اُن کے سامنے رکھیں اور کوشش کریں کہ آپ کے نقطہ نظر کو پوری طرح سمجھ لیا جائے۔

(iv) سوچ بچار

بعد ازاں اپنے اور دوسروں کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے نئے امکانات اور متبادلات تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ہر قسم کے تعصبات سے اُدپر اُٹھ کر پوری دیانتداری سے بہترین نتائج اخذ کرنے کی کوشش کریں۔

غور و فکر کے تین تقاضے

اس حوالے سے درج ذیل باتوں کو یاد رکھیں:

(۱) تخلیقی انداز اپنائیے

اپنے پہلے سے سوچے سمجھے نظریات علیحدہ رکھ کر غور کریں۔

(۲) تنقید کی پرواہ مت کریں

غور و فکر کا کام مکمل طور پر ذہن کو پرسکون رکھتے ہوئے کریں۔ اس بات سے مت گھبرائیں کہ لوگ کہیں تنقید ہی نہ کریں۔ تنقید جیسی شے تخلیق کا راستہ نہیں روک سکتی۔

(۳) اچھی بات سوچئے

اپنی تجاویز کی بنیاد بہترین خیالات پر رکھیں۔ ایک بہترین نظریہ دوسرے کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور دوسرا تیسرے کی طرف۔

(۴) اُونچا راستہ

معالیے کے ہر ہر رخ پر فراخ دلانہ غور و فکر کرنے کے بعد تمام آراء و تجاویز کی روشنی میں بہترین حل کو دریافت کریں۔ ایسا حل جو انفرادی طور پر ذہنوں میں آنے والے حلوں کی نسبت زیادہ بہتر، قابل

عمل اور تمام فریقین کے لئے زیادہ فوائد و ثمرات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو۔ مسئلے کا یہ حل عام طور پر پہلے کسی کے ذہن میں نہیں آتا مگر جب چند لوگ مل جل کر تخلیقی انداز میں سوچ بچار شروع کرتے ہیں تو کسی نہ کسی کے ذہن میں آ جاتا ہے اور دوسروں کے ذہن بھی اس پر یوں متفق اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ جیسے یہ خیال ان کے اپنے ہی ذہن کی پیداوار ہو۔ یہی سب سے اونچا راستہ ہوتا ہے جو تعاون کا مقصود ہوتا ہے۔

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ فریقین کے درمیان باہمی اعتماد کی سطح بہت بلند ہوتی ہے اور مسئلہ بھی جانا پہنچانا ہوتا ہے نیز اس کے حوالے سے تقریباً سب کی رائے بھی پہلے سے معلوم ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں پہلے تین مراحل کو نظر انداز کرتے ہوئے براہ راست چوتھے درجے سے مسئلے کا حل تلاش کرنا شروع کیا جاسکتا ہے۔

عملی مشورہ جات

- ۱۔ چنھی عادت گذشتہ تمام عادات کا پھل ہے جس طرح ہم بیج بوئے بغیر اور اُس کی نشور نما کے تمام مراحل سے حوصلے اور استقامت سیلڈرے بغیر پھل حاصل نہیں کر سکتے اسی طرح پہلی عادات کو اپنائے بغیر چنھی عادت پر بطریق احسن عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔ اس حوالے سے پہلی تین عادات ہمیں اپنے قدموں پر کھڑا کرتی ہیں اور ہمارے اندر وہ احساس تحفظ پیدا کرتی ہیں جس کی بنیاد پر ہم دوسروں کے ساتھ کھل کر ابلاغ کر سکتے ہیں۔ چوتھی اور پانچویں عادت لوگوں کے ساتھ عملی تعاون کیلئے ہمیں تیار کرتی ہے پھر چنھی عادت گزشتہ تمام عادات پر عمل کے ثمرات کو سمینے میں مدد دیتی ہے۔ لہذا ایک مرتبہ پھر رُک کر جائزہ لیں کہ پہلی پانچ عادات کو شخصیت کا حصہ بنانے کیلئے جو محنت درکار تھی وہ کر لی گئی ہے؟ اس حوالے سے جہاں جہاں کمی دکھائی دے اُسے پورا کرنے کی کوشش کریں۔
- ۲۔ اختلاف کو قبول کرنے کے حوالے سے جن تین گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے کسی وقت بیٹھ کر جائزہ لیں کہ آپ کا شمار اُن میں سے کس گروہ میں آتا ہے؟ اختلاف سے نفرت کرنے والوں میں؟ اختلاف کو برداشت کرنے والوں میں؟ یا اختلاف کو قبول کرنے والوں میں؟
- اگر ماضی میں آپ نا دانستہ طور پر پہلے یا دوسرے گروہ میں رہے ہیں تو سوچ بچار کر کے اپنے ذہن کو تبدیل کرتے ہوئے تیسرے گروہ میں شامل ہونے کی کوشش کریں۔ اپنے دل و دماغ میں اتنی وسعت اور کشادگی پیدا کریں جو ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ خوش دلی سے تعاون کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔
- ۳۔ آئندہ جب بھی کسی شخص یا اشخاص کے ساتھ کسی اہم معاملے پر گفتگو ہونے لگے تو فوراً تعاون کے عملی منصوبے پر غور کریں اور اُسے عمل میں لانے اور اُس کی روشنی میں معاملات کو طے کرنے کی کوشش کریں۔
- ۴۔ اس بات کو دل و دماغ میں نقش کر لیں کہ آپ ساری کائنات میں ایک بالکل منفرد وجود ہیں۔

کوئی بھی دوسرا شخص آپ کی طرح کا نہیں ہے۔ لہذا کسی بھی شخص سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے احساس برتری یا کمتری کا شکار ہونا حماقت ہے۔ اپنی انفرادیت کو ماننے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی انفرادیت کا بھی اقرار کر لیں کہ ان میں سے بھی ہر فرد ایک منفرد وجود ہے جو اپنی جداگانہ اور مخصوص صفات خصوصیات کا مالک ہے۔ کسی بھی شخص کا کسی دوسرے شخص سے موازنہ کرنا درست نہیں ہے۔ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہے اور ایک مخصوص شخص اور انفرادیت کا مالک ہے جسے تسلیم کرتے ہوئے اُس کی صلاحیتوں، توانائیوں اور استعدادوں سے بھرپور فائدہ حاصل کرنا ہے اور تخلیقی تعاون کے ذریعے نئی راہوں کو تراشنا اور نئی منزلوں کو حاصل کرنا ہے۔ لہذا جو بھی شخص سامنے آئے اُس کی شخصیت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے اُس کی اچھوتی اہلیتوں اور مخصوص جوہر (Talent) کو دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ پھر اُن صلاحیتوں کو اپنی صلاحیتوں سے ملاتے ہوئے اعلیٰ مقاصد کے حصول کیلئے منصوبہ بندی کریں۔

☆☆☆

حواشی

- Covey, The 7 Habits of Highly Effective People, P 262 Stephen R. -۱
- محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اُردو)، ص ۲۱۷ -۲
- الانفال، ۶۴:۸ -۳
- فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، فریڈ بک ڈپولمیٹ، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۶ -۴
- المائدہ، ۲:۵ -۵
- بخاری، الصحیح، رقم: ۸۶۳/۲، ۲۳۱۱ -۶
- ال عمران، ۱۰۳:۳ -۷
- المائدہ، ۹۱:۵ -۸
- طبرانی، سلیمان بن احمد (۲۶۰-۳۶۰ھ/۸۷۳-۹۷۱ء)۔ المعجم الصغیر۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۳ھ، رقم: ۱۳۱/۲، ۹۰۷ -۹
- بخاری، الصحیح، رقم: ۱۸۲/۱، ۴۶۷ -۱۰
- الرحمن، ۲۹:۵۵ -۱۱
- البقرہ، ۲:۲۵۳ -۱۲
- الذخرف، ۳۲:۳۳ -۱۳
- Covey, The 7 Habits of Highly Effective Teenagers, P 186 Stephen R. -۱۴
- ہندی، حسام الدین، کنز العمال، رقم ۵۹/۱۰، ۲۸۶۸۶ -۱۵
- ال عمران، ۶۳:۳ -۱۶
- مسلم، الصحیح، رقم: ۹۳/۱، ۹۱ -۱۷
- البقرہ، ۲:۱۳۶ -۱۸
- اسلام کی روحانی قدریں۔ موت نہیں زندگی، ص ۲۱۴ -۱۹
- ایضاً، ص ۲۵۱ -۲۰
- The Law Of Success in Sixteen Lessons, The Ralston Napoleon Hill, -۲۱
- University Press Meriden, Conn, 1928, p51

باب سوم

باکمال زندگی کے اصول

فصل اول: صلاحیتوں کی تجدید کرنا

فصل دوم: فکری گمراہیوں کا علاج

فصل سوم: عملی گمراہیوں کا علاج

فصل اول:

صلاحیتوں کی تجدید کرنا

ساتویں عادت کیا ہے؟

ساتویں عادت کو سمجھنے کیلئے مندرجہ ذیل مثالوں پر غور کریں:

۱۔ فرض کریں کہ آپ ایک جنگل میں سے گزر رہے ہیں جہاں ایک شخص بڑی تیزی کے ساتھ ایک آری کے ساتھ درخت کا تنا کاٹ رہا ہے وہ شخص پسینے میں شرابور ہے اور محسوس ہو رہا ہے کہ اُسے اس کام کو کرتے ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے آپ کے اور اُس کے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوتا ہے:

آپ: ”کیا کر رہے ہیں؟“

وہ: ”تم دیکھ نہیں رہے ہیں یہ درخت کاٹ رہا ہوں۔“

آپ: ”کتنی دیر سے یہ کام کر رہے ہو؟“

وہ: ”چار گھنٹے ہو چکے ہیں اور میں کافی تھک چکا ہوں یہ لکڑی بہت سخت ہے۔“

آپ: ”تھوڑا سا آرام کر لیں اور اس دوران آپ اپنی آری کو بھی تیز کر لیں کیونکہ یہ کافی کند ہو چکی ہے۔ ایسا کرنے سے کام سہولت اور آسانی سے مکمل ہو جائے گا۔“

وہ: ”میرے پاس آرام کرنے اور آری کو تیز کرنے کیلئے وقت نہیں ہے۔ ابھی بہت سارا کام پڑا ہے۔ مجھے اسے ختم کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ معمولی سے غور و فکر سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اگر یہ شخص چند منٹ کا وقفہ لیکر آری کو اچھی طرح تیز کر لے تو اس کے نتیجے میں یہ شخص اپنا کافی سارا وقت بچا سکتا ہے اور اپنے کام کو جلد مکمل کر سکتا ہے۔

۲۔ ہمارے ہاں ”لاچ بُری بلا ہے“ کے عنوان کے تحت ایک کہانی کچھ یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک غریب کسان کے پاس ایک پالتو بٹخ ہوتی ہے۔ ایک صبح اُسے اُس کے نیچے سے سونے کا ایک انڈہ ملتا ہے پہلے تو اُسے یقین ہی نہیں آتا لیکن پھر بہر حال اچھی طرح اُلٹ پلٹ کر اُسے دیکھ کر خوشگوار حیرت کے ساتھ اُسے یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگلے دن اُسے بٹخ کے نیچے سے ایک اور سونے کا انڈہ مل جاتا ہے تو اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہتا۔ پھر یہ روزانہ کا معمول بن جاتا ہے وہ روزانہ صبح سویرے اُٹھ کر بٹخ کے دڑبے کی طرف بھاگتا ہے اور اُسے ہر دفعہ وہاں ایک نیا سونے کا انڈہ مل جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بہت زیادہ امیر بن جاتا ہے۔ دولت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اُس میں لاچ اور حرص بھی بڑھنے لگتی ہے اور اُس کے لئے ہر روز انڈے کا انتظار کرنا ایک مشکل سا کام بن جاتا ہے۔ چنانچہ ایک روز وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ بٹخ کو مار دے گا اور اُس کے اندر سے ایک ہی مرتبہ تمام انڈے نکال لے گا تاکہ اُسے روزانہ انتظار کی کوفت برداشت نہ کرنی پڑے۔ لیکن جب وہ بٹخ کو مارنے کے بعد اُس کا پیٹ چاک کرتا ہے تو وہاں اُسے کوئی انڈہ نہیں ملتا ہے اور نہ ہی آئندہ انڈوں کے ملنے کی کوئی اُمید باقی رہتی ہے۔ کیونکہ اُس نے وہ ذریعہ ہی ختم کر دیا ہے جس سے انڈے ملا کرتے تھے۔

اس کہانی میں اگر یہ شخص لاچ اور بے صبری کا شکار ہو کر ایک ہی بار انڈوں کو حاصل کرنے کے شوق میں بٹخ کو نہ مار ڈالتا تو وہ مستقل بنیادوں پر انڈے حاصل کر سکتا تھا۔

۳۔ ہمارے ہاں اچھی کمپنیاں جو بچکھے تیار کرتی ہیں وہ سالہا سال تک چلتے رہتے ہیں اور مختلف اوقات میں اُن کے چلنے کا مجموعی دورانہ ہزاروں گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم کسی اچھی سے اچھی کمپنی کا پنکھا خرید کر اُسے بغیر کسی وقفہ کے چلاتے جائیں تو وہ بمشکل ایک سو گھنٹے چل کر جواب دے دے گا اور خراب ہو جائے گا۔

وہی پنکھا جب مناسب وقفوں سے چلایا جاتا ہے تو وہ بغیر کسی خرابی کے ہزاروں گھنٹے چل سکتا ہے۔ لیکن جب اُسے آرام کا وقفہ دیئے بغیر چلایا جاتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ سو گھنٹے تک چل کر بند ہو جاتا ہے۔

پیداوار (Production) اور پیداواری صلاحیت (Production Capability) میں توازن

مندرجہ بالا تینوں مثالوں میں جو بات قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر جگہ پر دو چیزیں ہیں ایک ہے پیداوار یعنی وہ منافع جو حاصل کیا جا رہا ہے اور دوسری چیز ہے پیداواری صلاحیت، یعنی وہ ذریعہ اور وسیلہ جس کے ذریعے سے مطلوبہ منافع حاصل کیا جا رہا ہے۔ سہولت کیلئے ہم پیداوار کو P اور پیداواری صلاحیت کو PC (Production Capability) سے ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ پہلی مثال میں درخت کا کاٹنا P ہے جبکہ آری PC ہے۔ دوسری مثال میں سونے کا انڈہ P ہے جبکہ بیلچہ PC ہے۔ تیسری مثال میں ہوا کا حاصل ہونا P ہے جبکہ پنکھا PC ہے۔

سمجھنے والی بات یہ ہے کہ جب ہم اپنی توجہ P کو حاصل کرنے پر مرکوز کر دیتے ہیں اور اس میں انہماک ہمیں PC کی حفاظت اور نگہداشت سے غافل کر دیتا ہے تو پھر یا تو PC ختم ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں ہمیں بالآخر P سے بھی محروم ہونا پڑتا ہے جیسا کہ دوسری اور تیسری مثالوں سے آشکار ہے۔ اور یا پھر PC کی صلاحیت اور استعداد میں کمی آ جاتی ہے۔ اور اُس کا نتیجہ P میں کمی کی صورت میں نکلتا ہے جیسا کہ مثال نمبر ایک میں دکھائی دے رہا ہے۔ لہذا ہمارے لئے بہترین راستہ یہی ہے کہ P اور PC میں توازن کو کسی بھی سطح پر نظر انداز نہ ہونے دیں۔ ہماری نظر ایک طرف P کے حصول پر ہو تو ساتھ ہی ساتھ PC کی حفاظت اور نگہداشت پر بھی توجہ مرکوز ہو۔ اور اُسے بہترین حالت میں رکھنے کیلئے مناسب وقفوں کے ساتھ مناسب اقدامات اٹھائے جاتے رہے۔ صرف اسی صورت میں ہم اپنے مطلوبہ مقاصد لمبی مدت تک بطریق احسن حاصل کر سکتے ہیں۔ بصورت دیگر PC کو نظر انداز کرنے کی صورت میں وقتی طور پر تو شاید ہمیں P کے حوالے سے توقع سے بھی بڑھ کر شاندار نتائج مل جائیں لیکن جلد یا بدیر ہمیں اُن سے مستقل طور پر محروم ہونا پڑے گا۔

P اور PC میں توازن کا مسئلہ کسی خاص شعبے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اصول ہے جس کا تعلق ہر شعبہ حیات سے ہے۔ مثلاً ایک فیکٹری کا مالک جو کچھ تیار کرتا ہے وہ P ہے اور جس مشینری کے ذریعے تیار کرتا ہے وہ PC ہے۔ اگر وہ پیداوار کی ایک خاص مقدار مستقل بنیادوں پر حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُس کے لئے اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے کہ وہ مشینری کی کارکردگی کو برقرار رکھنے کیلئے اُسے دانشمندانہ طور پر استعمال میں لائے۔ مناسب وقفوں سے اُسے آرام دے۔ اُس کی صفائی و

ستھرائی اور تعمیر و مرمت (Maintenance) کے تمام تر تقاضے ساتھ ساتھ پورے کرتا رہے۔ اسی طرح ایک کار کا مالک اپنی کار سے سفری سہولیات کی صورت میں جو P حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُس کے لیے اُسے PC یعنی کار کی حفاظت کرنا ہوگی۔۔ اُس کے کام اور آرام کے وقفوں میں توازن قائم رکھنا ہوگا۔ حسب ضرورت اس میں پٹرول ڈلوانا ہوگا۔ مناسب وقفوں کے بعد اس کی صفائی ستھرائی اور تیل بدلی (Changing the Engine Oil) نیز اُس کی شکست و ریخت کو ساتھ ہی ساتھ درست کرنا ہوگا۔ صرف اسی صورت میں کار اُس کے مطلوبہ مقاصد کو عرصہ دراز تک بطریق احسن پورا کر سکتی ہے۔

پھر یہ اصول صرف مادی چیزوں تک محدود نہیں ہے بلکہ انسانی تعلقات اور رشتوں ناطوں میں بھی اس توازن کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ دوسروں سے تعلقات کے ضمن میں اُن کی طرف سے حسب ضرورت جو مدد اور تعاون ہمیں ملتا ہے وہ P ہے جبکہ باہمی تعلقات کا خوشگوار ہونا اور اعتماد کے اعلیٰ درجے کا برقرار ہونا PC ہے۔ اگر ایک شخص اپنی تمام تر توجہ تعلقات سے مفادات اور ثمرات کو سمیٹنے پر مرکوز کر دے اور اس بات کی پرواہ نہ کرے کہ اُس کے طرز عمل سے دوسرے کس طرح متاثر ہو رہے ہیں تو بہت جلد وہ وقت آجائے گا جب اُن کی نظروں میں اس کی تصویر ایک لالچی، خود غرض اور مفاد پرست شخص کی سی بن جائے گی۔ تعلقات سرد مہری کا شکار ہو جائیں گے۔ PC کے متاثر ہونے کے بعد P کے مطلوبہ درجہ کا حصول بھی ناممکن ہو جائے گا۔

ساتویں عادت کا مفہوم

ساتویں عادت P اور PC کے مابین توازن کے حوالے سے ہی ہے اس عادت کا کہنا ہے کہ دنیا میں کسی بھی قسم کے اثاثہ سے بھر پور اور متواتر فائدہ اٹھانے کیلئے اصل اثاثہ کی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے اور دنیا کے اندر بے شمار قسم کے اثاثہ جات پائے جاتے ہیں لیکن ان تمام اثاثہ جات میں سے سب سے قیمتی اور انمول اثاثہ ہے

”انسان کی اپنی ذات“

جتنی بھی ترقیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں انسان دنیا میں حاصل کرتا ہے اور جس جس معاملے میں جو جو کارہائے نمایاں سرانجام دیتا ہے اور جتنے بھی معرکے سر کرتا ہے اُن سب کا دار و مدار اُس کی اپنی

ذات پر ہی ہوتا ہے۔ لہذا خارجی دنیا میں کسی بھی قسم کے نتائج حاصل کرنے کیلئے اُس کے اپنے وجود کا اعلیٰ ترین حالت میں ہونا بہت ضروری اور اولین شرط ہے۔ چنانچہ ساتویں عادت کا عنوان ہے ”صلاحیتوں کی تجدید کرنا“

اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف مقاصد کے حصول کیلئے جدوجہد کرنے کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً مسلسل اور متواتر بنیادوں پر اپنی صلاحیتوں، توانائیوں اور استعدادوں کی تجدید (Renewal) کرتے رہنا تاکہ وہ بہترین حالت میں رہیں اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔ بصورت دیگر غفلت اور عدم توجہی کے ارتکاب کی صورت میں وہ شکست و ریخت کا شکار ہو کر پڑ مردہ ہو جائیں گی۔ نتیجتاً مطلوبہ مقاصد کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔

ساتویں عادت کی اہمیت

غور سے دیکھا جائے تو ساتویں عادت انتہائی اہم ہے جو بقیہ تمام عادات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بقیہ تمام عادات کو عمل میں لانے کیلئے سب سے پہلے ہماری اپنی ذات کا صحت مند حالت میں ہونا ضروری ہے۔ اگر ہمارا اپنا وجود ہی خزاں رسیدہ درخت کی طرح مرجھایا ہوا ہوگا اور ہماری صلاحیتیں ہی تھکی ماندی ہوں گی تو پھر ہمارے اندر وہ جوش و خروش، وہ جذبہ و جنوں اور وہ عزم مصمم پیدا ہی نہیں ہوگا جو آگے بڑھ کر طوفانوں کا رخ موڑ دیا کرتا ہے، پہاڑوں کا جگر پاش کر دیا کرتا ہے اور ستاروں پر کندیں ڈالا کرتا ہے۔ لہذا اگر ہم دین، دنیا اور آخرت کے اندر کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کی باقاعدگی کے ساتھ تجدید کرتے رہیں اور اپنی حیات نو کیلئے ضروری اقدامات کرتے رہیں۔

ساتویں عادت اپنی اہمیت کی بنا پر وقت کے دوسرے چوتھائی کا کام ہے اور اسے اس خانے کی اعلیٰ ترین سرگرمی کہا جاسکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ کام بذات خود انتہائی اہم ہے اور دوسری طرف یہ ایسا کام ہے جسے کوئی دوسرا ہماری خاطر نہیں کر سکتا ہے۔ یہ کام ہمیں خود ہی کرنا ہے نیز یہ ایک ایسا کام ہے، جسے فوری طور پر نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کیلئے ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ محنت کرنا ہوتی ہے۔ یہ محنت اتنی ضروری ہے کہ ایک طرف تو یہ ہمیں زندگی سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہونے کے

قابل بنا دیتی ہے اور دوسری طرف دنیا کی سٹیج پر ہمیں اپنا کردار بھرپور، فعال اور موثر طریقے سے ادا کرنے کیلئے تیار کرتی ہے۔ (دیکھئے وقت کی تنظیم کا چارٹ۔ تیسری عادت)

تمام تر اہمیت کے باوجود یہ کام چونکہ وقت کے دوسرے چوتھائی والے خانے میں آتا ہے اور اس خانے کے کاموں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اہم ہونے کے باوجود ضروری نہیں ہوتے۔ اُن کے حوالے سے ہمارے اوپر کوئی فوری دباؤ نہیں ہوتا۔ لہذا اُنہیں آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ یہی کچھ اس معاملے میں بھی لوگوں کی اکثریت کے ساتھ ہوتا ہے۔ بیشتر لوگ اپنے بیرونی معاملات کو سلجھانے، مسائل کو حل کرنے اور ترقی کے سفر میں آگے بڑھنے کے شوق میں ذہنی و جسمانی طور پر اتنا مصروف ہو جاتے ہیں کہ اپنی ذات کیلئے اُن کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ صلاحیتوں کی تجدید کے حوالے سے مسلسل غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کا فوری طور پر اثر مرتب ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ غفلت اور لاپرواہی کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد قدرت کا قانون مکافات عمل حرکت میں آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کوتاہیوں، غفلتوں اور بد اعتدالیوں کے اثرات آہستہ آہستہ اندر جمع ہوتے چلے جاتے ہیں اور انسان کو اندر سے کھوکھلا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی صلاحیتیں دیمک زدہ اور زنگ آلودہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ پھر وہ وقت آتا ہے جب بہت کچھ کرنے کو دل کرتا ہے لیکن نہ تو اُس کو کرنے کیلئے جذبہ، جوش و خروش ہوتا ہے اور نہ ہی عملی طور پر طاقت اور قوت ہوتی ہے۔ انسان بے شمار حسرتوں، ارمانوں اور خواہشوں کو لئے ہوئے خزاں رسیدہ پتے کی طرح شاخ حیات سے گرتا ہے اور منوں مٹی تلے دفن ہو جاتا ہے۔

گویا PC کو نظر انداز کرنے سے P کو حاصل کرنے کے تمام خواب اور منصوبے ادھورے رہ جاتے ہیں اور انسان نا تمام حسرتوں کو لئے ہوئے دوسری دنیا کی طرف چلا جاتا ہے۔

تجدید کے چار پہلو

صلاحیتوں کی تجدید کے حوالے سے ہمارے لئے یہ جاننا اہم ہے کہ ہماری شخصیت کے مرکزی حصے کون کون سے ہیں، جن سے شخصیت معرض وجود میں آتی ہے۔ زندگی کی وہ کون کون سی جہتیں (Dimensions) ہیں، جو ہماری شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ مندرجہ ذیل چار پہلو

(Aspects) ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے۔

(i) طبعی پہلو

اس سے مراد ہمارا جسم ہے جو مختلف اعضاء مثلاً ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، زبان وغیرہ پر مشتمل ہے۔ دنیا کے ساتھ ہمارے سارے رابطے اس جسم کے ذریعے سے ہیں۔ جو کام بھی ہم سر انجام دیتے ہیں، اُن کے اندر جسم اور اس کے اعضاء کا کردار بنیادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ لہذا جسم کو شخصیت کی بنیادی اکائی (Basic unit) قرار دے دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

(ii) ذہنی پہلو

انسان کے سر میں اللہ رب العزت نے دماغ کی صورت میں ایک حیرت انگیز آلہ رکھ دیا ہے جو سارے جسم سے بذریعہ اعصاب اطلاعات وصول کرتا ہے اور انہیں ہدایات دیتا ہے۔ تمام جسمانی سرگرمیوں (Activities) کا دارمدار خیالات پر ہے اور خیالات کا تانا بانا یہیں پر بنا جاتا ہے۔ عقل کا تعلق اسی حصے سے ہے۔

(iii) قلبی پہلو

انسان کے سینے میں اللہ رب العزت نے ایک دھڑکتا ہوا دل بھی رکھا ہوا ہے جو ہر قسم کے جذبات کا مرکز و محور ہے۔ محبت، خلوص، ایثار و قربانی اور عزت و تکریم کے تمام اچھے جذبات بھی یہیں پر پیدا ہوتے ہیں، جبکہ نفرت، کدورت، حسد، حرص اور بغض و عداوت جیسے منفی جذبات بھی یہیں پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس حصے کا تعلق ہمارے سماجی تعلقات سے ہے۔ دماغ کو اگر علم کا برتن کہہ لیا جائے تو دل کو عشق و محبت کا برتن قرار دیا جاسکتا ہے۔

(iv) روحانی پہلو

یہ ہماری شخصیت کا باطنی پہلو ہے جو اگرچہ دکھائی نہیں دیتا مگر ہماری شخصیت کا اصل مرکز و محور یہی ہے چونکہ یہ ہماری اصلیت اور حقیقت ہے اور حقیقت ہمیشہ ہی نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی بھی پھل کے اندر ذائقہ اصل مقصود ہوتا ہے مگر دنیا کا کوئی بھی سائنسدان ایسا نہیں ہے جو کسی انتہائی حساس خوردبین (Microscop) کے ذریعے دکھا سکے کہ ذائقہ کہاں موجود

ہے؟ جس طرح ذائقہ دکھائی نہ دینے کے باوجود پھل کے اندر موجود ہے اسی طرح روح دکھائی نہ دینے کے باوجود جسم کے اندر ایک زندہ و جاوید حقیقت کے طور پر موجود ہے۔

مندرجہ بالا چاروں پہلوؤں کے مجموعے سے شخصیت تشکیل پاتی ہے ان میں سے کسی ایک کو بھی غیر اہم یا کم اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح ایک دائرے کے اندر ہر نقطہ اپنی جگہ اہم ہوتا ہے اسی طرح شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں یہ چاروں پہلو اپنی اپنی جگہ بہت اہم ہیں اور یہ چاروں مل کر ہی شخصیت کے دائرے کو مکمل کرتے ہیں۔ جسے ڈایا گرام کی شکل میں یوں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

صلاحیتوں کی تجدید کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے وجود کے ان چاروں حصوں کو کبھی کبھار نہیں بلکہ ہمیشہ اپنی بہترین حالت میں رکھنے کی کوشش کریں۔ اور انہیں دانشمندانہ اور متوازن طریقے سے استعمال میں لائیں۔ زندگی میں اگر واقعی ہم اپنے لئے کوئی اہم اور طاقتور کام کر سکتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ ہم اپنے اُپر کام کریں۔ کیونکہ ہم خود ہی وہ ہتھیار ہیں کہ جس کے ذریعے ہم زندگی سے نبتے ہیں اور اس میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ ہم اپنی کارکردگی کے خود ذمہ دار ہیں اور اپنی کارکردگی میں پُر اثر ہونے کیلئے بہت ضروری ہے کہ ہم چاروں حوالوں سے صلاحیتوں کی تجدید کیلئے وقت نکالنے کی اہمیت کو سمجھیں۔ صلاحیتوں کی تجدید پر صرف ہونیوالا وقت ہماری وہ زبردست سرمایہ کاری ہے جو ہم اپنے آپ کو بہترین حالت میں رکھنے کے لئے کر سکتے ہیں۔ جب ہم جسمانی، ذہنی، قلبی اور روحانی طور پر بہترین حالت میں ہوں گے تو ہماری کارکردگی بھی بہترین ہوگی۔ اور ہم اپنے جملہ فرائض اور ذمہ داریوں کو بطریق احسن سرانجام دے سکیں گے۔ جس کے نتیجے میں ہمارا خدا بھی ہم سے راضی ہوگا، لوگ بھی ہم سے خوش ہوں گے اور خود ہم بھی اپنی نگاہوں میں مطمئن اور مسرور ہوں گے۔ یہی کامیاب زندگی کی سب سے بڑی کلید ہے۔

تجدید میں توازن

تجدید کے حوالے سے خاص طور پر یاد رکھنے والی انتہائی اہم بات یہ ہے کہ تجدید کے عمل میں چاروں پہلوؤں کو شامل کرنا چاہیے اور ان میں توازن بھی رکھنا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ شخصیت کے یہ چاروں پہلو اپنی جداگانہ اور منفرد حیثیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست طریقے سے باہمی طور پر جڑے ہوئے بھی ہیں۔ اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی ایک کی بہتری کے حوالے سے کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو وہ اس کو براہ راست متاثر کرنے کے علاوہ بالواسطہ طور پر دوسروں پر

بھی اثر انداز ہوتا ہے، دوسری طرف کسی ایک کو نظر انداز کرنے کے منفی اثرات دوسروں پر بھی پڑتے ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ کار کا ایک پہیہ ٹیڑھا ہو جائے تو چاروں کی حرکت میں فرق آ جاتا ہے، حالانکہ خرابی صرف ایک میں ہے۔ اسی طرح جب ہمارا جسم تھکا ہوا ہوتا ہے تو دماغ پراگندہ، دل بوجھل اور روح پڑ مردہ سی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب جسم تروتازہ حالت میں ہوتا ہے تو بقیہ تینوں بھی مطمئن اور پرسکون محسوس ہو رہے ہوتے ہیں۔ لہذا تجدید کے کام کو زیادہ پُر اثر اور بار آور بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم چاروں پہلوؤں کی عقلمندی کے ساتھ متوازن انداز میں تجدید کرتے رہیں۔

بہت سارے لوگ تجدید کے معاملے میں یہ سنگین غلطی کرتے ہیں کہ زندگی کے کسی ایک یا دو زخموں پر تمام تر توجہ مرکوز کر دیتے ہیں اور باقی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ بہت سارا وقت اپنا جسم بنانے پر صرف کر دیتے ہیں مگر ذہنی حالت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ نہیں دیتے جس کے نتیجہ میں وہ ذہنی صلاحیتوں کے معاملے میں بانجھ رہ جاتے ہیں۔ اس کی مثال پہلوانوں میں بکثرت دیکھی جاسکتی ہے۔ بعض لوگ ذہنی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لیے بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں مگر سماجی حوالے سے کوئی اہم کردار ادا نہیں کر پاتے کیونکہ انہوں نے اپنے جذبات کی تربیت اور سماجی تعلقات کے حوالے سے کوئی خاص جدوجہد نہیں کی ہوتی لہذا اس پہلو میں کمزور رہ جاتے ہیں۔ اس کی مثال وہ تمام نام نہاد قسم کے دانشور ہیں جو بزعم خویش خود کو بہت بڑا دانشور سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کو کسی خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ لوگ جذبات کی نزاکتوں اور لطافتوں سے نا آشنا ہوتے ہیں چنانچہ دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنا اور ان میں گھل مل کر رہنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض لوگ روح کو ہی سب کچھ سمجھ کر ماحول اور معاشرے سے منقطع (Cut off) ہو کر اُسے بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں لگ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے جسم کئی قسم کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ذہنی ترقی کا سفر بھی خاطر خواہ جاری نہیں رہتا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی گرم جوشی والے تعلقات برقرار نہیں ہوتے۔ یہ ساری صورتیں افراط و تفریط اور عدم توازن کی ہیں جو زندگی کے اندر کئی قسم کی ناہمواریاں، کجیاں، کیاں اور خامیاں پیدا کر دیتی ہیں، جن کے نتیجے میں زندگی محرومیوں، مایوسیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کا مرقع بن کر رہ جاتی ہے، لہذا اپنی صلاحیتوں سے بھرپور کام لینے اور ایک مکمل اور فعال زندگی بسر کرنے کیلئے زندگی کے چاروں حصوں میں توازن قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔

ہمارے دین کے اندر اعتدال، توازن اور میانہ روی کی روش کو اپنانے کی بہت زیادہ تلقین کی گئی ہے بلکہ اس صفت کو اُمتِ مسلمہ کا بنیادی وصف قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا. (۱)

”اس طرح ہم نے آپ کو اعتدال والی اُمت بنایا“

حضور ﷺ نے فرمایا:

خیر الامور اوسطها. (۲)

”کاموں میں اعتدال والی روش بہتر ہے۔“

اسی طرح انگریزی زبان کا ایک قول ہے:

”Excess of every thing is bad“ (۳)

اور اردو میں اسی محاورے کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

”افراط سے پیا جائے تو آبِ حیات بھی زہر بن جاتا ہے“

زندگی کا سارا حسن ہی توازن میں ہے۔ اعتدال و توازن جس بھی معاملے میں آجائیں اُس میں خوبصورتی اور بہتری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس افراط و تفریط جہاں بھی ہوں وہاں معاملات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ مشرق و مغرب کے سارے ہی دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ ہر معاملے میں توازن کی روش ہی اپنانی چاہیے۔ لیکن بہت کم خوش نصیب ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں توازن کو عملی طور پر برقرار رکھ پاتے ہیں۔ ورنہ اکثر و بیشتر زندگیاں کہیں نہ کہیں عدم توازن کا شکار ہوتی ہیں حتیٰ کہ بعض بہت سارے ایسے لوگ جو کسی نہ کسی فن کے حوالے سے شہرت کی بلندیوں پر فائز ہوتے ہیں اُن کی اندرونی زندگیوں میں جھانکنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی کے بعض شعبوں مثلاً عائلی اور خاندانی زندگی وغیرہ جیسے شعبوں میں کتنے ناکام ہیں۔ اُس کی وجہ ہی یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے زندگی کے ایک دو پہلوؤں پر اتنی زیادہ توجہ دی ہوتی ہے کہ دوسرے پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ اور اُس کے نتیجے میں زندگی عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے اور یوں بعض محاذوں پر کامیاب ہو جانے کے باوجود زندگی کو مجموعی طور پر

کامیاب کہنا مشکل ہوتا ہے۔

تاریخ انسانی کے اندر جو لوگ حقیقی معنوں میں کامیاب و کامران دکھائی دیتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جو اپنی شخصیت کے تمام حصوں کو متوازن انداز میں استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ اُن میں سرفہرست (Top of the List) انبیاء کرام کی شخصیات ہیں جو زندگی گزارنے کے قوانین وحی کی صورت میں براہ راست ذاتِ خداوندی سے لیتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی زندگیاں افراط و تفریط اور ہر قسم کی بے اعتدالیوں سے پاک ہوتی ہیں اور ہر چیز اپنے مقام پر دکھائی دیتی ہے۔ پھر اس گروہ انبیاء میں سے بھی نکتہ کمال جسے پوری انسانیت کیلئے انتہائی مثالی نمونہ (Roll Model) قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ حضور ﷺ کی ذات مبارک ہے۔

حضور ﷺ کی ذات مبارک صرف کمال کے معیار پر پوری ہی نہیں اُترتی بلکہ آپ ﷺ کی ذات خود کمال کا معیار ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کی زندگی کے اندر مذکورہ بالا تمام شعبوں میں کمال کا توازن دکھائی دیتا ہے۔ آپ ﷺ کی جسمانی زندگی کا یہ حال تھا کہ تریسٹھ سال کی عمر مبارک میں آپ ﷺ کو ایک دو مرتبہ بخار کے علاوہ اور کوئی مرض بھی نہ آیا یہی حال آپ ﷺ کی شخصیت مبارک کے ذہنی، قلبی اور روحانی پہلوؤں کا تھا کہ وہ سب کے سب حد درجہ توازن کے ساتھ اپنی بہترین حالت میں موجود تھے اور فطری انداز میں ترقی اور ارتقاء کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ قرآن مجید نے اس پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا خَيْرَ لَكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝ (۴)

”آپ (ﷺ) کی ہر آنے والی گھڑی پہلی گھڑی سے بہتر ہے۔“

لہذا آج اگر کوئی کسی بھی حوالے سے کمال پانا چاہتا ہے تو اُسے حضور ﷺ کی سنت و سیرت کے اندر جھانک کر دیکھنا ہوگا اور اپنی زندگی کی راہوں کو روشن اور منور کرنے اور اپنی جسمانی، ذہنی، قلبی، اور روحانی صلاحیتوں کی متوازن تجدید کیلئے بارگاہ نبوت ﷺ سے روشنی کی خیرات حاصل کرنا ہوگی۔

متوازن تجدید کے اصول

سطور بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دین، دنیا اور آخرت کی جملہ سعادتوں اور بھلائیوں

کے حصول اور زندگی کے دامن کو حقیقی، خوشیوں، راحتوں، مسرتوں، کامیابیوں اور کامرانیوں سے بھرنے کیلئے ہماری شخصیت کے چاروں پہلوؤں کی متوازن انداز میں تجدید ہوتے رہنا بہت ضروری ہے۔ نیز یہ کوئی ایک یا دو دن کا کام نہیں ہے بلکہ دوسرے تمام مشاغل حیات کے ساتھ ساتھ اس عمل کو زندگی بھر جاری رہنا ہے اور اس اہم ترین کام کو نظر انداز کرنے کی صورت میں ہم زندگی کے بازار سے نہ تو پوری قیمت وصول کر سکتے ہیں اور نہ ہی دنیا کی سٹیج پر اپنا کردار بھر پور، فعال اور موثر انداز میں ادا کر سکتے ہیں۔ لہذا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے کہ زندگی کی مصروفیات کے ہجوم میں سے اس کام کیلئے باقاعدگی سے وقت نکالتے رہیں اور اسے دانشمندانہ انداز میں بجالاتے رہیں۔

چاروں پہلوؤں کی متوازن تجدید کے حوالے سے ذیل میں چند اہم اصولوں کو بیان کیا جا رہا

ہے۔

(i) طبعی پہلو کی تجدید

ہمارا جسم قدرت کا بنایا ہوا انمول ترین شاہکار ہے جو مختلف ظاہری و باطنی اعضاء کا حسین و جمیل مرقع ہے۔ ایک طرف تو شخصیت کے دیگر تینوں پہلوؤں کا اظہار اس جسم کی وساطت سے ہے اور دوسری طرف دنیا کے تمام معاملات کو جسم اور اس کے اعضاء کے ذریعے ہی پایا تکمیل تک پہنچنا ہوتا ہے لہذا اس جسم کا صحت مند اور تندرستی کی حالت میں ہونا بہت ضروری ہے جسسانی صحت کی خرابی کی صورت میں کسی بھی کام کو خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ جسسانی صحت ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کی قدر کی جانی چاہیے اور اسے برقرار رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اسلام کے اندر بھی شخصیت کی قدر و قیمت کے تعین میں جسسانی صحت کو خاصی اہمیت دی گئی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

المومن القوی احب الی اللہ من المومن الضعیف (۵)

”طاقت ور مومن کمزور مومن کی نسبت اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔“

قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک موقع پر جب بنی اسرائیل کی فرمائش پر ان کے نبی نے

جہاد کیلئے طاقت کو اُن کا امیر مقرر کیا تو اُس کے تقرر کی وجہ سے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ (۶)

”اللہ تعالیٰ نے اُسے علم اور جسم کے معاملے میں فراخی عطا فرمائی ہے۔“

یہاں علم کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کو قیادت کے اوصاف میں سے ایک وصف مانا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیوں نے اپنے والد نے حضرت موسیٰ کو کام پر رکھنے کی سفارش کرتے ہوئے کہا

إِنَّ خَيْرَ مَنْ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ ۝ (۷)

”بے شک جو بہتر ملازم تو رکھنا چاہے، وہ ہے جو طاقت ور اور دیانتدار ہو“

یہاں پھر دیانتداری کے ساتھ جسمانی صحت و طاقت کو ذمہ داری کی اہلیت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس الصحة و الفراغ. (۸)

”دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے متعلق لوگوں کی اکثریت خسارے میں رہتی ہے وہ ہیں صحت اور فراغت۔“

اس حدیث مبارکہ سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ جسمانی صحت کا ہونا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کی قدر کرنی چاہیے۔ قدر کرنے سے مراد ایک طرف تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا ہے اور دوسری طرف حتیٰ الوسع اس کی حفاظت کرنا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ لوگوں کی اکثریت عام طور پر اس کی قدر و قیمت میں لاپرواہی کا مظاہرہ کرتی ہے۔

جس طرح دنیا کی کسی بھی مشینری کو صحت مند حالت (Working Condition) میں رکھنے کیلئے اُس کی ضروریات کا خیال رکھنا اور مناسب نگہداشت کرنا ضروری ہے اسی طرح ہمارے جسم کی مشینری کو بھی صحت مند اور توانا حالت میں رکھنے کیلئے حفظان صحت کے اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ یہ اصول یوں تو بہت زیادہ ہو سکتے ہیں مگر اس حوالے سے چار باتیں انتہائی اہم اور بنیادی حیثیت

کی ہیں جن پر توجہ دینے سے حوصلہ افزا نتائج مل سکتے ہیں۔

(الف) خوراک

خوراک ہمارے وجود کی بقاء اور ارتقاء کیلئے اولین ضرورت ہے۔ ہم خوراک کے بغیر زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری جملہ حرکات و سکنات میں توانائی خرچ ہوتی ہے۔ خوراک ہی وہ ایندھن ہے جو توانائی میں تبدیل ہو کر جسم میں توانائی اور حرارت کی سطح کو برقرار رکھتی ہے، جس کے نتیجے میں جسم صحت مند رہتا ہے۔ نیز جسم کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں بھی خوراک ہی اہم ترین کردار ادا کرتی ہے جس طرح گاڑی کے چلنے کیلئے پیٹرول ضروری ہے اسی طرح جسم کی مشینری کے رواں دواں رہنے کیلئے خوراک اشد ضروری ہے۔

خوراک کا معاملہ جسم کے لئے اہم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت حساس بھی ہے۔ ہر خوراک کے اپنے مخصوص اثرات ہوتے ہیں اور جس بھی قسم کی خوراک ہم کھاتے ہیں اُس کے اثرات ہمارے پورے جسم پر مرتب ہوتے ہیں۔ جسم کے ایک ایک خلیہ اور خون کے ایک ایک ذرے کو اسی خوراک سے بننا ہوتا ہے۔ جس طرح گاڑی میں ناقص پیٹرول ڈالنے سے وہ خراب ہو جاتی ہے اور اس کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے اسی طرح ناقص غذا کھانے سے جسمانی مشینری میں بھی نقص آجاتا ہے اور اس کی کارکردگی متاثر ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ خوراک اور صحت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور صحت کی خرابی کے اندر اکثر و بیشتر کافی سارا حصہ خوراک کے حوالے سے سنگین غلطیوں اور بے اعتدالیوں کا ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں ایک مقولہ ہے

“Health is made or marred in the Kitchen” (۹)

”صحت باورچی خانہ میں بنتی ہے اور یہیں پر بگڑتی ہے“

اسی طرح ایک اور قول یوں ہے

“Man never dies , he kills himself” (۱۰)

”آدمی مرتا نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنے آپ کو مارتا ہے۔“

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ آدمی اپنے دانتوں سے اپنی قبر خود کھودتا ہے۔ خوراک

کے حوالے سے سالہا سال کی بے اعتدالیاں اندر ہی اندر صحت کی جڑوں کو کمزور کرتی رہتی ہیں جسمانی مشینری کو وقت سے بہت پہلے ناکارہ بنا کر طرح طرح کی بیماریاں کی آماجگاہ بنا دیتی ہیں۔ ورنہ قدرت نے جو جسم انسان کو دیا تھا وہ تو پوری مدت تک کے لیے صحت مند رہنے کیلئے دیا تھا۔ پھر جب تو اے جسمانی کمزور ہو جاتے ہیں یا کوئی خطرناک بیماری انسان کی صحت پر حملہ آور ہو جاتی ہے تو زندگی کے سارے لطف اور ذائقے رخصت ہو جاتے ہیں۔ خوشیاں اور مسرتیں انسان سے روٹھ جاتی ہیں اور ایک بھر پور فعال، موثر اور متحرک زندگی گزارنا انسان کے لئے ممکن ہی نہیں رہتا۔ لہذا خوراک کے معاملے میں خصوصی احتیاط کی ضرورت ہے۔

خوراک کے حوالے سے کئی قسم کی غلطیاں کی جاتی ہیں او ان کی مناسبت سے کئی قسم کی احتیاطیں بھی ہیں جن کو اختصار کے ساتھ درج ذیل چار نکات کے تحت بیان کیا جا رہا ہے۔

(۱) متوازن غذا

انسانی جسم کے صحت مند رہنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ اسے متوازن غذا ملے۔ متوازن غذا سے مراد وہ غذا ہے جس میں تمام غذائی اجزاء موجود ہوں جن کی جسم کو ضرورت ہے تاکہ جسم کی مناسب نشوونما ہو سکے، صحت برقرار رہے اور انسان روزمرہ کے کام عمدگی سے سرانجام دے سکے۔ اگر غذا متوازن نہیں ہوگی تو وہ جسم کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکے گی۔ جس کے نتیجے میں انسان کمزور اور لاغر ہو کر مختلف قسم کے امراض میں مبتلا ہو جائے گا۔

متوازن غذا وہ ہے جس میں مندرجہ ذیل پانچ اجزاء شامل ہوں۔

۱۔ لکھیات (Proteins)

۲۔ حیاتیات (Vitamins)

۳۔ معدنیات اور نمکیات (Minerals & Salts)

۴۔ نشاستہ (Carbohydrates)

۵۔ چکنائی (Fats) (II)

مندرجہ بالا پانچ چیزوں کی مناسبت سے ماہرین نے غذا کے مندرجہ ذیل پانچ گروپ ترتیب دیے ہیں۔

پہلا گروپ:	گوشت، مچھلی، مرغی، انڈہ، دالیں
دوسرا گروپ:	سبزیاں اور پھل
تیسرا گروپ:	چاول، گندم، اور دیگر اناج مثلاً مکئی، باجرہ وغیرہ
چوتھا گروپ:	شکر، گھی اور ہر قسم چکنائی
پانچواں گروپ:	دودھ، دہی، لسی اور دودھ سے تیار شدہ تمام اشیاء۔ (۱۲)

متوازن غذا کو حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ روزانہ کی خوراک میں مندرجہ بالا پانچوں گروپوں میں سے ہر ایک گروپ سے ایک چیز شامل کر لی جائے اگر بجٹ ایسے خصوصی اہتمام کی اجازت نہ دے رہا ہو تو پھر سادہ سا اصول یہ ہے کہ محض چند چیزوں پر انحصار کرنے کی بجائے سبزیوں، پھل، دالوں، گوشت، دودھ وغیرہ میں سے جو کچھ بھی میسر آئے اُسے ادل بدل کر کھاتے رہنا چاہیے انشا اللہ العزیز متوازن غذا کی جسمانی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ علاوہ ازیں جسمانی ضرورت کی مناسبت سے صاف اور شفاف پانی کی موزوں مقدار کا استعمال بھی بہت ضروری ہے۔

(۲) موافق بدن غذا

غذا کے حوالے سے دوسری احتیاط یہ ہے کہ ایسی غذا کھائی جائے جو طبیعت اور مزاج کے موافق ہو۔ جو غذا کسی حوالے سے جسم کو نقصان دیتی ہو یا طبیعت پر گراں گزرتی ہو اُس سے پرہیز کیا جائے۔ اللہ رب العزت نے مختلف قسم کے مزاج پیدا کئے ہیں یونانی حکمت کے اندر مختلف اخلاط کی بناء پر باقاعدہ مزاجوں کی تقسیم کی گئی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک غذا کسی ایک کے لئے موافق ہو لیکن وہ دوسرے کے مزاج کے موافق نہ ہو۔ جو غذا ہمارے موافق نہ ہو وہ ہمیں ہرگز فائدہ نہیں دے سکتی، خواہ وہ اپنے آپ میں کتنے ہی فوائد کی حامل ہو۔ پھر بعض اوقات ایسے بھی ہوتا ہے کہ معمول کے حالات میں تو ایک چیز ہمارے لئے موافق اور فائدہ مند ہوتی ہے لیکن کسی وقتی بیماری یا مرض کا شکار ہونے کی صورت میں وہی چیز ہمارے لئے نقصان دہ بن جاتی ہے۔ اور اُس خاص کیفیت یا حالت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اُس چیز

سے پرہیز کیا جائے۔

دنیا کے اندر مختلف طریقہ ہائے علاج ہیں جن کے اپنے اپنے اصول اور ضابطے ہیں۔ تاہم ایک اصول ایسا ہے جو ساری دنیا کے اندر تقریباً مسلمہ ہے۔ اور وہ ہے:

“(۱۳) “Prevention is better than cure”

”پرہیز علاج سے بہتر ہے“

یہ صرف حکمت یا میڈیکل سائنس کا اصول ہی نہیں ہے۔ اسلام بھی اس اصول کو تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بھی پرہیز کو ہر علاج کی اصل قرار دیتے ہوئے اسے اپنانے کی ترغیب دی ہے۔ ایک مرتبہ دسترخوان پر کھجوریں پڑی ہوئی تھیں اور حضرت علیؓ کی آنکھیں دکھتی تھی۔ جب انہوں نے کھجوریں کھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا تو حضور ﷺ نے ان کی آنکھوں کے مسئلے (Problem) کی وجہ سے کھجوروں کو ان کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہوئے انہیں کھانے سے منع فرما دیا۔ (۱۴)

لہذا متوازن غذا کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی طبیعت اور مزاج کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے اور ان غذاؤں کو ترجیح دینی چاہیے جو ہمارے مزاج کے موافق ہوں۔ اس سے قیامِ صحت میں بہت زیادہ مدد مل سکتی ہے۔

(۳) بقدر ہضم غذا

تیسری احتیاط ہے اتنی غذا کھانا جتنی جسم کو ضرورت ہو اور جسے جسم آسانی کے ساتھ ہضم کر سکے۔ جو غذا ہمارا جسم ہضم کر لیتا ہے وہ جزو بدن بن کر ہماری طاقت اور صحت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ لیکن غذا کی جس مقدار کو جسم ہضم نہ کر سکے وہ نہ صرف یہ کہ جسم کو فائدہ نہیں پہنچاتی بلکہ الٹا نقصان کا باعث بنتی ہے۔ وہ زائد غذا معدہ اور انتڑیوں میں پڑی رہتی ہے جس سے وہاں تعفن پیدا ہوتا ہے اور کئی بیماریوں کو جنم دینے کا باعث بن جاتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بسیار خوری (بلا ضرورت یا زائد از ضرورت کھانا) بے شمار امراض کی جڑ ہے۔ بسیار خوری معدے کو کمزور کر دیتی ہے جس کا اثر تمام جسم پر پڑتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے قیامِ صحت کے حوالے سے معدے کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اسے ایک حوض سے تشبیہ جس مختلف

نالیاں نکلتی ہیں جیسا حوض کا پانی ہوگا ویسا ہی نالیوں میں آئے گا۔ ایسے ہی جسمانی صحت کا انحصار معدہ کے صحت مند ہونے پر ہے۔ احادیث مبارکہ میں جا بجا کم کھانے کی تاکید کی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مومن کا کھانا بقدر ضرورت ہوتا ہے۔ اُس کے کھانے کا مقصود صحت کو قائم رکھنا ہوتا ہے نہ کہ محض لذت کا حصول۔ وہ زندہ رہنے کیلئے کھاتا ہے نہ کہ کھانے کیلئے زندہ رہتا ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

ما من وعاء ملاء ابن آدم شرأمن بطن بحسب ابن آدم لقيمات يقمن صلبه فان كان لا بد فاعلا فثلث لطعامه و ثلث لشرابه و ثلث لنفسه. (۱۵)

”آدمی نے پیٹ سے برابر تن اور کوئی نہیں بھرا۔ ابن آدم کیلئے چند لقمے کافی ہیں جو اُس کی پیٹھ کو سیدھا رکھ سکیں اگر وہ زیادہ کھانا ہی چاہے تو ایک حصہ کھانے سے بھرے، ایک حصہ پانی کے لئے اور تیسرا حصہ سانس لینے کیلئے خالی رکھے۔“

کھانے پینے کی مقدار کے حوالے سے سب لوگوں کیلئے کوئی ایک پیمانہ مقرر کرنا درست نہیں ہے۔ اس کا انحصار انسان کی عمر، جسمانی ساخت، قوت ہاضمہ، کام کی نوعیت وغیرہ جیسی کئی چیزوں پر ہوتا ہے۔ تاہم اس حوالے سے بہترین اصول یہ ہے کہ انسان سچی بھوک لگنے پر کھانا شروع کرے اور ابھی بھوک باقی ہو تو کھانا چھوڑ دے۔ جب مدینہ منورہ میں آنے والے حکیم نے حضور ﷺ سے مسلمانوں کے صحت مند رہنے اور بیمار نہ ہونے کا سبب دریافت کیا تھا۔ تو آقا ﷺ نے یہی فرمایا تھا کہ بھوک لگنے سے پہلے کھانا شروع نہیں کرنا ہے اور پھر جب کھانے بیٹھو تو کچھ بھوک کے باقی رہنے پر کھانا چھوڑ دینا ہے۔

(۴) متفرقات

کھانے پینے کے حوالے سے مندرجہ بالا تین اصولوں کے ساتھ ساتھ دیگر متفرق اصولوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ مثلاً بہت زیادہ گرم کھانا دانتوں اور معدہ کیلئے سخت نقصان دہ ہے اور علاوہ ازیں آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق اس میں برکت بھی نہیں ہے۔ اسی طرح بہت زیادہ ٹھنڈا کھانے پینے سے بھی دانتوں کو نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ معدہ کی حرارت غیر یزی (کھانے کو ہضم کرنے والی حرارت) کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ اسی طرح باسی غذاء میں بعض ایسے اجزاء پیدا ہو جاتے ہیں جو جسم کیلئے

نقصان دہ ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے باسی غذاء کے کھانے کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ کسی غذاء کو بار بار بارگرم کیا جائے تو وہ بھی بہت کم افادیت کی حامل رہ جاتی ہے۔ جو غذا پکانے میں جل جائے اس کے بھی قیمتی اجزاء ضائع ہو جاتے ہیں اور غذائیت برائے نام رہ جاتی ہے۔ بہت زیادہ ثقیل اور مرغن غذائیں، تیز مرچ مصالحے، سفید میدہ کی بنی ہوئی اشیاء، سفید چینی، سوڈا واٹر کی بوتلیں، چائے اور کافی وغیرہ میں فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔ ان سے حتیٰ الوسع پرہیز ہی کرنا چاہیے۔

غذا کے موضوع کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے دو باتوں پر ختم کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اس حوالے سے کسی اچھی کتاب کا پڑھ لینا بہت مفید ہو رہے گا۔ اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں مارکیٹ میں موجود ہیں۔ تاہم راقم کے خیال میں پروفیسر ڈاکٹر متین فاطمہ کی لکھی ہوئی کتاب ”غذا اور غذائیت“ جسے اردو سائنس بورڈ نے شائع کیا ہے، بہترین کتاب ہے۔ جس میں غذاء کے حوالے سے بڑی خوبصورت اور قیمتی معلومات آسان فہم انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

۲۔ غذاء کے حوالے سے مستقل احتیاطیں عام طبیعتوں پر گراں گزرتی ہیں۔ دوسری طرف ہر چیز کو کھانے پینے کے حوالے سے اپنے آپ کو کھلی چھٹی دیئے رکھنا اپنے آپ کو تباہ کرنے کے مترادف ہے جو جسمانی، ذہنی، قلبی اور روحانی صلاحیتوں کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔ اس مسئلے کا آسان حل یہ ہے کہ ہفتہ میں ایک دن (یہ دن عموماً ہفتہ وار چھٹی کا ہوگا) کو Easy Day کے طور پر دیتے ہوئے اس میں طبیعت اور ذوق کو سہولت فراہم کر دی جائے، جبکہ بقیہ دنوں میں حتیٰ الوسع صحت کے اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط برتی جائے۔ ہر اس چیز سے ہر ممکن حد تک پرہیز کیا جائے جو نقصان دہ ہو۔ اس طرح آسانی کے ساتھ انسان اچھی صحت اور تندرستی کو برقرار رکھنے کے سفر پر گامزن رہ سکتا ہے۔

(ب) ورزش

اچھی صحت کے لئے جہاں متوازن غذا کا استعمال ضروری ہے وہاں اُسے ہضم کرنے کیلئے ورزش کا اہتمام بھی بہت ضروری ہے۔ ورزش صرف کھانے پینے کو ہی ہضم نہیں کرتی بلکہ جسم کو ہلکا پھلکا، تندرست اور مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب ہم کوئی ورزش کرتے ہیں تو ہمارے اعصاب میں حرکت پیدا ہوتی ہے جسم کے تمام اعضاء ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں جس عضو کی ورزش

کی جاتی ہے اُس پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ تاہم بقیہ تمام اعضاء پر بھی بالواسطہ طور پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ بعض ورزشوں میں پھیپھڑے تیزی سے دھڑکنے لگتے ہیں، خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ جگر اور گردے بھی چست ہو جاتے ہیں۔ ورزش کے نتیجے میں جسم کے پرانے خلیے (Cells) اپنی جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کر خون کی بندی میں شامل ہو کر پسینہ اور دیگر فضلات کے ذریعے جسم سے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں جسم زہریلے مادوں سے پاک ہوتا رہتا ہے۔ اور بیماریوں کے حملوں سے بھی بڑی حد تک محفوظ رہتا ہے۔

ورزش کے بغیر جسم کا کوئی بھی عضو صحیح طور پر تندرست نہیں ہو سکتا۔ ورزش کے بغیر نہ پیٹ اچھی طرح خالی ہوتا ہے اور نہ ہی سچی بھوک لگتی ہے، نہ خون کا دورہ تیز ہوتا ہے، نہ پسینہ کھل کر آتا ہے اور نہ ہی جگر اور گردے اپنا کام تیزی کیساتھ کرتے ہیں۔ انہی چیزوں پر انسان کی صحت اور تندرستی کا دارومدار ہوتا ہے۔ چنانچہ ورزش فطرت کا اہم اصول ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے بچے جن کو ورزش کا کچھ بھی شعور نہیں ہوتا اُن کی ورزش کا انتظام قدرت خود کرتی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ سال چھ ماہ کا بچہ بستر پر پڑے ہوئے اپنی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر بستر پر مار رہا ہوتا ہے۔ ہمیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اُسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے بعض اوقات ہم چاہتے ہیں کہ وہ یہ مشق اب ختم کر دے۔ لیکن بچے کی صحت اور تندرستی کیلئے قدرت اس تھکان کو نہایت ضروری سمجھتی ہے۔

ورزش کا کوئی ایک طریقہ نہیں ہے، کئی طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔ مختلف قسم کے کھیل مثلاً کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، کبڈی، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس، گھوڑ سواری، تیراکی، تیز چلنا یا دوڑنا، وزن اٹھانا وغیرہ ورزش کی ہی مختلف صورتیں ہیں۔ اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ اسلام ورزش کی ہر اُس صورت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں جسم کی صحت، قوت اور تندرستی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہ خلاف شرع نہ ہو۔ نیز اُس میں بہت زیادہ انہماک نہ ہو کہ اُس کو مقصود زندگی بنا لیا جائے۔

ورزش کا بہترین پروگرام

ورزش کا بہترین پروگرام وہ ہو سکتا ہے جسے کسی بھی جگہ آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہو اور جس کے نتیجے میں جسم کو تین طرح کے فوائد حاصل ہوں۔

(۱) برداشت

یہ سانس چڑھانے والی ورزش سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی ورزش جس کے نتیجے میں سانس پھول جاتا ہے، دوران خون تیز ہو جاتا ہے اور دل تیزی کے ساتھ خون کو جسم میں پمپ کرتا ہے۔ مثلاً دوڑ لگانا وغیرہ۔

(۲) لچک

یہ کھینچاؤ والی ورزش سے پیدا ہوتی ہے، ایسی ورزش جس میں جسم کے مختلف اعضاء میں کچھ دیر کیلئے کھینچاؤ اور تباہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اکڑاؤ ختم ہوتا ہے اور اعضاء میں لچک پیدا ہوتی ہے۔

(۳) مضبوطی

ان ورزشوں سے پیدا ہوتی ہے جن میں اعصاب کو زور لگانا پڑتا ہے۔ مثلاً بیٹھکیں لگانا، ڈنڈ بیلنا اور وزن اٹھانا وغیرہ۔

کون سی ورزش کی جائے؟

اپنی عمر، صحت، جسمانی حالت، کام کی نوعیت اور موسم وغیرہ جیسے عوامل (Factors) کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے لئے موزوں ورزش کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کا کام ہی بہت زیادہ سخت ہے تو اسے مزید سخت ورزش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح جس شخص کا کام زیادہ تر بیٹھ کر کرنے والا ہے اسے پٹھوں کی مضبوطی کے حوالے سے زیادہ ورزش کی ضرورت نہیں ہے۔ جسم میں لچک پیدا کرنے والی ورزشوں کے ذریعے سے ہی وہ اپنے جسم کو فٹ رکھ سکتا ہے۔

ورزش کے حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ یوں تو ہر قسم کی ورزشیں اپنے اندر مخصوص فوائد رکھتی ہے تاہم مجموعی اور عمومی طور پر یوگا ورزشیں بہت زیادہ فوائد کی حامل اور ہر کسی کے لئے موزوں ہیں۔ ان ورزشوں میں مشقت کم اور فوائد زیادہ ہیں۔ یہ ورزشیں جسم میں لچک پیدا کرنے کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں اور جسم میں لچک کے ہوتے ہوئے بہت کم بیماریاں جسم پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ کیونکہ لچک کے نتیجے میں جسم مضبوط اور سڈول ہو بن جاتا ہے۔ یہ ورزشیں فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہیں۔ جانوروں کی دنیا کے گہرے مشاہدے کے نتیجے میں ان ورزشوں کو ترتیب دیا گیا ہے اور جانوروں کی

دنیا میں فطری اور جبلی طور پر یہ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ بلی یا کتا جب نیند سے بیدار ہوتے ہیں تو وہ اپنی اگلی اور پچھلی ٹانگوں کو باری باری اکڑا کر ان میں کھنچاؤ پیدا کر کے پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی یوگا ہے۔

ہندو فقراء اور جوگیوں کا کہنا ہے کہ فضاء کے اندر ایک خاص قوت پائی جاتی ہے جسے جوہر حیات کا نام دیا جاتا ہے۔ اس جوہر حیات کے اندر ہی ہر قسم کی طاقت، قوت، حسن و خوبصورتی، نشوونما اور ترقی و ارتقاء کا راز چھپا ہوا ہے جس شخص کے اندر جوہر حیات کا یہ خزانہ جتنا زیادہ ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ قوی، طاقتور، صحت مند، چاک و چوبند نیز ظاہری و باطنی صلاحیتوں سے مالا مال ہوگا۔ اس جوہر حیات کے جسم کے اندر جانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ سانس کی آمد و رفت ہے۔ یوگا کے ماہرین کا کہنا ہے (عقل اور مشاہدہ جس کی تصدیق بھی کرتے ہیں) کہ یوگا ورزشوں کے ذریعے جسم کے اندر زیادہ سے زیادہ جوہر حیات کو کشید کرنے اور اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں صرف جسم ہی مضبوط، توانا، خوبصورت اور سڈول نہیں بن جاتا بلکہ شخصیت کے دوسرے حصوں پر بھی براہ راست بہت خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

یوگا ورزشوں کے اندر بہت سارے آسنز بیان کیے گئے ہیں جن سب کو اپنانا کسی بھی شخص کے لئے نہ ممکن ہے اور نہ ہی ضروری۔ تاہم چار پانچ مخصوص آسنز کو لے کر روزانہ آدھ گھنٹہ باقاعدگی سے کر لیا جائے تو جسم کے اوپر ایسے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ پھر یہ ورزشیں انسان کیلئے ایک صحت مند نشے کی صورت اختیار لیتی ہیں جو انسان کے لئے تفریح طبع کا باعث بننے کے ساتھ طاقت، صحت، تندرستی اور قوت برداشت کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ورزش کیلئے صرف کیا جانے والا یہ آدھا گھنٹہ دن رات کے بقیہ ساڑھے تیس گھنٹوں میں انسان کی کارکردگی کو بہتر بنا کر ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر دس منٹ کیلئے سانس کی کوئی موزوں سی مشق اپنالی جائے تو ”سونے پر سہاگہ“ والا معاملہ بن جاتا ہے۔ جتنا وقت انسان ان چیزوں پر خرچ کرتا ہے اُس سے بہت زیادہ فوائد مختلف شکلوں میں حاصل کر لیتا ہے۔

ورزش کے حوالے سے دو اہم باتیں

ورزش کے حوالے سے آخر کے طور پر جو دو باتیں کہنی ہیں وہ یہ ہیں کہ:

- ۱۔ جو لوگ نئے سرے سے ورزش شروع کرنے لگیں تو انہیں آغاز ہمیشہ تھوڑی مقدار سے کرنا چاہیے۔ پھر آہستہ آہستہ بڑھانا چاہیے۔
- ۲۔ کبھی بھی اتنی زیادہ ورزش نہیں کرنی چاہیے جو طبیعت کے اوپر بہت زیادہ بوجھ کا باعث بنے۔ جسم کی قوت برداشت سے زیادہ ورزش فائدے کی بجائے الٹا نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔

(ج) نیند

نیند بھی اللہ رب العزت کی ایک خاص نعمت ہے جسے انسان کے لئے آرام اور سکون کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (۱۶)

”ہم نے نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا ہے۔“

آرام اور سکون کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ نیند کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایسی لذت اور راحت رکھ دی ہے کہ جس کا کوئی بھی بدل پوری کائنات میں نہیں ہے۔ بقول حضرت واصف علی واصف:

”نیند زندگی کے دسترخوان کی سب سے اہم، سب سے لذیذ اور سب سے میٹھی ڈش ہے۔“ (۱۷)

نیند جسم کے انتہائی بنیادی لوازمات میں سے ہے جس کے بغیر انسان صحت مند اور تندرست نہیں رہ سکتا۔ دن بھر کی محنت اور مشقت کے دوران ہمارا جسم اور دماغ تھکاوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نیند اس تھکاوٹ کو ختم کرنے اور شکست و ریخت کی مرمت کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ورزش اور دیگر حرکات و سکنات کے دوران جو پرانے اور بوسیدہ خلیے (Cells) ٹوٹ پھوٹ کر جسم سے خارج ہوتے ہیں۔ نیند کے دوران نئے خلیے بن کر ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اور یوں ہمارے جسم کی طاقت اور توانائی برقرار رہتی ہے۔ لہذا اگر پوری نیند نہ لی جائے تو انسانی جسم بہت جلد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر کے بقول ”اگر کسی کو پاگل بنانا ہو تو آٹھ دس دن رات اُسے سونے نہ دو وہ یقیناً پاگل ہو جائے گا۔“ ہمارے ہاں پولیس کے طریقہ ہائے تفتیش میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بڑے عادی مجرموں کو اقرار جرم کیلئے مصنوعی طریقوں کے ذریعے مسلسل جگایا جاتا ہے اور انہیں نیند سے محروم رکھا جاتا ہے۔ بالآخر ان کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے اور وہ ان باتوں کو بتانے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں جن کو

آشکار کرنے پر پہلے آمادہ نہیں تھے۔

سوال یہ ہے کہ ہے کہ ایک عام آدمی کو دن رات میں کتنی نیند لیننی چاہیے جس سے جسم صحت مند رہ سکے؟ جواب یہ ہے کہ تمام لوگوں کے لئے نیند کی کسی ایک ہی مقدار کا مقرر کرنا مناسب نہیں ہے۔ مختلف لوگوں کے لئے ان کی عمر، صحت، جسمانی حالت اور کام کی نوعیت وغیرہ بھینسی چیزوں کی بناء پر نیند کی مقدار مختلف ہو سکتی ہے۔ تاہم عمومی طور پر یہ مقدار چھ تا آٹھ گھنٹوں کے درمیان کہیں ہونی چاہیے۔ یعنی ایک جسم کو صحت مند رہنے کیلئے نیند کی جو کم سے کم مقدار درکار ہے وہ چھ گھنٹے ہے اور زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے ہے۔ چھ گھنٹے سے کم سونے کی صورت میں دن کے ہنگاموں کے دوران خرچ ہونے والی توانائی کا ازالہ نہیں ہو سکے گا، اور جسم تھکا ہوا اور بوجھل محسوس ہوگا۔ اس کے برعکس میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ ہونے کی صورت میں بھی جسم سستی اور کابلی کا شکار ہو جائے گا۔ جسم کو تروتازہ، ہشاش بشاش اور چاق و چوبند رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ نیند نہ ضرورت سے کم ہو اور نہ زیادہ ہو بلکہ حد اعتدال کے اندر رہتے ہوئے جسم کی ضرورت کے مطابق ہو۔ بیماری وغیرہ کی استثنائی حالتوں پر اس کیلئے کا اطلاق نہیں ہوگا۔

نیند کے حوالے سے یاد رکھنے والی ایک انتہائی اہم بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے رات کو آرام کرنے اور دن کو کام کرنے کا ذریعہ بنایا ہے یہ فطرت کا نظام ہے جس کی موافقت میں ہی ہمارے لئے خیر اور بھلائی ہے۔ جو لوگ طویل عرصہ تک اس فطری طریقہ کی مخالفت کرتے ہیں اور رات کو جاگنا اور دن کو سونا اپنی عادت بنا لیتے ہیں۔ وہ حقیقی معنوں میں صحت مند نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رات کی نیند میں جسم کیلئے جو فوائد و ثمرات رکھ دیئے ہیں وہ دن کی نیند میں کسی طرح بھی میسر نہیں آ سکتے۔ لہذا سوائے کسی خاص مجبوری کے حتیٰ الوسع نیند کی زیادہ سے زیادہ مقدار رات میں ہی پوری کرنی چاہیے۔ اس مقصد کیلئے رات کو جلد سونا اور صبح کو جلد اٹھنا بہت اہمیت کا حامل ہے۔ انگریزی زبان کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ:

Early to bed and early to rise makes a man healthy,

wealthy and wise

”رات کو جلد سونا اور صبح کو جلد اٹھنا آدمی کو صحت مند، دولت مند اور عقلمند بناتا ہے۔“

تاہم دو پہر یا سہ پہر کے وقت تھوڑی دیر کیلئے (حسب ضرورت) سونا جسے شریعت کی اصطلاح

میں قیلولہ کہا جاتا ہے اور جو حضور ﷺ کی سنت مبارکہ بھی ہے جسمانی و ذہنی صلاحیتوں اور توانائیوں کی بحالی کے لیے خاصی کارآمد ہے۔ حضور ﷺ نے سحر خیزی کے حوالے سے بھی قیلولہ سے مدد لینے کی تاکید فرمائی ہے۔ ذیل کارٹیکگی نے چھ گھنٹے رات کو سونے اور ایک گھنٹہ دن کو سو لینے رات کی آٹھ گھنٹے کی مسلسل نیند کے برابر فائدہ مند قرار دیا ہے۔ لہذا وقت ملے تو دوپہر کو تھوڑی دیر کیلئے سو جانا چاہیے اور بالخصوص گرمیوں کے موسم میں تو قیلولہ سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔

(د) کام اور آرام میں توازن

اللہ رب العزت نے دنیا کو دارالحسن (معت و مشقت کی جگہ) بنایا ہے۔ دنیوی زندگی کا نظام ہی ایسا ہے کہ انسان جن چیزوں کو پانا چاہتا ہے ان کے لئے اُسے جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور اسی کے بقدر اُس کو نتیجہ ملتا ہے۔

ایک طرف تو مطلوبہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا ضروری ہے اور دوسری طرف یہ بھی نظام فطرت ہی کا حصہ ہے کہ زندگی کی ساری رعنائیاں اور زیبائیاں حرکت و عمل سے وابستہ ہیں۔ اور جمود و تعطل زندگی کے سارے حسن کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے، جبکہ جمود موت ہے۔ کوئی بھی چیز جب تک رواں دواں رہتی ہے تب تک ٹھیک رہتی ہے۔ جو نہیں جمود اور تعطل کا شکار ہوتی ہے تو اس میں بگاڑ آ جاتا ہے مثلاً پانی جب تک حرکت میں رہتا ہے اُس کا رنگ، بو اور ذائقہ بھی ٹھیک رہتے ہیں۔ مگر ٹھہرے ہوئے پانی میں یہ تینوں چیزیں بگڑ جاتی ہیں۔ اسی طرح کوئی بھی مشینری جو مناسب دفتوں سے کام کرتی رہے تو وہ ٹھیک رہتی ہے لیکن اُسے عرصہ دراز تک بغیر استعمال کے چھوڑ دیا جائے تو اُس میں زنگ لگ جاتا ہے۔ یہی حال انسان کی جسمانی مشینری کا بھی ہے کہ انسان کی بہترین صلاحیتیں حرکت اور عمل کے ذریعے سے ہی درست حالت میں رہتی اور ترقی و نشوونما پاتی ہیں۔ بے کاری، کاہلی، جمود اور تعطل انسان کی بہترین صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ لیتے ہیں۔ اور انسان زندگی کے حقیقی کمال کو پانے سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس کی مثال دیکھنی ہو تو اُن بچوں کو دیکھیں جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں اور جنہیں ساری زندگی کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ یا پھر وہ لوگ جنہیں کسی طرح سے اتنی زیادہ دولت میسر آ جاتی ہے جو انہیں معاشی فکروں سے بالکل ہی بے نیاز کر کے عضو معطل بنا دیتی ہے۔ زمانے والے ایسے لوگوں پر رشک کرتے ہیں مگر

حقیقت میں یہ لوگ قابل ترس ہوتے ہیں کیونکہ انتہائی سطحی اور کھوکھلی قسم کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر کئی قسم کی اخلاقی قباحتوں کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ لہذا زندگی کے کمال کا راز جہد مسلسل میں پنہاں ہے۔

مندرجہ بالا تصویر کا ایک رخ ہے۔ اسی تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ مادی مفادات کو سمیٹنے، دوسروں سے آگے بڑھنے یا کسی اور مصلحت یا مجبوری کے تحت اپنی صحت و قوت کا خیال کئے بغیر کام کرتا چلا جاتا ہے اور جسم کو مناسب آرام فراہم نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جسمانی اعضاء دن بدن کمزور ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور انسان وقت سے پہلے ہی بوڑھا اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے اکثر و بیشتر جسمانی عوارض کے ساتھ ساتھ کئی ذہنی اور نفسیاتی عوارض بھی لاحق ہو جاتے ہیں۔ مثلاً آکتابٹ، ٹینشن، ڈپریشن وغیرہ۔ یہ چیزیں انسان کو زندگی کی حقیقی لذتوں اور راحتوں سے محروم کر دیتی ہیں اور شروع میں زیادہ کام کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعد میں انسان کسی کام کا ہی نہیں رہتا۔

آرام کی اعلیٰ ترین صورت کا نام نیند ہے جو سطور بالا میں بیان ہو چکی ہے۔ تاہم نیند کے علاوہ بھی دن بھر کی سرگرمیوں میں انسان کو مناسب وقفوں کے ساتھ جسم کو آرام پہنچانا چاہیے۔ اور کبھی کبھی کام میں اتنا زیادہ منہمک نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے کاموں کی تکمیل کیلئے جسمانی صحت کو داؤ پر لگا رہا ہو۔ جسمانی صحت کا بدل اس کائنات کی کوئی شے نہیں ہے۔ لہذا جو شخص جسمانی صحت کی قیمت پر کوئی کامیابی یا ترقی حاصل کرتا ہے وہ خسارے کا سودا کرتا ہے۔ دینی مفادات اور کامیابیاں تو ایک طرف اسلام نے ایسی عبادات کو پسند نہیں کیا جن کے نتیجے میں صحت میں بگاڑ آ جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسان کو نہ تو اتنا زیادہ کام کرنا چاہیے جو جسمانی مشینری کو نقصان پہنچانے کا باعث بن جائے اور نہ ہی اتنا زیادہ آرام کرنا چاہیے جو انسان کو سستی، کاہلی، جمود اور تعطل کا شکار بنا کر رکھ دے۔ بلکہ دنیا کے ہر معاملے کی طرح یہاں بھی اعتدال اور توازن کی روش ہی بہترین پالیسی ہے۔

(ii) ذہنی پہلو کی تجدید

انسانی دماغ اللہ رب العزت کی شان تخلیق کا ایک انمول شاہکار ہے جس کا وزن اور سائز تو بہت کم ہے مگر اس کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ آج کا دور کمپیوٹر کا دور ہے ہر گزرتے دن کے ساتھ وسیع سے وسیع ریش کے کمپیوٹر معرض وجود میں آرہے ہیں۔ مگر سائنس اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود ابھی تک کوئی

ایسا کمپیوٹر ایجاد نہیں کر سکی جو خالق کائنات کے بنائے ہوئے کمپیوٹر (انسانی ذہن) کا مقابلہ کر سکے۔

انسانی دماغ میں کھریوں کی تعداد میں خلیے (Cells) پائے جاتے ہیں جو بے حد حساب معلومات کو اپنے اندر جمع کر سکتے ہیں۔ ایک طرف تو انسانی ذہن کی وسعتوں کی کوئی حد نہیں ہے اور دوسری طرف معلومات کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں گود سے لے کر گور تک یعنی ساری زندگی ہی حصول علم میں مشغول رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا. (۱۸)

”اور آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھادیئے“

فرما کر حصول علم کے لامحدود امکانات کی طرف اشارہ فرمادیا۔ جس طرح جسم کی بقاء اور ترقی کا دارومدار غذا پر ہے اسی طرح ذہن کی ترقی اور ارتقاء کا دارومدار علم پر ہے۔ ذہنی پہلو کی تجدید کا مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی بھر مسلسل حصول علم کے ذریعے اپنے ذہن کو غذا فراہم کرتا رہے اور اس طرح اپنی شخصیت کو بہتر بناتا رہے۔

اسلام کے اندر علم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر برتری کی وجہ عبادت کو نہیں، بلکہ علم کو قرار دیا اور علم کی عظمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا:

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ. (۱۹)

”اللہ تعالیٰ تم میں سے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا، درجات بلند فرمائے گا۔“

حضرت ﷺ نے فرمایا:

اطلبوا العلم ولو بالصين. (۲۰)

”علم حاصل کرو اگرچہ تمہیں چین جانا پڑے۔“

مطلب یہ ہے کہ علم کے راستے میں جو بھی مشقت اٹھانی پڑے اور جو بھی قربانی دینی پڑے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ علم اتنی اعلیٰ درجے کی چیز ہے کہ اس کے حصول کیلئے ہر قیمت کو بخوشی ادا کر دینا چاہیے۔

علم کو حاصل کرنے کی اہم ترین شرط ہے اس کیلئے سچی لگن کا ہونا۔ اس حوالے سے ایک واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک نوجوان نے سقراط کے پاس آ کر اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اُس علم و حکمت کو حاصل کرنا چاہتا ہے جو سقراط کو حاصل ہے سقراط اُس نوجوان کو دریا کے کنارے لے گیا اور اُسے دریا کی طرف غور سے دیکھنے کو کہا نیز اُسے کہا کہ پانی کو قریب سے دیکھ کر بتاؤ کہ تمہیں کیا نظر آتا ہے۔ وہ نوجوان پانی کو دیکھنے کیلئے جھکا تو سقراط نے اُس کا سر پکڑ کر پانی میں ڈبو دیا۔ نوجوان نے چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا، جب اُس کی حالت غیر ہونے لگی تو اُسے نکال لیا۔ حواس بحال ہونے پر سقراط نے اُسے پوچھا کہ ”جب تمہیں پانی میں ڈبو یا تھا تو تمہاری بہترین خواہش کیا تھی؟“ اُس نے جواب دیا کہ ”سانس لینا“۔ سقراط نے کہا کہ ”تمہیں علم و حکمت اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اُسے حاصل کرنے کی اتنی ہی شدید خواہش نہ ہو جتنی سانس لینے کی خواہش تھی“۔ سقراط سمجھانا یہی چاہتا تھا کہ علم و حکمت اور دانش بیٹھے بٹھائے آسانی سے حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور قیمت کے اندر پہلی چیز اس کیلئے ایک سچی طلب اور آرزو کا ہونا ہے۔ اور پھر اُس کے مطابق محنت کرنا ہے۔

موجودہ دور میں باقاعدہ تعلیم کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس ضمن میں سکول و کالج و یونیورسٹی وغیرہ کی تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اپنے رجحان اور مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی پسند کے شعبے میں حتیٰ الوسع علم کے آخری درجے (Ph.D وغیرہ) تک جانے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ علم صرف وہی نہیں ہے جو سکول و کالج سے حاصل ہوتا ہے بلکہ علم کے اور بھی بے شمار ذرائع ہیں اور یہ زندگی بھر کا عمل ہے سکول و کالج سے فراغت کے بعد رکنا نہیں چاہیے۔ جو کچھ سکول و کالج سے حاصل ہو سکتا ہے وہ بھی حاصل کرنا چاہیے اور جو کچھ اس کے ساتھ ساتھ بیرونی ذرائع سے مل سکتا ہو اُسے بھی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ نیز فراغت کے بعد تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں اپنے علم کی تجدید کرتے رہنا چاہیے۔

علم کے حوالے سے اس بات کو جاننا بھی اہم ہے کہ اسلام نے علم کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک ہے علم نافع اور دوسری ہے علم غیر نافع۔

علم نافع وہ علم ہے جس کے ذریعے سے انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت تک پہنچ جائے، زندگی کے

اسرار و رموز سے آگاہ ہو جائے اور اُس علم کے مثبت اثرات خود اس کی ذات اور کسی نہ کسی حد تک ماحول پر بھی دکھائی دیں۔ اور جہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو وہ علم غیر نافع ہے۔ جس سے حضور علیہ السلام نے پناہ مانگی ہے۔ گویا سلام کے نزدیک علم وہی ہے جو انسان کو خدا تک پہنچا دے، زندگی کی راہوں کو روشن کر دے اور عمل کی جہتوں کو درست کر دے۔ بصورت دیگر وہ محض معلومات کا انبار ہے جو زندگی کو بوجھل بنا دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اسلام جہاں بھی علم کی بات کرتا ہے اُس سے مراد علم نافع ہی ہوتا ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ وہ قرآن و حدیث کا علم ہے یا سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کا۔ لہذا انسان کو ذہنی پہلو کی تجدید کرتے ہوئے اپنے علم میں مسلسل اضافہ کرتے رہنا چاہیے۔

اضافہ علم کے ذرائع

علم میں اضافہ کے لیے بہت سارے ذرائع ہیں۔ جن میں سے چند نمایاں درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ مطالعہ کتب
- ۲۔ لکھنا
- ۳۔ اخبارات و جرائد پڑھنا
- ۴۔ خبریں سننا
- ۵۔ ٹی وی پر معلوماتی پروگرام دیکھنا، مثلاً نیشنل جیوگرافک وغیرہ
- ۶۔ انٹرنیٹ کا محتاط اور با مقصد استعمال
- ۷۔ اہل علم کی صحبت میں بیٹھنا
- ۸۔ غور و فکر اور تفکر و تدبر کی عادت کو اپنانا
- ۹۔ سائنسی انداز فکر اختیار کرنا
- ۱۰۔ معلوماتی دورہ جات کرنا

مندرجہ بالا فہرست کوئی حتمی نہیں ہے۔ اس میں اور بھی کئی چیزوں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اپنے حالات کے مطابق حکمت اور دانشمندی سے کام لیتے ہوئے جو طریقے بھی مناسب لگیں ان کے ذریعے

اپنی شخصیت کے ذہنی پہلو کی تجدید کرتے رہنا چاہیے۔

(iii) قلبی پہلو کی تجدید

انسان کے سینے میں بائیں طرف گوشت کا ایک ٹوکھڑا ہے جس کا کام سارے جسم میں خون کو پمپ کرنا ہے۔ یہ اٹنا اہم عضو ہے کہ اگر چند منٹ کے لئے کام کرنا چھوڑ دے تو انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں دل کی بیماریاں عام ہیں اور بہت ساری اموات کی بنیادی وجہ دل کا دورہ (Heart Attack) ہوتا ہے۔ تاہم یہ تو اس دل کا طبی پہلو ہے اور اس حوالے سے اس کی حفاظت طبی پہلو کی تجدید کے ضمن میں ہی آ جاتی ہے مگر اسی دل کا ایک دوسرا اہم ترین کردار (Function) یہ بھی ہے کہ یہ ہماری جذباتی زندگی کا مرکز و محور ہے۔ ہمارے جذبات جو زندگی کی گاڑی کیلئے ایندھن کا کام دیتے ہیں، وہ یہیں پر پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر قسم کے اچھے اور بُرے جذبات مثلاً محبت، نفرت، غصہ، عداوت، انتقام، ایثار و قربانی وغیرہ یہیں دل میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر دماغ میں پیدا ہونے والے خیالات پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لئے حضور ﷺ نے شخصیت کی اصلاح کا نکتہ آغاز دل کو قرار دیا ہے۔ ہمارے جذبات کا بہت گہرا تعلق ہماری سماجی اور معاشرتی زندگی کے ساتھ ہے۔ جس طرح کے ہمارے دل میں جذبات ہوتے ہیں اسی کے مطابق ہم دوسروں کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں۔ اور کامیاب زندگی کیلئے ہماری سماجی اور معاشرتی زندگی کا خوشگوار ہونا بہت ضروری ہے بالفاظ دیگر دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارے باہمی تعلقات کا خوشگوار ہونا کامیاب زندگی کے لوازمات میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

التودد الى الناس نصف العقل (۲۱)

”لوگوں کے ساتھ پیار و محبت سے رہنا آدمی عقل مند ہی ہے“

لہذا کامیاب زندگی گزارنے کیلئے جہاں صحت مند جسم اور ترقی یافتہ ذہن کا ہونا ضروری ہے وہاں تربیت یافتہ دل کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ جب تک انسان اپنے جذبات پر قابو نہیں پائے گا اور ان کی تہذیب و اصلاح نہیں کرے گا تب تک وہ علمی طور پر کتنے ہی بلند درجے پر کیوں نہ پہنچ جائے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کو برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ جذبات پر قابو نہ ہونے کی صورت میں ذرا ذرا سی بات پر اُس کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اُٹھے گی جو جھگڑوں اور بحث و تکرار کا باعث بنے گی

اور یوں زندگی کا مزا کرنا ہوتا چلا جائے گا۔ چنانچہ کامیاب اور خوشگوار زندگی کیلئے اس پہلو پر توجہ دینا بھی ضروری ہے اگر یہ پہلو نظر انداز ہو جائے تو پھر جسمانی اور ذہنی سطح پر انسان جتنی مرضی کامیابیاں حاصل کرتا چلا جائے وہ زندگی سے صحیح معنوں میں لطف اندوز نہیں ہو سکے گا۔

جس طرح کھیت کے اندر مطلوبہ فصل کے ساتھ ساتھ کچھ خود رو قسم کی جڑی بوٹیاں خود بخود اُگ آتی ہیں جو فصل کیلئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ کامیابی کا راز اس میں ہوتا ہے کہ اُن جڑی بوٹیوں کو ساتھ ساتھ تلف کر دیا جائے۔ یہی حال دل کی سر زمین کا بھی ہے۔ اس میں پسندیدہ اور اچھے اوصاف کے ساتھ ساتھ کچھ ناپسندیدہ اور بُرے اوصاف مثلاً حسد، بغض، کینہ، نفرت، انتقام وغیرہ کی جڑی بوٹیاں خود بخود ہی اُگ آتی ہیں اور پروان چڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اگر دل کی سر زمین سے ان گندے پودوں کو تلف نہ کیا جائے تو یہ ہماری شخصیت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ ہمارے تعلقات کو بھی بہت متاثر کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں زندگی چلتا پھرتا جہنم بن جاتی ہے۔ ہمارے لئے بہت ضروری ہے کہ غور فکر اور بعض دیگر مناسب تدابیر کے ذریعے ان ناپسندیدہ اوصاف سے دلوں کو پاک کریں۔

خوشگوار تعلقات کے چار اہم اصول

دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے لئے مندرجہ ذیل چار اہم باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری

(۱) محبت

کائنات کا سارا کارخانہ جس جذبہ پر چل رہا ہے وہ محبت ہے۔ ہمارے دین اور ایمان کے اندر بھی محبت کو بنیادی اور اہم حیثیت حاصل ہے۔ اللہ رب العزت کے کئی صفاتی نام ہیں۔ مگر جب سورہ فاتحہ کے آغاز میں اُس نے اپنا تعارف کرایا تو رحمن اور رحیم (بہت زیادہ رحم کرنے والا اور مہربان) کے دو ناموں سے کرایا۔ یہی جذبہ وہ ہمارے اندر بھی چھلکتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ لہذا خوشگوار تعلقات کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے تمام متعلقین کو اُن کی خامیوں اور کمیوں سمیت قبول کرتے ہوئے اُن کیساتھ غیر مشروط محبت کریں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُن کی اصلاح کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اُن کی خامیوں کی بناء پر اُن سے نفرت نہ کریں۔ محبت کے دائرے میں

رہتے ہوئے جہاں تک ممکن ہو اصلاح کریں۔

(۲) عزت و احترام

محبت سے ملنی ہوئی دوسری چیز ہے عزت و احترام۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۲۲)

”ہم نے آدم علیہ السلام کی اولاد کو فضیلت دی۔“

یہ فضیلت کا تاج محض اولادِ آدم ہونے کی بناء پر پہنایا گیا ہے یہاں اور کوئی اضافی شرط نہیں ہے۔ لہذا ہمارے لئے بہت ضروری ہے کہ ہم دوسروں کا سماجی مرتبہ یا حیثیت یا اس قسم کی کوئی بھی چیز دیکھے بغیر محض انسان ہونے کے ناطے دوسروں کی عزت و احترام کریں۔ معاشرے کے اندر انسانوں کی درجہ بندی اور اونچ نیچ کے جو پیمانے بنائے جاتے ہیں، اسلام ان کو نہیں مانتا ہے۔ ہاں ایک پیمانہ ہے جس کا لحاظ اسلام بھی کرتا ہے اور وہ ہے تقویٰ۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۲۳)

”بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔“

اس کے علاوہ اسلام کا مطالبہ یہی ہے کہ ہر چھوٹے بڑے سے عزت و احترام والا سلوک کیا جائے۔

چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا:

اکرموا اولادکم و احسنوا ادبہم (۲۴)

”اپنی اولادوں کا اکرام کرو اور انہیں اچھے آداب سکھاؤ۔“

بالعموم اولاد انسان سے ہر لحاظ سے چھوٹی ہوتی ہے مگر اس کا بھی ادب و احترام کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ یہاں ایک بات جو سمجھنے والی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی انسان کے اندر کردار کی کوئی خرابی یا بُرائی ہے تو اُسے اُس شخص کی ذات سے الگ کر کے دیکھا جائے اور اُس کا احترام محض انسان ہونے کی بناء پر کیا جائے۔ جس طرح ایک ڈاکٹر کسی سنجیدہ مرض میں مبتلا مریض کی بیماری سے تو نفرت کرتا ہے مگر بیمار

سے نفرت کرنے کی بجائے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ اسی طرح ہمیں کسی اخلاقی برائی یا کمی میں مبتلا شخص کے ساتھ نفرت کی بجائے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اُسے اُس سے نجات دلانے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے دل میں اُس کے لئے نفرت اور حقارت کی بجائے محبت اور عزت و احترام کے جذبات ہوں گے۔

(۳) بے لوث خدمت

خوشگوار تعلقات کے لئے تیسری ضروری چیز ہے ہمارے اندر دوسروں کی بے لوث خدمت کا جذبہ موجود ہونا۔ اگر پہلی دو چیزیں پائی جا رہی ہوں تو تیسری پر عمل پیرا ہونا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ اللہ رب العزت نے ہمارے سینے میں جو دھڑکتا اور پھڑکتا ہوا دل رکھا ہوا ہے اسے جذبات کی بجلیاں اسی لئے دی گئی تھیں کہ یہ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کر سکے اور اُس کے ازالے کیلئے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ چنانچہ ہمارے دین کے اندر دوسروں کی ہمدردی، خیر خواہی اور نفع رسانی کو اعلیٰ درجے کی عبادت قرار دیا گیا ہے اور پھر اس کام کو ہر قسم کے تعصبات اور حد بندیوں سے بالاتر رکھتے ہوئے پوری انسانیت ہی نہیں بلکہ ہر ذی روح تک پھیلا دیا گیا ہے۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ دوسروں کی مدد کرتے وقت یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ کس مسلک، عقیدے، قوم، ذات، برادری یا ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوائے جنگ و غیرہ کی حالت کے اپنے دشمنوں تک کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے حتی الوسع اُن کو نفع پہنچانا چاہیے۔ نیز دوسروں کی خدمت اُن سے کسی بھی جوابی سلوک، صلے، بدلے یا ستائش کی نیت سے نہیں بلکہ صرف اور صرف اللہ کی رضا اور آخرت میں ثواب کے حصول کی نیت سے ہونی چاہیے۔

(۴) عفو و درگزر

انسان خطا کا پتلا ہے اور قصداً یا سہواً غلطی اُس سے ہو ہی جاتی ہے۔ اگر ہم اپنے متعلقین کی ذرا ذرا سی غلطیوں پر گرفت کرنے لگیں اور ان پر رد عمل ظاہر کرنے لگیں تو زندگی کانٹوں کا بچھونا بن کر رہ جائے گی۔ اس لئے اسلام نے معاشرتی زندگی کو خوشگوار بنانے کیلئے عفو و درگزر کا اصول دیا ہے اور اس پر آخرت کا بہت بڑا اجر و ثواب متعین فرما کر اُسے اپنانے کے لئے ایک زبردست محرک بھی دے دیا ہے۔ لہذا خوشگوار تعلقات کو برقرار رکھنے کیلئے ہمیں حتی الوسع دوسروں کی غلطیوں، لغزشوں، کوتاہیوں اور خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اُن کی طرف سے اپنے دل کو صاف رکھنا ہے۔ تاکہ نفرت، کینے اور انتقام کا زہر

ہماری جذباتی زندگی کو تلخ یادوں کا گہوارہ نہ بنا دے۔

(iv) روحانی پہلو کی تجدید

اللہ رب العزت نے اس کائنات کا نظام اس طرح کا بنایا ہے کہ یہاں ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر دکھائی دیتا ہے اور باطن دکھائی نہیں دیتا ہے۔ مگر کسی چیز کا اصلی جوہر اُس کے باطن میں نہ دکھائی دینے والی حقیقت میں ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ مثلاً کسی بھی پھل کا ایک ظاہری ڈھانچہ اور شکل و صورت ہوتی ہے جو دکھائی دے رہی ہوتی ہے مگر دوسری طرف اُس کے اندر ایک مخصوص ذائقہ ہوتا ہے جو دکھائی نہیں دے رہا ہوتا۔ دنیا کا کوئی بھی سائنس دان کسی پھل کے جتنے بھی مرضی ٹکڑے کر لے اور انتہائی حساس خوردبین سے مشاہدہ کر لے وہ اُس ذائقے کو دیکھ نہیں سکتا۔ حالانکہ ذائقہ ہی پھل کی اصل حقیقت اور مقصود ہے۔ ذائقے کی عدم موجودگی میں اُس پھل کی کوئی بھی قدر و قیمت باقی نہیں رہ جاتی۔ یہی حال انسان کا ہے اس کا ایک ظاہری ڈھانچہ ہے جو آگ، ہوا، پانی اور مٹی سے مل کر بنا ہے اور جسم کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ اور ایک اس کے اندر روح ہے جو دکھائی نہیں دیتی۔ حالانکہ یہی روح انسان کی اصل حقیقت ہے اور جسم کے سارے کے سارے کمالات اسی روح کی بدولت ہیں جو نبی روح جسم سے نکل جاتی ہے اُس کے سارے کمالات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی روح کی وجہ سے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کروایا گیا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَإِذَا سُوِّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿۲۵﴾

”پس جب میں اُسے بنا لوں گا اور اُس کے اندر اپنی روح پھونک دوں گا تو اُسے سجدہ کرنا“

یہاں اللہ رب العزت نے فقط روح کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ اپنی روح کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر جو روح ہے وہ ساری کائنات کی تمام ذی روح مخلوقات سے منفرد ہے۔ اُس کا اللہ کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے اسی کی بناء پر انسان اشرف المخلوقات ہے۔

یہ روح عالم ارواح سے چلی ہوئی ہے۔ اس کے سفر کے مختلف مراحل ہیں جن میں سے ایک مرحلہ یہ زمینی زندگی کا ہے جس میں یہ اس جسم کا پیرہن پہنے ہوئے ہے۔ موت نے جب آنا ہے تو روح نے اس جسم کے لباس کو یہیں چھوڑ کر آگے چلے جانا ہے۔ انسان کی ساری قدر و قیمت اسی روح کی وجہ سے ہے جو نبی روح جسم سے نکل جاتی ہے تو پھر اُسے انسان کہنے کی بجائے ”مردہ“ یا ”میت“ کہا

جاتا ہے۔ گویا روح کے نکل جانے سے اس کا عنوان ہی بدل جاتا ہے۔

جسم اس مادی دنیا کا بنا ہوا ہے لہذا اُس کی غذائیں بھی مادی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں لیکن روح عالم امر کی چیز ہے اس لئے اُسے ان غذاؤں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ روح کی غذاؤں کا تعلق اللہ کی محبت، اُس کی یاد، اُس کے قرب، اُس کی اطاعت وغیرہ جیسی چیزوں سے ہے۔ جسم اور جسم کے تقاضے دکھائی دیتے ہیں اور محسوس ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان ان کی تکمیل کے لئے فوراً متحرک ہو جاتا ہے۔ لیکن روح خود بھی مخفی ہے اور اُس بنا پر اُس کے تقاضے بھی مخفی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان بالعموم روح کے تقاضوں کو فراموش کیے رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان کا جسم موٹا ہوتا چلا جاتا ہے مگر روح سکڑتی چلی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آخرت تو جو برباد ہونا ہوتی ہے وہ ہوتی ہی ہے دنیوی زندگی بھی تلخیوں، محرومیوں اور ادا سیوں کا مرقع بنتی چلی جاتی ہے۔

انسان اپنی شخصیت کے دیگر گوشوں پر جتنی بھی توجہ دے لے، جب تک روح کو نظر انداز کرے گا اُس کی زندگی میں ایک خلا باقی رہے گا۔ روح کی دیرانیوں کو دور کیے بغیر زندگی کے دامن کو حقیقی خوشیوں اور مسرتوں سے نہیں بھرا جاسکتا۔ لہذا ہمارے لئے بہت ضروری ہے کہ ہم اپنی شخصیت کے اس اہم ترین حصے کی ضروریات کو بھی محسوس کریں اور انہیں پورا کرتے ہوئے اسکی بھی تجدید ساتھ ساتھ کرتے رہیں۔ اس مقصد کے لئے اسلام نے ایک مکمل اور جامع نظام دیا ہے جس میں ایمانیات بھی ہیں، عبادات بھی ہیں، معاملات بھی ہیں، اخلاقیات بھی ہیں۔ نیکی کا جو کام بھی ہم اللہ کا حکم سمجھ کر بجالاتے ہیں وہ بذریعہ جسم ہی سزا انجام پاتا ہے مگر اُس کا براہ راست خوشگوار اثر روح پر پڑتا ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ کام جس سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے اُسے گناہ کہتے ہیں۔ ایسا کوئی بھی کام کرنے سے روح پر برا اثر پڑتا ہے۔ پھر اگر توبہ کر لی جائے تو روح اُس اثر سے آزاد ہو جاتی ہے ورنہ اُسی حالت میں رہتی ہے۔ اسی طرح اچھے برے کاموں کے اثرات روح پر پڑتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ موت آجاتی ہے اور موت کے وقت روح جس حالت میں یہاں سے جاتی ہے اُسی کے مطابق قبر اور حشر میں اُس کے ساتھ اچھا یا بُرا سلوک ہونا ہوتا ہے۔

روح کا نمائندہ ضمیر کی صورت میں ہمارے اندر موجود ہوتا ہے۔ جب ہم برائی کرنے لگتے ہیں تو ضمیر احتجاج کرتا ہے۔ اگر ہم اکثر و بیشتر اُس کی بات مان کر رُک جائیں تو ضمیر کی آواز توانا ہوتی چلی

جاتی ہے۔ اور اُس کے لئے آئندہ ہمیں گناہوں سے روکنا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اکثر و بیشتر ضمیر کی آواز کو نظر انداز کرتا ہے تو رفتہ رفتہ یہ آواز مدہم ہوتی چلی جاتی ہے اور بالآخر تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر اُس وقت اُس کی نظروں میں نیکی اور برائی کے درمیان تمیز تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ صورت حال کسی بھی شخص کیلئے دنیا اور آخرت دونوں جگہوں پر ذلت و رسوائی اور تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔ لہذا اگر ہم دنیا اور آخرت دونوں کی سعادتیں اور بھلائیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھرنا ہوگا۔ اپنے آپ کو ہر اُس کام سے بچانا ہوگا جو روح کو نقصان پہنچانے والا ہے اور اُن کاموں کو کثرت سے بجالانا ہوگا جو روح کی بالیدگی کا باعث بنتے ہیں۔

روح اگر زندہ اور تروتازہ ہوگئی، گناہوں کے میل کچیل سے پاک صاف ہوگئی تو دنیا سے آخرت تک کے سفر کے سارے مراحل آسان ہوتے چلے جائیں گے۔ روح کا اثر اس دنیا میں ہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی جسم کو گلنے سڑنے سے محفوظ رکھے گا۔ اور انسان کو مرنے کے بعد بھی رہنے نہیں دے گا۔ یہی ایک بندہ نموسن کی زندگی کا منتہائے کمال ہے کہ وہ زندگی میں اپنی شخصیت کو اس حد تک کمال دے اور سنوار چکا ہو کہ جب اُس کا آخری وقت آئے تو اُس کے خالق اور مالک کی طرف سے اُسے یہ آواز سنائی دے:

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۖ فَادْخُلِي فِي جَنَّاتٍ ۖ
عَبْدِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۖ (۲۶)

”اے اطمینان والی جان! لوٹ آ اپنے رب کی طرف، اس حال میں کہ تو اُس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پس میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا“

☆☆☆

عملی مشورہ جات

۱۔ نسخہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو اُس کا فائدہ صرف اُسی وقت ہوتا ہے جب اُس پر عمل کیا جائے، ورنہ اُس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم دنیا جہاں کے علوم و فنون حاصل کر لیں ہمیں فائدہ صرف اُسی قدر ہونا ہے جس پر ہم عمل کریں۔ یہی معاملہ یہاں ہے۔ صلاحیتوں کی تجدید کے حوالے سے ہم نے جو کچھ یہاں پڑھا ہے اگر ہم اُس پر عمل نہیں کرتے تو ہماری حالت عین دس ہے گی جو بڑھنے سے پہلے تھی۔ ہمارا پڑھنا نہ پڑھنا ایک برابر ہو جائے گا۔ لہذا جتنا وقت ہم نے پڑھنے پر صرف کیا ہے اُس کو رآمد بنانے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم اُسے عمل کا حصہ بنانے پر سنجیدگی سے غور کریں۔

۲۔ شخصیت کے چاروں پہلوؤں کی متوازن تجدید ایک مسلسل اور متواتر عمل ہے جو باقاعدگی کا تقاضا کرتا ہے چنانچہ ہمیں اپنے حالات اور مصروفیات کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے خوب غور و فکر کے ساتھ معمولات کا ایک ایسا نظام مرتب کرنا چاہیے جس میں چاروں پہلوؤں کی تجدید کا سامان موجود ہو۔ اس حوالے سے کوئی ایسا لائحہ عمل تجویز کرنا جو ہر شخص کیلئے یکساں مفید اور قابل عمل ہو، مناسب اور موزوں نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر شخص کے حالات اور مجبوریاں دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ لہذا ہر شخص کو اپنے مناسب حال خود ہی نظام الاوقات مرتب کرنا چاہیے اور پھر حتی الوسع اُس کی پابندی کرنی چاہیے۔ تاہم عمومی راہنمائی (Guide line) کے طور پر سادہ سا نمونہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

طبعی پہلو

۱۔ کھانے کے اوقات مقرر کریں اور حتی الوسع اُن کی پابندی کریں۔ اپنے بجٹ کے دائرے میں رہتے ہوئے پھل، سبزیاں، دالیں اور گوشت وغیرہ حتی الوسع اول بدل کر استعمال کریں۔

۲۔ ورزش کیلئے روزانہ آدھا گھنٹہ مقرر کریں۔ ورزش میں صبح کی سیر، دوڑنا، اپنی پسند کا کوئی کھیل

مثلاً فٹ بال، ہاکی، بیڈمنٹن وغیرہ، لمبے اور گہرے سانس لینے کی مشق اور یوگا آسنز سب شامل ہیں۔ اپنے ذوق اور سہولت کے مطابق منتخب کریں۔

۳۔ سونے جاگنے کے اوقات مقرر کریں اور حتیٰ الوسع اُن کی پابندی کریں، ہو سکے تو دوپہر کو قیلوے کیلئے وقت نکالیں خواہ یہ چند منٹ محض لیٹنا ہی ہو۔

ذہنی پہلو

۱۔ اپنی پسند، ذوق اور مزاج کے مطابق دو چار اچھی کتابوں کا انتخاب کریں۔ اُن میں سے کم از کم ایک کو روزانہ کچھ وقت کیلئے ضرور پڑھیں، مطالعہ میں باقاعدگی اور تسلسل پیدا کریں جس طرح جسمانی صحت کیلئے روزانہ کھانا ضروری ہے اسی طرح ذہنی صحت کیلئے روزانہ مطالعہ کو ضروری سمجھیں۔

۲۔ قومی سطح کے کسی اچھے اخبار کا روزانہ مطالعہ کریں تاکہ حالات حاضرہ سے آگاہی ہو۔ وقت ملے تو ادارتی صفحے پر لکھے ہوئے اہم کالموں میں سے بھی ایک دو کالموں کو ضرور پڑھیں۔

۳۔ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ کسی ایسی علمی مجلس میں ضرور شرکت کریں جہاں کسی صاحب علم شخص نے کسی علمی موضوع پر گفتگو کرنی ہو۔ علاوہ ازیں وقتاً فوقتاً اہل علم کے پاس آنا جانا رکھیں، بہت کچھ حاصل ہوگا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر دانشوروں کی تقاریر اور لیکچرز کو گھر بیٹھے ٹیپ ریکارڈ/سی ڈی یا انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعے سن کر اپنے علم میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

قلبی پہلو

۱۔ کبھی کبھی روت بہا، کر کسی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر جائزہ لیا کریں کہ دل کی سرزمین پر کیسے کیسے پودے اُگے ہوئے ہیں۔ کون کون سی ناپسندیدہ سنت کی خود رو جھاڑیاں ہیں جن سے دل کی سرزمین کو پاک کرنا چاہیے۔ پھر انہیں ختم کرنے کے طریقوں پر غور کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شامل حال ہو جائے گی۔

۲۔ وقتاً فوقتاً اپنے دل میں پیدا ہونے والے جذبات کی لہروں کا مشاہدہ کیا کریں کہ کس طرح

بیرونی صورت حال دل کی اندرونی کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایسا کرتے رہنے سے انسان اپنے جذبات کی نزاکتوں، لطافتوں اور اُن کے اسرار و رموز سے آگاہ ہونا شروع ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اُن پر قابو پانا اور اُن کی تہذیب و اصلاح کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

۳۔ اپنی ذاتی اور کاروباری مصروفیات میں سے اپنے عزیز و اقارب اور متعلقین کے لئے وقت ضرور نکالیں۔ پھر اس وقت کو ”الحق للقریب فالحق للبعید“ کے اصول پر تقسیم کریں۔ جو جتنا قریب ہے اُس کا اتنا ہی زیادہ حق ہے۔ بعض عزیز و اقارب مثلاً بیوی، بچے وغیرہ ایسے ہوں گے جن کے ساتھ روزانہ کی بنیادوں پر ملاقات ضروری ہوگی۔ خواہ کسی وقت کے کھانے کی میز پر ہی ہو۔ بعض ایسے ہوں گے جن کے ساتھ ہفتہ میں ایک ملاقات ہی کافی ہو سکتی ہے اسی طرح بعض کے ساتھ مہینے میں ایک دفعہ مل لینا کافی ہے اور بعض کے ساتھ اس سے بھی زیادہ عرصہ کا وقفہ ڈالا جا سکتا ہے۔ مگر بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ ہمیں کسی بھی صورت میں اپنے آپ کو اپنی پیشہ وارانہ یا دیگر مصروفیات کے بوجھ تلے اتنا نہیں دبا لینا چاہیے کہ ہمارے پاس اپنے عزیز و اقارب، دوست احباب اور دوسرے متعلقین کے ساتھ تعلقات کی بحالی اور تجدید کے لئے وقت ہی نہ بچ سکے۔

روحانی پہلو

۱۔ روزانہ پانچ وقت کی نماز، باقاعدگی سے تلاوت قرآن (خواہ چند منٹ کیلئے ہی ہو) اور گاہے بگاہے اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ و خیرات کرتے رہنا چاہیے۔ وقت ملے تو کچھ وقت مخلوق خدا کی خدمت میں بھی صرف کرنا چاہیے۔ یہ چیز بھی روحانی ترقی کے سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اپنے حالات اور فرصت کے لمحات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے روزانہ کی بنیاد پر کچھ اور ادب بھی مخصوص ہونے چاہیے، مثلاً

۱۰۰ مرتبہ استغفار

۱۰۰ مرتبہ درود شریف

۱۰۰ مرتبہ کلمہ طیبہ وغیرہ

۲۔ روزانہ وقت نکال کر کچھ وقت کیلئے غور و فکر بھی کرنا چاہیے، غور و فکر کے حوالے سے مندرجہ ذیل نکات بہت اہم ہیں۔

- (i) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے متعلق سوچ کر شکر ادا کرنا
- (ii) موت اور موت کے بعد کے احوال کے متعلق سوچنا
- (iii) ساری کائنات میں پھیلے ہوئے مظاہر فطرت پر غور کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کے متعلق سوچنا
- (iv) اپنے نفس کا احتساب کرتے ہوئے دن بھر کے اعمال و افعال کا تنقیدی جائزہ لینا
- (v) اپنے نصب العین اور اقدار حیات کے متعلق سوچ و بچار کرنا۔

۳۔ ہفتہ میں ایک دن چند منٹوں کے لئے قبرستان جا کر قبروں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ اسی طرح کسی دن چند منٹ کیلئے ہسپتال میں جا کر مختلف قسم کے مریضوں کو بغور دیکھتے ہوئے عبرت حاصل کرنا بہت مفید ہے۔ اسی طرح ہفتہ میں کسی دن کچھ وقت کے لئے گھنے باغ یا کھلی فضا میں جہاں مظاہر فطرت مثلاً دریا، پہاڑ وغیرہ ہوں اُس ماحول میں کچھ وقت کے لئے خاموشی سے بیٹھ کر فطرت کی کتاب کو پڑھنا چاہیے۔ ایسے ہی لمحوں میں کبھی بڑے بڑے راز آشکار ہو جایا کرتے ہیں اور روح انسانی راز سے آشنا ہو کر صدیوں کی مسافت لمحوں میں طے کر لیا کرتی ہے۔

۴۔ حرف آخر کے طور پر جو بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیشہ یاد رکھیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ تمام صلاحیتیں دی ہیں جو زندگی کی تعمیر و ترقی اور کامیابی کے حصول کیلئے ضروری ہیں۔ لہذا آپ کو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قوت اور روشنی آپ کی ذات میں ہی موجود ہے۔ آگے بڑھیں اور اپنی ذات میں موجود پنہاں صلاحیتوں کو دریافت کریں اور انہیں اپنی اور اپنے ماحول کی بہتری کے لئے بھرپور طریقے سے استعمال میں لائیں۔

حواشی

- ۱۔ البقرہ، ۲: ۱۴۳
- ۲۔ ابن ابی شیبہ، المصنف، رقم: ۳۵: ۲۸، ۱۷۹/۷
- ۳۔ Current English Dictionary, P 299
- ۴۔ المثنیٰ، ۲: ۹۳
- ۵۔ مسلم، الصحیح، رقم: ۲۰۶۶۳/۳، ۲۰۵۲/۳
- ۶۔ البقرہ، ۲: ۲۴۷
- ۷۔ التفسیر، ۲۶: ۲۸
- ۸۔ بخاری، الصحیح، رقم: ۲۳۵۷/۵، ۶۰۳۹
- ۹۔ کویراج، ہرنام داس، ہدایت نامہ صحت، مشتاق بک کارنر، لاہور، ص ۱۳۳
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۱۹
- ۱۱۔ متین فاطمہ، پروفیسر ڈاکٹر، غذا اور غذائیت، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۸
- ۱۲۔ ایضاً
- ۱۳۔ Current English Dictionary, P 664
- ۱۴۔ السنن لابن ماجہ، رقم: ۳۴۳۳
- ۱۵۔ ابن حبان، الصحیح، رقم: ۳۳۹/۲، ۶۷۷
- ۱۶۔ النبا، ۸: ۷۹
- ۱۷۔ واصف، واصف علی، بات سے بات، ص ۱۱۳
- ۱۸۔ البقرہ، ۲: ۳۱
- ۱۹۔ النجاد، ۱: ۵۷
- ۲۰۔ بزار، ابو بکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق بصری (۲۱۰-۲۹۲ھ/۸۲۵-۹۰۵ء)۔ المسند۔ موسسہ علوم القرآن، بیروت، ۱۴۰۹ھ، رقم: ۱۷۵/۱، ۹۵

- ۲۱۔ ابن عساکر، ابو قاسم علی بن حسن بن بہتہ اللہ بن عبد اللہ بن حسین دمشقی (۳۹۹ھ-۵۷۱ھ / ۱۱۰۵-۱۱۷۶ء)۔
تاریخ مدینہ دمشق۔ دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۵ء، ج ۱، ص ۳۶۰
- ۲۲۔ بنی اسرائیل، ۷۰:۱۷
- ۲۳۔ الحجرات، ۱۳:۳۹
- ۲۴۔ ابن ماجہ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۰۹ھ-۲۷۳ھ / ۸۲۴-۸۸۷ء)۔ السنن۔ دارالفکر، بیروت، ص ۱۲۱، رقم: ۳۶۷۱، ج ۳، ۱۲۱۱
- ۲۵۔ الحجج، ۲۹:۱۵
- ۲۶۔ انفجر، ۸۹:۲۷-۳۰

فصل دوم:

فکری گمراہیوں کا علاج

انسانی زندگی کا پہلا قانون ”دفع ضرر اور چلبہ منفعت“ ہے یعنی ضرر سے بچنا اور نفع کو حاصل کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت اور جبلت میں یہ بات رکھ دی گئی ہے کہ وہ ہر قسم کے نقصان سے اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہے اور ہر قسم کے فائدے کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ تقاضا صرف انسان میں ہی نہیں بلکہ ہر ذی روح کے اندر اس طرح سمودیا گیا ہے کہ وہ کسی حال میں اُس سے جدا نہیں ہو سکتا اور اس کے خلاف چلنا کسی کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ دنیا کی بقاء، ارتقاء، اور نشوونما کا تمام تر دار و مدار اسی قانون پر ہے۔

اس قانون کی مثالیں ہمیں جا بجا ملتی ہیں۔ مثلاً ایک دن کا پیدا ہونے والا شیرخوار بچہ جب بھوک محسوس کرتا ہے تو وہ اُسکے ازالے کے لیے کسی شے کی طلب کا اظہار کرتے ہوئے رونا شروع کر دیتا ہے حالانکہ وہ لفظ بھوک سے آشنا بھی نہیں ہے۔ اسکی وجہ محض یہی ہے کہ بھوک کی حالت اُس کے لیے ضرر رساں اور نقصان دہ ہے لہذا اُس کی فطرت اُسے اس حالت سے بچانا چاہتی ہے چنانچہ وہ اس حالت سے باہر آنے کے لیے دودھ یا کسی اور چیز کی طلب کرتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ہاتھ اگر کہیں بے دھیانی میں آگ کی سمت بڑھنے لگے تو فوراً ہمارے ارادے کے بغیر ہی پیچھے ہٹتا ہے۔ ہماری آنکھوں میں اگر کوئی چیز پڑنے لگے تو وہ غیر ارادی طور پر چشم زدن میں بند ہو جاتی ہیں تاکہ ہر قسم کے نقصان سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ یہ مثالیں اس حقیقت کو آشکار کرتی ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص ہر معاملے میں فطری اور جبلتی طور پر ہر قسم کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے اور ہر قسم کے فائدے اور منافع کو اپنے لیے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

لیکن دوسری طرف روزمرہ کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ لوگوں کی اکثریت شاہراہ حیات پر سفر کرتے ہوئے تعمیر کو چھوڑ کر تخریب کی طرف چل پڑتی ہے اور بیسیوں ایسے کام کرتی ہے جو اُسے تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ مثلاً سگریٹ نوشی اور دوسرے نشہ جات کا استعمال، قتل، زنا، چوری،

ذہنیت، دوسروں کو ناحق ستانا اور اسی طرح کے بہت سے مذہبی، اخلاقی، سماجی و معاشرتی جرائم جن میں بتلا ہو کر انسان دوسروں کو نقصان پہنچانے اور معاشرے کا امن و سکون تہس نہس کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی ذہنی و قلبی سکون و اطمینان سے محروم کر لیتا ہے اور دنیا و آخرت کی تباہیاں، بربادیاں، رسوایاں اور ذلتیں خرید لیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ انسان اپنی فطرت کے تقاضوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان کی مخالف سمت میں چلتے ہوئے نفع کی بجائے نقصان کا سودا کیوں کر لیتا ہے اور کامیابی و کامرانی کے راستے کو چھوڑ کر ناکامی و نامرادی کے راستے پر چل کر اپنی منزل کو کھوٹا کیوں کر لیتا ہے؟ اس سوال کے جواب پر غور کرنے سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی دو چیزوں سے عبارت ہے، ایک فکر اور دوسرا عمل۔ فکر اور عمل اگرچہ دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر اور لازم ہیں اور اسی طرح ملی ہوئی ہیں جیسے آگ کے ساتھ حرارت اور سورج کیساتھ روشنی۔ ان دونوں میں تعلق یہ ہے کہ فکر مقدم ہے اور عمل مؤخر۔ انسان کا ہر عمل اس کی فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر چیز پہلے خیال اور فکر کی سطح پر نمودار ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد عمل کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ لہذا فکر اگر درست ہوگی تو عمل بھی درست ہوگا اور فکر غلط ہوگی تو عمل بھی غلط ہو جائے گا۔ لہذا عمل کو درست کرنا ہے تو پہلے فکر کو درست کرنا ہوگا۔ یہ فکر کی گراہیاں ہیں جو انسان کو تعمیر کے راستے سے ہٹا کر تخریب کے راستے پر ڈال دیتی ہیں۔ تاریخ انسانی میں جو بھی تخریب کاریاں، تباہیاں اور بربادیاں ہمیں دکھائی دیتی ہیں وہ سب کی سب پہلے انسانوں کے ذہنوں میں جنم لیتی رہی ہیں اور پھر ہی عمل کا روپ دھارتی رہی ہیں اور فکری گراہیوں کا سبب ذہنی مغالطے، غلط فہمیاں اور توہمات ہیں جو حقیقت کے چہرے پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور انسان کو اشرف المخلوقات کے بلند ترین مقام سے نیچے گرا کر جانوروں کی سطح پر بلکہ بعض اوقات اس سے بھی نیچے لے آتے ہیں۔

سقراط کے ایک مشہور قول کا مفہوم ہے ”نیکی علم ہے اور بدی جہل“ (۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو کسی بھی معاملے میں صحیح علم حاصل ہو جاتا ہے تو وہ لازماً عمل کا روپ دھارتا ہے جو کہ نیکی کی شکل بنتی ہے۔ اسکے برعکس کسی بھی معاملے میں جہالت سے انسان کے اندر توہمات اور غلط تصورات پیدا ہوتے ہیں جن سے غلط عمل جنم لیتا ہے جو بدی کی شکل بنتی ہے۔ انسانی فکر کو سنوارنے اور بگاڑنے میں علم کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے علم کے حصول پر اتنا زور دیا ہے کہ دنیا کے کسی

اور مذہب اور تہذیب نے اتنا زور نہیں دیا۔ قرآن مجید کی پہلی وحی کا آغاز ہی حصول علم کی تلقین سے ہو رہا ہے۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. (۲)

”پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا“

قرآن مجید نے جا بجا علم کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ مثلاً

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۳)

”کہہ دے! کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو جائیں گے؟“

يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ. (۴)

”اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کے درجات بلند فرمائے گا جو ایمان لائے اور انہیں علم دیا گیا۔“

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ. (۵)

”بے شک اللہ کے بندوں میں سے اُس سے ڈرنے والے تو صرف عالم ہی ہیں“

حضور ﷺ نے فرمایا:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ. (۶)

”علم کی طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے“

اطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ إِلَى اللَّحْدِ. (۷)

”گہوارے سے قبر تک علم حاصل کرتے رہو“

لیکن علم سے مراد وہی علم ہے جو انسان کو فکری لغزشوں، گمراہیوں، توہم پرستیوں سے نکال کر حقیقت سے آشنا کر دے نہ وہ علم کہ جو اُنکا انسان کو شکوک و شبہات اور گمراہیوں کی دلدل میں ڈال کر حقیقت سے دور کر دے۔ ایسے علم سے پناہ مانگی گئی ہے۔ حضور ﷺ کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ تھی۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ (۸)

”اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اُس علم سے جو نفع نہ دے“

علم کا نفع بخش نہ ہونا دو جہتوں سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ علم نظریاتی طور پر غلط ہو اور اسکے نتیجے میں انسان فکری گمراہیوں کا شکار ہو جائے جن کا لازمی نتیجہ عملی گمراہیوں کی شکل میں نکلے گا کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ ”عمل تابع ہوتا ہے حال کے اور حال تابع ہے علم و یقین کے“ علم کے غیر نفع بخش ہونے کی دوسری جہت یہ ہے کہ علم بذاتِ خود تو صحیح ہو لیکن وہ عمل کا روپ نہ دھار سکے۔ اسلام کا مطالبہ ہے کہ انسان کا علم نظری اعتبار سے بھی صحیح ہونا چاہیے اور اُسے انسانی شخصیت میں اس طرح رچ بس جانا چاہیے کہ انسان اُس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہو جائے۔

فکرِ سلیم کے حصول کا سہ نکاتی لائحہ عمل

اب دیکھنا یہ ہے کہ سوچ اور فکر کا وہ کون سا لائحہ عمل ہے جسے اپنا کر انسان فکری لغزشوں سے بچ سکتا ہے اور زندگی کے زاویوں کو درست کر سکتا ہے؟ یہاں تین اصول بیان کیے جا رہے ہیں جن کو اپنانے سے انسان صحیح روش کو اپنا کر اپنی زندگی کو کامیابی و کامرانی کی شاہراہ پر چلا سکتا ہے؛ زندگی کے بازار میں زندگی کی پوری قیمت وصول کر سکتا ہے اور زندگی کے دامن کو حقیقی خوشیوں اور مسرتوں سے بھرنے کیساتھ ساتھ اپنے ارد گرد کے ماحول پر خوشگوار اثرات ڈال سکتا ہے۔ یہ اصول اسلامی تعلیمات اور علمِ نفسیات کی جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں مرتب کیے گئے ہیں یہ اصول ذیل میں درج ہیں۔

(i) مثبت سوچ (ii) حقیقت پسندی (iii) خود شناسی

ذیل میں ان سب کی تشریح و تفصیل درج کی جا رہی ہے۔

(i) مثبت سوچ

اللہ رب العزت نے اس کائنات میں ہر چیز کا جوڑا جوڑا بنایا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا. (۹)

”پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کا جوڑا جوڑا پیدا کیا۔“

قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کی رُو سے کائنات کی ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی گئی ہے۔ مثلاً دن رات، مرد و عورت، آسمان و زمین، گرمی و سردی، خیر و شر وغیرہ۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو زندگی کا سارا حسن

ہی اس تضاد میں ہے۔ عربی زبان کا ایک مقولہ ہے۔

الْأَشْيَاءُ تُعْرَفُ بِأُضْدَادِهَا.

”چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں۔“

کائنات کی دوسری تمام اشیاء کی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانی سوچ کے بھی دو انداز بنائے ہیں۔ ایک کا نام ہے مثبت سوچ اور دوسرے کا نام ہے منفی سوچ۔ جس طرح ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں اسی طرح ہر معاملے کے بھی دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ مثبت سوچ کا مطلب ہے تصویر کے روشن پہلو کو دیکھنا یعنی ہر معاملے کی مثبت جہت کو لینا۔ بالفاظِ دیگر ہر حال میں پُر امید اور رجائیت پسند ہونا جبکہ منفی سوچ کا مطلب ہے تصویر کے تاریک پہلو کو دیکھنا یعنی معاملے کی منفی جہت کو لینا۔ بالفاظِ دیگر معاملے کے تاریک پہلو کو دیکھتے ہوئے مایوسی، ناامیدی اور پست ہمتی وغیرہ کا شکار ہو جانا۔

مثبت اور منفی سوچ کا تعلق کسی ایک معاملے سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے جملہ معاملات میں یہ دونوں قسم کی سوچیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً میز پر آدھا گلاس پانی کا پڑا ہوا ہے۔ ایک کہتا ہے آدھا خالی ہے، دوسرا کہتا ہے آدھا بھرا ہوا ہے۔ اگرچہ دونوں ہی صحیح کہہ رہے ہیں مگر دونوں کے نکتہ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اول الذکر کی سوچ منفی ہے جو معاملے کے تاریک پہلو کو دیکھ رہی ہے جبکہ مؤخر الذکر مثبت سوچ کا مالک ہے جو معاملے کے روشن پہلو کو دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح ایک شخص کسی بستی میں گیا وہاں اُسے جوتے کی ضرورت پیش آگئی۔ اُسے ساری بستی میں تلاش کے باوجود جوتے کی دکان ہی نہ ملی۔ اب سامنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ بندہ مایوس ہو کر کہتا کہ عجیب بستی ہے جس کے اتنے بڑے رقبے میں جوتے کی دکان ہی کوئی نہیں ہے۔ لیکن وہ بندہ مثبت سوچ والا تھا اُس نے سوچا کہ یہاں جوتے کی دکان کھول کر خوب منافع کمایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا اور خوب منافع کمایا۔ سوامی دوکاند کے ایک مسیحی دوست نے ایک مرتبہ اُن کی دعوت کی۔ اُس نے اپنے کمرے کی میز پر مختلف مذاہب کی کتابیں اس طرح اوپر نیچے رکھ دیں کہ سب سے نیچے سوامی جی کی مذہبی کتاب تھی اور سب سے اوپر اُس کی اپنی مذہبی کتاب۔ سوامی جی جب کمرے میں داخل ہوئے تو اُس نے کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان پر تبصرہ کریں۔ بظاہر یہ واقعہ اشتعال دلانے والا تھا مگر سوامی جی نے کمال تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا کہ

The foundation is really good. (۱۰)

”بنیاد تو واقعی اچھی ہے“

بظاہر تو سوامی جی کے لیے یہ ایک منفی واقعہ تھا مگر اُن کی مثبت سوچ نے اس منفی واقعہ میں سے بھی مثبت پہلو نکال لیا۔

یو نیورٹی کے ایک پروفیسر سے پوچھا گیا کہ کسی آدمی کے تعلیم یافتہ ہونے کی علامت کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ

The person who can create thing out of nothing. (۱۱)

”وہ شخص جو ’نہیں‘ سے ’ہے‘ کو تخلیق کر سکے۔“

عظیم سائنسدان الفریڈ ایڈلر نے اپنی ساری زندگی انسان کی چھپی ہوئی مخصوص صلاحیتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ

One of the wonder-filled characteristics of human beings is there power to turn a minus into a plus. (۱۲)

”انسانی شخصیت کی خصوصیات میں سے ایک حیرت ناک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ’نہیں‘ کو ’ہے‘ میں تبدیل کر سکتا ہے۔“

یہ حقیقت ہے کہ انسان کی سوچ ہی تمام کامیابیوں کی بنیاد ہے اور انسان کی سوچ ہی اُسے ناکامیوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کی عملی زندگی اُس کے ارادوں کے ماتحت ہوتی ہے اور ارادے سوچ اور فکر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ منفی سوچ کا نتیجہ خراب زندگی ہے اور مثبت سوچ کا نتیجہ خوشگوار زندگی ہے۔ انسان کے جملہ اعمال و افعال میں سوچ کی حیثیت وہی ہے جو مکان کی تعمیر میں نقشہ کی ہوتی ہے۔

جیسا نقشہ --- ویسا مکان، جیسی سوچ --- ویسا انسان۔ انسان کی سوچ کا اُس کی صلاحیتوں پر بڑا زبردست اثر پڑتا ہے۔ منفی سوچ انسان کو کمزور کرتی ہے اور اُس کی صلاحیتوں کو جامد کر دیتی ہے جبکہ مثبت سوچ اُس کی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے اور اُسے آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرتی

ہے۔ اس بات کو ریاضی کی مثال کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ جس طرح ریاضی میں اعداد کو جمع کرتے جانے سے مجموعہ بڑھتا چلا جاتا ہے جبکہ منفی کرنے سے حاصل تفریق کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح مثبت سوچوں سے انسان پھیلتا ہے اور کامیابیوں اور کامرانیوں کی نئی داستانیں رقم کرتا ہے جبکہ منفی سوچ سے انسان سکڑتا چلا جاتا ہے اور اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہر انسان کے اندر بے شمار صلاحیتیں، خوابیدہ قوتیں اور لامحدود امکانات بنانے والے نے رکھ دیئے ہیں لیکن انہیں جاننے، سمجھنے اور پروان چڑھانے کے لیے مثبت سوچ کی ضرورت ہے۔ دین، دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیاں مثبت سوچ کی مرہون منت ہیں اور تمام ناکامیوں کی تہہ میں کہیں نہ کہیں منفی سوچ ہی دکھائی دیتی ہے۔ تاریخ کے اندر جتنے بھی لوگ کامیابی کی چوٹی پر دکھائی دیتے ہیں یہ سب کے سب وہ لوگ ہیں جو مثبت سوچوں سے لبریز تھے جو ہر قسم کے ناخوشگوار حالات میں مبتلا ہو کر بھی پُر امید اور باحوصلہ رہنا جانتے تھے۔

جب یہ بات طے ہوگئی کہ مثبت سوچ انسانی زندگی کی کامیابی میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے تو پھر اسلام جو اپنے دامن میں انسانیت کے لیے صرف دنیا کی نہیں بلکہ دنیا کے ساتھ آخرت کی کامیابیوں کو لے کر آیا لازماً اسے مثبت سوچ کا علمبردار ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے جب ہم اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں ہمیں قدم قدم پر مثبت سوچ کو اپنانے اور منفی سوچ سے سختی سے پرہیز کرنے کی تلقین ملتی ہے۔ بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اپنے عقائد سے لے کر جملہ تعلیمات تک ہر جگہ اور ہر معاملے میں مثبت سوچ کا دوسرا نام ہے (گو اسلام مثبت سوچ سے بہت آگے کی چیز ہے اور مثبت سوچ تو اُس کا فقط ایک جز ہے) وضاحت کے لیے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

(i) اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں اپنے گناہ گار بندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ. (۱۳)

”میری رحمت سے مایوس نہ ہوں۔“

مایوسی کیا ہے؟ منفی سوچ کا دوسرا نام ہے اور پُر امید رہنا مثبت سوچ ہے۔ تو یہاں مثبت سوچ کو اپناتے ہوئے ہر حال میں اُمید کا دامن تھامے رکھنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔

(ii) يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ. (۱۴)

”اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔“

علم نفسیات اور روزمرہ کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ اگر انسان کسی معاملے کو مشکل سمجھ لے تو اس کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ یہاں اس آیت کے ضمن میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زندگی گزارنے کے جو احکامات دیئے گئے ہیں ان کی بنیاد آسانیوں پر رکھی گئی ہے نہ کہ دشواریوں پر۔ لہذا بظاہر اگر کسی جگہ پر کوئی مشکل اور رکاوٹ بھی محسوس ہو رہی ہے تو انسان کو مایوس نہیں ہو جانا چاہیے بلکہ اس کے اندر آسان والے پہلو کو تلاش کرنا چاہیے اور اپنے حوصلے کو برقرار رکھنا چاہیے۔ کسی معاملے میں حوصلہ مند رہنا مثبت سوچ ہے اور بے حوصلہ ہو جانا منفی سوچ۔ گویا یہاں بھی بالواسطہ طور پر مثبت سوچ کو اپنانے کی تلقین کی گئی۔

(iii) قرآن مجید میں اللہ رب العزت کی طرف سے جا بجا اپنی نعمتوں کو یاد دہانی کرائی گئی اور انہیں یاد کرنے اور ان پر شکر بجالانے کا حکم دیا گیا، مثلاً سورۃ الرحمن میں مختلف نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بار بار فرمایا گیا

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ (۱۵)

”پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے“

دوسرے مقام پر فرمایا گیا:

وَاشْكُرُوا النِّعْمَةَ الَّتِي (۱۶)

”اور تم اللہ کی نعمتوں کا شکر بجالایا کرو۔“

جبکہ تیسرے مقام پر شکر کی طرف باقاعدہ ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (۱۷)

”اگر تم شکر ادا کرو گے تو البتہ میں اپنی نعمتیں تم پر اور بڑھا دوں گا۔“

نعمتوں کو بار بار یاد دلانے اور ان پر شکر بجالانے کی تاکید کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے تصور سے لبریز رہیں اور وہ جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھتا رہے۔ اس کے برعکس مضر ہی کا احساس جو کہ سراسر منفی جذبہ ہے اور انسان کی صلاحیتوں کا قاتل ہے، وہ اس کے قریب بھی

نہ پھٹنے پائے۔

(iv) انسان کے لیے سب سے مشکل وقت وہ ہوتا ہے جب اُس پر کوئی دکھ، تکلیف یا بلائے ناگہانی آجاتی ہے۔ ایسے موقع پر انسان کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور وہ ہتھیار پھینک دینا چاہتا ہے۔ اسلام ایسے موقع پر انسان کو صبر کا دامن مضبوطی سے تھام لینے کی تلقین کرتا ہے جو کہ سراسر مثبت جذبہ ہے اور اس کے مقابلے میں بے صبری منفی سوچ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید جا بجا صبر کی تلقین کرتے ہوئے ساتھ اُن انعامات کا تذکرہ بھی کرتا ہے جو صبر کے نتیجے میں انسان کو مل سکتے ہیں تاکہ اُس کے لیے صبر کرنا آسان ہو جائے۔ ایک جگہ یہاں تک ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا يُوفَى الصَّابِرُونَ بغيرِ حِسَابٍ (۱۸)

”بے شک صبر کرنے والوں کو بدلہ بغیر حساب کے دیا جائے گا۔“

ایک اور مقام پر صبر کرنے والوں کو اپنی خصوصی معیت کا مزدہ جانفزا سنا تے ہوئے فرمایا

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (۱۹)

”بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اب جس انسان کے دل میں صبر سے حاصل ہونے والے یہ ثمرات ہوں گے اُس کے لیے ہر قسم کی مصیبت میں صبر کے دامن کو تھامنا آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ مایوسی اور پست ہمتی کا شکار ہونے اور اسکے نتیجے میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے محفوظ رہے گا۔

(۱۰) حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت جو قیمتی نصیحتیں ارشاد فرمائی تھیں اُن میں سے ایک یہ تھی:

بَشِّرُوا وَلَا تَنْفَرُوا وَلَا تَعْسَرُوا. (۲۰)

”لوگوں کو خوشخبری دیا کرو اور اُنہیں (خواہ مخواہ ڈرا دھمکا کر) متنفر نہ کیا کرو اور (اُن کے لیے

معاملات میں حتی الوسع) آسانی پیدا کیا کرو اور (خواہ مخواہ بے جا پابندیاں لگا کر یا احکام شرع

کو انتہائی صورتوں میں بیان کر کے اُن کے لیے) تنگی پیدا نہ کیا کرو۔“

خوشخبری دینا مثبت فکر ہے اور آسانی پیدا کرنا مثبت عمل ہے۔ اسکے برعکس نفرت پیدا کرنا منفی سوچ

ہے اور مشکلات پیدا کرنا منفی عمل۔ یہاں حضور ﷺ نے مثبت سوچ اور مثبت عمل کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ منفی سوچ اور منفی عمل سے گریز کی تلقین فرمائی ہے۔

(vi) إِذْ أَنْظَرَ أَحَدَكُمْ إِلَى مَنْ فَضَّلَ عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْهُ ذَلِكَ أَدْنَى الْأَتْزَادِ وَأَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ (۲۱)

”جب تم میں سے کسی شخص کی نظر کسی ایسے شخص کی طرف پڑے جو اُس سے مال یا جسمانی بناوٹ میں افضل ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ اُس کی طرف دیکھے جو اُس سے (ان معاملات میں) کمتر ہے۔ یہ بات اس کے زیادہ قریب ہے کہ تم اللہ کی نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو۔“

اس حدیث مبارکہ میں جو سبق دیا گیا ہے وہ مثبت سوچ کو برقرار رکھنے اور منفی سوچ سے بچنے کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ جب بھی کوئی شخص اپنے سے برتر کی طرف دیکھے گا تو لازماً وہ اُس کے ساتھ اپنا موازنہ کرے گا جس کے نتیجے میں اُسے اپنے پاس موجود نعمتیں حقیر اور کمتر دکھائی دیں گی جس سے اُس کے دل میں تنگی اور شکوہ پیدا ہوگا اور کئی دوسرے منفی رجحانات جنم لیں گے جو بالآخر اُسے عمل کی منفی سمتوں کی طرف لے جانے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اپنے سے کمتر کی طرف دیکھنے کی صورت میں اپنے پاس موجود نعمتیں زیادہ دکھائی دیں گی جس کے نتیجے میں دل و دماغ میں خوشی و مسرت کے جذبات پیدا ہوں گے جو اُس کی شخصیت پر کئی قسم کے مثبت اور خوشگوار اثرات پیدا کریں گے۔

(vii) لَا يَفْرُقُ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ (۲۲)

”کوئی مومن مرد کسی مومنہ عورت (جس سے اُس کا نکاح ہوا ہو) سے بغض نہ رکھے اگر اُسے اُس کی کوئی ایک عادت ناپسند ہو تو کوئی دوسری پسند بھی ہوگی۔“

حدیث مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی آدمی کے لیے اپنے جیون ساتھی کو کسی خامی کی بنا پر چھوڑنا مناسب نہیں ہے اس کی بجائے وہ اُس کی کسی دوسری خوبی پر نظر رکھتے ہوئے اُس کے ساتھ نباہ کرتا چلا جائے۔ یہ اصول صرف میاں بیوی کے باہمی تعلقات کے حوالے سے ہی اہم نہیں ہے بلکہ خاندانی، سماجی اور معاشرتی زندگی کے ہر شعبے میں لاگو ہوتا ہے کہ انسان نے جن لوگوں کے درمیان رہنا ہو محض اُن کی خامیوں کی طرف دیکھتے رہنے (جو کہ ایک منفی اندازِ فکر ہے اور نفرت پیدا کرتا ہے) کی بجائے اُن کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہوئے (جو کہ مثبت سوچ ہے اور باہمی محبت پیدا کرتی ہے) اُن کے ساتھ اچھی طرح

گذر بسر کرنا چاہیے اور خوشگوار تعلقات کو قائم رکھنا چاہیے۔

(viii) حضور ﷺ نے دعا کا ایک اہم ادب سکھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

أَدْعُوا اللَّهَ وَأَنْتُمْ مُوقِنُونَ بِالْإِجَابَةِ. (۲۳)

”اللہ کو پکارا کرو اس حال میں کہ تمہیں دعا کی قبولیت کا یقین ہو“

دعا کی قبولیت کی اُمید اور یقین رکھنا مثبت سوچ ہے جب کہ قبولیت کے حوالے سے شک اور تردد کا ہونا منفی سوچ ہے۔

(ix) حضور ﷺ کا معمول تھا کہ جب کسی بیمار کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو اُس

کے سر ہانے بیٹھ کر عموماً یہ کلمات فرماتے

لَا بَأْسَ عَلَيْكَ طُهُورُ الْإِنشَاءِ اللَّهُ تَعَالَى. (۲۴)

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ (یہ بیماری تمہیں گناہوں سے) پاپ کر دے گی۔“

بیمار آدمی کی ہمت عموماً شکستہ ہو چکی ہوتی ہے اور کئی قسم کے خدشے، دوسو سے اُسے دامن گیر ہوتے ہیں۔ تمام منفی سوچوں سے نجات دلانے اور اُس کی ہارتی ہوئی ہمت کو بحال کرنے کے لیے اُسے بتایا جا رہا ہے کہ بیماری کی طرف دیکھنے کی بجائے اُس پر ملنے والے اجر اور نتیجے کی طرف دیکھو۔ منفی میں سے مثبت کو نکالنے کی یہ کیسی خوبصورت مثال ہے!

(x) حضور ﷺ صحابہ کرام ا کیساتھ ایک تنگ گھائی سے گذر رہے ہیں۔ پوچھا اسکا نام کیا ہے؟

لوگوں نے کہا ”الضیفہ“ (تنگی والی جگہ) آپ ﷺ نے فرمایا نہیں آج سے اسکا نام ”الیسری“ ہے۔

سوچنے والی بات یہ ہے کہ یہاں نام کے تبدیل ہو جانے سے وہ جگہ کشادہ تو نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہاں ایک نفسیاتی قاعدہ استعمال کیا جا رہا ہے اور وہ یہ کہ انسان کی سوچ رائی کو پہاڑ اور پہاڑ کو رائی بنا سکتی ہے۔ ”الضیفہ“ کا نام سنتے ہی ذہن تنگی کی طرف جاتا ہے اور ”الیسری“ کا نام سن کر ذہن آسانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ تو یہاں نام کو تبدیل کرنے کا فلسفہ یہی دکھائی دیتا ہے کہ انسان اسکے نام کی طرف دیکھتے ہوئے ذہن کی سطح پر اُسے مشکل سمجھ کر خواہ مخواہ اپنے لیے مسئلہ نہ بنالے۔

(xi) ظَنُّوا الْمُؤْمِنِينَ خَيْرًا.

”مؤمنوں کے متعلق اچھا گمان رکھو۔“

یہاں دوسروں کے متعلق اچھا گمان رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو کہ مثبت سوچ ہے جبکہ دوسروں کے متعلق خواہ مخواہ بدگمانی میں مبتلا ہونا سراسر منفی سوچ ہے۔ حضور ﷺ نے حسن ظن کی تلقین فرمائی اور ایک اور مقام پر اسے عبادت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

حُسْنُ الظَّنِّ مِنَ الْعِبَادَةِ. (۲۵)

”حسن ظن (یعنی دوسروں کے متعلق حتی الوسع اچھا گمان رکھنا) عبادت ہے۔“

(xii) غصہ، نفرت، کینہ، حسد، بغض، عداوت، تعصب وغیرہ وغیرہ سب منفی احساسات ہیں جو اسلام میں قطعی حرام ہیں اور ان کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرے سے پیار و محبت اور صلح و صفائی سے رہنا، ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنا، دوسروں کی خیر خواہی چاہنا، ہر ممکن طریقے سے دوسروں کی مدد کرنا وغیرہ وغیرہ مثبت جذبات ہیں جن کو اسلام میں پسند کیا گیا ہے اور ان کی تلقین کی گئی ہے۔

اوپر والی ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام سوچ، فکر اور عمل کی ہر سطح پر مثبت رجحانات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور منفی جذبات و احساسات اور منفی اعمال و عادات کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ یہی بات علم نفسیات کی سمجھ میں مدتوں بعد جا کر آئی ہے اور آج یہ علم بھی تعمیر شخصیت کے اندر مثبت سوچ کے کردار کو زبردست اہمیت دے رہا ہے۔ انسان کی عملی زندگی اسکی سوچوں کی ہی آئینہ دار ہوتی ہے۔ سوچ ایک بہت بڑا ہتھیار ہے، اُترات مثبت استعمال کر لیا جائے تو ہم بہت کچھ شکار کر سکتے ہیں اور اگر اسے منفی استعمال کیا جائے تو ہم خود شکار بن جاتے ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ بچپن سے ہی ہمارے ذہن میں گھر، مدرسہ اور ماحول کے اثرات میں سے بہت سی منفی چیزیں داخل ہو جاتی ہیں۔ نیز ہمارے ساتھ پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات اور تلخ حادثات و سانحات بھی نئی قسم کی منفی سوچیں اور منفی رجحانات ہمارے ذہن میں منتقل کرتے جاتے ہیں۔ بلوغت تک پہنچتے ہوئے ہم بہت سی منفی سوچوں کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں اور منفی سوچ گویا ہماری عادت اور ذہنی رویہ

بن چکی ہوتی ہے اور پھر اُس کے زیر اثر ذہن خود بخود کام کرتا رہتا ہے۔ بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان کوشش کے ذریعے اپنی عادتوں کو تبدیل کر سکتا ہے اور جیسے دوسری عادتوں کو بدلا جاسکتا ہے اسی طرح منفی سوچ کی عادت کو بھی بدلا جاسکتا ہے۔ ابتداء میں ذہن کو منفی سوچ کی ڈگر سے بنا کر مثبت سوچ کی ڈگر پر لانے کے لیے کچھ محنت تو کرنا پڑے گی لیکن ایک بار اگر محنت کر کے ذہن کو ہر معاملے میں مثبت سوچ کی عادت ڈال دی جائے تو پھر اس عادت کے اثرات و ثمرات ہماری ساری عملی زندگی کے اندر شامل ہو کر اُسے خوشگوار اور حسین تر بنا دیں گے۔

(ii) حقیقت پسندی

حقیقت پسندی کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر معاملے میں حقیقت کا متلاشی اور اپنے امکان کی حد تک حقیقت پر چلنے والا بن جائے وہ کسی بھی معاملے کو محض سطحی طور پر دیکھ کر کوئی فیصلہ نہ کر لے بلکہ ہر معاملے کی گہرائی میں اتر کر، اُس کا ہر پہلو سے جائزہ لے کر دیکھے کہ اُس میں سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے، حقیقت کیا ہے اور فسانہ کیا ہے، صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے، اور پھر دیا نندارانہ اور حقیقت پسندانہ نیز منصفانہ غور و فکر کے نتیجے میں جو چیز اُسے بنی برحق اور ”اقرب الی الصواب“ دکھائی دے اُسے قبول کر لے اور اسی کے مطابق اپنے طرز عمل کو متعین کر لے خواہ اُسے اپنانے میں کوئی ظاہری فائدہ دکھائی دے یا نہ دے اور اس کے برعکس جو چیز حقیقت سے بعید دکھائی دے، اُسے چھوڑ دے، چاہے بظاہر اُسے اپنانے میں کوئی فائدہ اور مصلحت ہی کیوں نہ دکھائی دے رہی ہے۔

مثبت سوچ کے ساتھ حقیقت پسندی کا جمع ہونا بہت ضروری ہے ورنہ محض مثبت سوچ انسان کو کبھی نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ مثلاً انسان مثبت سوچ کو استعمال کرتے ہوئے شفا کی امید پر زہر کھالے تو یہ طرز عمل یقیناً غلط ہوگا اس لیے کہ زہر کا نقصان وہ ہونا ایک حقیقت ہے، اس کی ماہیت صرف انسان کی مثبت سوچ سے تو تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح انسان منزل کی سمت جانے والے راستے کی بجائے کسی غلط سمت چل پڑے اور مثبت سوچ کے ذریعے یہ توقع رکھے کہ میں یقیناً منزل پر پہنچ جاؤں گا تو یہ محض اُس کی خام خیالی ہوگی جو حقیقت کا بدل نہیں بن سکے گی۔ لہذا مثبت سوچ اپنی جگہ پر بہت اچھی چیز ہے لیکن اُس کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کو بھی ضرور شامل رکھنا چاہیے۔ جب یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہو جائیں تو پھر گمراہی کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی معاملے میں

کسی طرز عمل کو اپنانے کے لیے پہلے حقیقت پسندی کا فارمولہ استعمال کرتے ہوئے درست روش کو دریافت کرنا چاہیے پھر اُس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مثبت سوچ رکھنی چاہیے اور نتائج کے حوالے سے پُر امید رہنا چاہیے۔

مثبت سوچ کیساتھ جب تک حقیقت پسندی کو شامل نہ کیا جائے اسکی حیثیت خوش گمانی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی جو انسان کو کوئی بہت بڑا فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ بعض اوقات تو غلط فہمی یا گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔ تاریخ کی بہت ساری گمراہیاں اُس مثبت سوچ سے ہی پیدا ہوئیں جن کے ساتھ حقیقت پسندی شامل نہیں تھی۔ مثلاً یہود و نصاریٰ نے بذعم خویش یہ سمجھ لیا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے لاڈلے ہیں لہذا ہم جہنم میں نہیں جائیں گے۔

وَقَالُوا لَنْ نَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً. (۲۶)

”اور انہوں نے کہا ہمیں آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔“

جب یہ سوچ بن گئی تو پھر انہوں نے ہر قسم کی جسارتوں، دیدہ دلیریوں اور دوسروں پر ہر قسم کے ظلم و ستم اور زیادتی کو اپنے لیے جائز قرار دے لیا۔ اب یہاں سوچ تو اُن کی مثبت ہی تھی کہ وہ ایک اچھی امید لگائے ہوئے تھے لیکن اسکی تہہ میں حقیقت کوئی نہیں تھی۔ اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مثبت سوچ کے ساتھ حقیقت پسندی کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔

غور کیا جائے تو اسلام اور ایمان کا سارا سفر ہی حقیقت پسندی ہے۔ ایک انسان سب سے پہلے جب کلمہ پڑھتا ہے تو یہ اُس کا اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کا اقرار کرنا ہوتا ہے۔ اس ایمان کا اقرار کرنے کے بعد بھی اُسے عمل کی جہتوں کو درست رکھنے کے لیے قدم قدم پر حقیقت پسند بننا ہوتا ہے۔ اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کی پہلی سورت، سورۃ فاتحہ ہے جسے ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس میں اللہ رب العزت کی چند نمایاں صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد جو اہم ترین دعا سکھائی گئی ہے، وہ یہ ہے۔

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ. (۲۷)

”چاہے سیدھے راستے پر۔“

یہاں سیدھے راستے سے مراد حقیقت پسندی والا راستہ ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط اور گمراہیوں سے پاک ہو۔ (جیسا کہ اگلی آیات میں اُس کی وضاحت کی گئی) دوسری طرف سورہ بقرہ کے آغاز میں قرآن مجید کا تعارف کراتے ہوئے جو اہم بات بتائی گئی ہے وہ یہ ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (۲۸)

”یہ (قرآن) پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔“

بعض اہل علم کے بقول تو سارا قرآن ہی بندے کی اُس طلب ہدایت کا جواب ہے جو اُس نے سورہ فاتحہ کے اندر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بصورتِ دُعا پیش کی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی کے اندر ہدایت یعنی حقیقت پسندی کی اہمیت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جسے کسی بھی معاملے میں صحیح راستے کی پہچان مل گئی اور وہ اُس پر چل پڑا تو وہ جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے لیکن جو چل ہی غلط راستے پر رہا ہو اُس نے منزل پر کیسے پہنچنا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا (۲۹)

”اے ایمان والو! جب تمہارے پاس فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اُس کی خوب تحقیق کر لیا کرو۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے اہل ایمان کو حکم دیا کہ وہ کسی معاملے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اُس کی اچھی طرح چھان بین کر لیں کہ اُس میں حقیقت کیا ہے اور فسانہ کیا ہے! پھر جب شرح صدر سے کسی نتیجے پر پہنچیں تو پھر عملی قدم اٹھانا چاہیے۔ اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ (۳۰)

”کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ ہر اُس بات کو (بلا تحقیق) بیان کر دے جو وہ سنے۔“

گویا یہاں مومنوں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ کسی بھی سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے نہ مانیں، بلکہ

مختلف ذرائع سے تصدیق کرنے کے بعد جب کسی بات کا ثبوت ہو جائے تو پھر ہی اسے تسلیم کریں اور آگے کسی سے بیان کریں۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ قیمتی ہوتی ہے وہ اتنی ہی نایاب بھی ہوتی ہے۔ یہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ ہدایت کا راستہ ایک ہے تو گمراہی کے راستے ہزار ہیں، جن میں وہ چھپا ہوا ہے۔ حقیقت ایک ہے تو فسانے سو ہیں۔ اس کی طرف اشارہ ہمیں اُس حدیث میں ملتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہؓ کو تمثیل کی زبان میں سمجھانے کے لیے زمین پر ایک میدھی لائن کھینچی اور پھر اسکے دائیں بائیں چند چھوٹی چھوٹی لائیں کھینچ کر بتایا کہ یہ (درمیان والی لائن) خدا کا راستہ ہے اور یہ (بقیہ لائیں) گمراہی کے راستے ہیں جو خدا کے راستے سے ملے ہوئے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ ہدایت (حقیقت) کا راستہ ایک ہی ہے لیکن گمراہی کے راستے بہت سے ہیں اور یہ صورت حال زندگی کے تقریباً تمام معاملات میں ہے۔ اب یہ انسان کی طلب، ہمت، جستجو اور جذبے کی صداقت پر منحصر ہے کہ وہ ہر معاملے میں گہرے غور و فکر کے ذریعے سو پر دوں کے اندر چھپی ہوئی حقیقت کو تلاش کر لے اور پھر اسے اپنی زندگی میں شامل کر لے۔ وہ حقیقت سے کمتر درجے کی کسی چیز کو قبول کرنے پر مطمئن اور آمادہ نہ ہو سکے۔

کسی بھی چیز اور کسی بھی معاملے کو دیکھنے کی کئی جہتیں ہوتی ہیں جب تک انسان صحیح جہت سے نہ دیکھے تب تک وہ حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا اور اُس چیز یا معاملے کی اصلیت کو نہیں جان سکتا۔ اس کی مثال کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ہم اپنی آنکھوں پر کسی خاص رنگ کی عینک لگا لیتے ہیں تو پھر وہ چیز ہمیں اپنے اصلی رنگ کی بجائے اسی رنگ میں دکھائی دیتی ہے جس رنگ کی عینک لگائی گئی ہو، یہی حال ذہن کا ہے جب ہم کسی معاملے میں اپنے ذہن میں پہلے سے کچھ نظریات قائم کر لیتے ہیں اور پھر متاثر ذہن کیساتھ اسے دیکھتے ہیں، تو پھر ضروری نہیں ہے کہ اُس کے متعلق ہماری رائے صحیح ہو، وہ غلط بھی ہو سکتی ہے پھر غلط رائے سے غلط عمل جنم لیتا ہے اور زندگی گمراہی کے راستے پر چل پڑتی ہے۔

ڈاکٹر نیولین بن جو کہ ایک مغربی دانشور ہیں۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کا اردو ترجمہ ”فلسفہ کامرانی اور کامیاب زندگی کے اصول“ کے نام سے فنکشن ہاؤس پبلشرز نے کیا۔ اس کتاب کے گیارہویں باب میں انہوں نے صحیح فکر تک پہنچنے کے لیے درج ذیل دو چیزیں بیان کی ہیں۔

۱. حقائق اور اطلاعات میں فرق کرنا۔

ii. ضروری اور غیر ضروری یا متعلق اور غیر متعلق حقائق میں فرق کرنا۔ (۳۱)

پہلی بات یعنی حقائق اور اطلاعات میں فرق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ بات جو ہمارے کانوں میں پرے ضروری نہیں ہے کہ وہ حقیقت بھی ہو اور لازماً صحیح ہو وہ غلط اور خلاف حقیقت ہو سکتی ہے۔ لہذا آدمی کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ ہر بات سوچ سمجھ کر اور حقائق کی کسوٹی پر پرکھ کر جب اس کا مطابق حقیقت ہونا جان لے پھر ہی اسے قبول کرے ورنہ رد کر دے۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ وہی بات ہے جو اوپر قرآن مجید کی آیت اور حدیث مبارکہ کے حوالے سے اوپر بیان کی گئی ہے کہ کسی بھی بات کو سننے کے بعد جب تک قابل اعتماد ذرائع (جن میں انسان کی اپنی فکر اور سوچ بچار بھی شامل ہے اور دیگر بیرونی مستند ذرائع بھی ہو سکتے ہیں) سے اس کی تصدیق نہ کر لی جائے اس وقت تک اسے قبول نہیں کرنا چاہیے، نہ اسے اپنی نظر یہ بنا کر اس پر عمل کرنا چاہیے اور نہ ہی اسے آگے بیان کرنا چاہیے۔

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے یعنی ضروری اور غیر ضروری حقائق / متعلق اور غیر متعلق حقائق میں فرق کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقتیں اگرچہ اپنی ذات میں کائناتی اور آفاقی ہوتی ہیں جن کو قبول کرنا ہر کسی کے لیے لازم ہوتا ہے لیکن ہر حقیقت پر ہر شخص کے لیے ہر قسم کے حالات میں یکساں طور پر عمل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز حقیقت ہونے کے باوجود ایک شخص کے حسب حال نہیں ہوتی لہذا اس پر من و عن عمل کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اسی کو یہاں غیر ضروری یا غیر متعلق حقائق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کسی معاملے میں درست فکر تک پہنچنے کے لیے اس نکتے کو ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کی وضاحت چند مثالوں سے کی جاتی ہے۔

(i) مکی دور میں مسلمان تیرہ سال تک کفار کے ظلم و ستم برداشت کرتے رہے لیکن اللہ رب العزت کی طرف سے اس صورت حال کے ازالے کے لیے جہاد کا حکم فرض نہ کیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ مسلمان تعداد میں اتنے کم تھے کہ ان کے لیے کفار مکہ سے نکرانا ممکن ہی نہ تھا اور اللہ رب العزت کا اصول یہ ہے کہ وہ کسی بھی وجود پر اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا۔ چنانچہ اگر اس دور میں جہاد فرض کر دیا جاتا تو کافروں سے نکرانے کی صورت میں زیادہ نقصان خود مسلمانوں کا ہی ہوتا۔ لہذا خاموشی کے ساتھ تمام ایذا رسانیوں کو برداشت کیا گیا۔ لیکن مدنی دور میں جب مسلمان بدل لینے کی پوزیشن میں آ گئے

تو جہاد اور قتال کی آیتیں اترنے لگیں۔ اب اگرچہ وہ ساری آیتیں جو جہاد کے حوالے سے اتریں، قرآن مجید کا حصہ ہیں لیکن اگر کسی علاقے میں مسلمان کافروں کے مقابلے میں محدود تعداد میں ہوں اور کمزور ہوں تو اُن سے جہاد والی آیتوں پر عمل کا تقاضا نہیں ہوگا۔

(ii) حضور نبی اکرم ﷺ دُنیا کے اندر عقیدہ توحید کو پھیلانے اور شرک کو مٹانے کے لیے تشریف لائے۔ لیکن تیرہ سال تک کعبہ کے صحن میں خود ساختہ بتوں کی صورت میں جھوٹے خدا موجود رہے اور اُن کی عبادت بھی ہوتی رہی۔ حضور ﷺ نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس صورتِ حال کو برداشت کیا اور اس حوالے سے کسی قسم کا عملی قدم اٹھانے سے گریز کیا۔ اس کی وجہ بھی مسلمانوں کی تعداد کا قلیل ہونا اور کافروں کے مقابلے میں کمزور ہونا تھی۔ لیکن فتح مکہ والے دن جب مسلمان غالب آگئے تو کعبہ کو بتوں سے مکمل طور پر پاک کر دیا گیا۔ یہ واقعہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ہر حقیقت ہر وقت اور ہر جگہ لاگو نہیں ہو سکتی۔

(iii) حضور نبی اکرم ﷺ کا بوڑھے آدمی کو روزے کی حالت میں بیوی کا بوسہ لینے کی اجازت دینا جبکہ جوان آدمی کو روک دینا بھی اسی اصول کی ایک مثال ہے۔ جوان آدمی جذبات کی رو میں بہہ کر اُس سے اگلا قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔ لیکن بوڑھے کے حوالے سے ایسا خدشہ نہیں تھا۔ چنانچہ دو افراد کے شخصی احوال مختلف ہونے کی بنا پر دونوں کے لیے حکم بھی مختلف ہو گیا۔

(iv) حضور نبی اکرم ﷺ نے جب نختوں سے نیچے تہہ بند لٹکانے والوں کے متعلق وعید بیان فرمائی تو سیدنا صدیق اکبرؓ حاضر خدمت ہو کر عرض کرنے لگے کہ میرا تہہ بند اکثر بے دھیانی میں نختوں سے نیچے چلا جاتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا

لَسْتُ مِنْهُمْ. (۳۲)

”اے ابو بکر! تم اُن میں سے نہیں ہو۔“

مطلب یہ تھا کہ یہ وعید تو اُن لوگوں کے لیے ہے جو تکبر سے ایسا کرتے ہیں۔ تمہارے ہاں تو تکبر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ لہذا تمہارا شمار اُن میں نہیں ہوگا۔

(v) عِلْمُ الْفَقْہِ کے اندر ایک مشہور قاعدہ ہے جو یہ ہے:

لَا يَنْكُرُ تَغْيِيرَ الْأَحْكَامِ بِتَغْيِيرِ الْأَزْمَانِ. (۳۳)

”زمانہ کی تبدیلی کے سبب احکام کی تبدیلی کا انکار نہیں کیا جائے گا۔“

اس قاعدہ کا مفہوم یہ ہے کہ شریعت کے کئی احکام ایسے ہیں جن کا انحصار عرف اور عادت پر ہوتا ہے اور یہ چیزیں زمانہ کے تغیر و تبدل کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ کیونکہ حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی حاجات و ضروریات میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ جس سے عرف اور عادت میں تبدیلی ہوتی ہے اور پھر یہی چیز ایسے احکام کو بدلنے کا سبب بن جاتی ہے جو عرف اور عادت سے متعلق ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ فکری لغزشوں سے بچنے کے لیے کسی معاملے کو صحیح پس منظر میں اور صحیح رخ سے دیکھنا بہت ضروری ہے تاکہ معاملے کی تہہ تک پہنچ کر صحیح نتیجے کو اخذ کیا جاسکے۔

بچپن کے زمانے میں جب انسان کی عقل میں پختگی (Maturity) نہیں ہوتی اور اُس کے اندر صحیح اور غلط میں امتیاز کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہوتی نیز اُس کے پاس علم کی بھی کمی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ حقائق کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہوتا ہے ایسی حالت میں گھر، ماحول اور مدرسے سے ملنے والی تعلیمات کے نتیجے میں کئی قسم کے غلط عقائد اور فاسد نظریات انسان کے ذہن میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور بالغ ہونے تک اُن کو من و عن صحیح اور درست تسلیم کر چکا ہوتا ہے۔ آئندہ کی زندگی میں کئی اہم فیصلے اُن کے زیر اثر کرتے ہوئے وہ غلط طرزِ عمل کا شکار ہو جاتا ہے لیکن اُسے اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ نتیجتاً زندگی کئی قسم کی خامیوں، لغزشوں، گمراہیوں اور حد بندیوں کا شکار ہو کر اپنے حقیقی کمال کو پانے سے محروم رہ جاتی ہے۔

لہذا اپنے مزاج میں حقیقت پسندی کا عنصر شامل کرنے کے حوالے سے ہمارے لیے دو کام کرنا بہت ضروری ہیں۔ پہلا کام تو یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہن کا تجزیہ کریں۔ بچپن سے لے کر آج تک جو کچھ اُس میں آیا ہے، غیر جانبداری سے اُس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر دیکھیں کہ اُس میں سے کون کون سی چیز صحیح ہے اور کون سی غلط۔ کون سی رکھنے کے قابل ہے اور کون سی چھوڑنے کے قابل ہے۔ اور پھر دوسرا کام یہ ہے کہ آئندہ کے لیے اپنے مزاج کو تحقیقی بنائیں۔ جو بات بھی ہمارے سامنے آئے اُسے محض سنتے ہی مان لینے یا سرسری اور سطحی طور پر دیکھ کر اُس کے متعلق کوئی رائے قائم کر لینے کی بجائے اُسکی

گہرائی میں اتر کر صحیح نتیجے تک پہنچنے اور اس کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کریں۔ اسکے ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے رہیں کہ وہ ہمیں ہر معاملے کی اصل صورتِ حال سے آگاہ فرمائے۔

(iii) خود شناسی

زندگی کو مثبت، تعمیری اور صحت مند بنیادوں پر استوار کرنے، شاہراہ کامیابی و کامرانی پر گامزن ہونے اور دنیا و آخرت کی بھلائیاں حاصل کرنے کا تیسرا اصول ”خود شناسی“ ہے۔ ”خود شناسی“ کا مطلب ہے: اپنے آپ کو جاننا، اپنے آپ سے آگاہ ہونا، اپنی ذات کا ادراک حاصل کرنا وغیرہ۔

تمام اولیاء و عرفاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ رب العزت کی معرفت یعنی پہچان حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو جاننا بہت ضروری ہے۔ بالفاظِ دیگر خود شناسی کے بغیر خدا شناسی ممکن ہی نہیں ہے۔ اس حوالے سے ایک مشہور حدیث مبارکہ ہے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ. (۳۴)

”جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔“

اللہ رب العزت نے اس کائنات کے ذرے ذرے میں اپنی قدرت و حکمت کی بے شمار نشانیاں رکھی ہوئی ہیں تاکہ ان نشانیوں پر غور و فکر کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جاسکے۔ یہ نشانیاں انسان کے اندر بھی ہیں اور باہر بھی۔

سَنَرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ. (۳۵)

”ہم عنقریب انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں انکی جانوں میں اور کائنات میں، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ حق وہی (اللہ) ہے۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ. (۳۶)

”اور تمہاری اپنی جانوں میں (بھی اُس کی قدرت کی نشانیاں ہیں) پس تم کیوں نہیں دیکھتے

ہو۔“

کائنات کے بنیادی اجزاء آگ، ہوا، مٹی اور پانی ہیں اور انسان بھی بنیادی طور پر انہی چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے انسان کو کائناتِ اصغر (چھوٹی کائنات) قرار دیا جاتا ہے۔ لہذا خدا شناسی کے سفر کا آغاز خود شناسی سے ہی ہوتا ہے جو کائنات کے عرفان کی منزلوں سے گزرتا ہوا انسان کو خالق کائنات کی معرفت تک پہنچا دیتا ہے۔

ایک طرف تو اللہ رب العزت کی معرفت کو پانے کے لیے خود شناسی اشد ضروری ہے، دوسری طرف زندگی کو صحت مند بنیادوں پر تعمیر کرنے اور زندگی کے بازار میں زندگی کی پوری قیمت وصول کرنے کے لیے بھی اپنے آپ کو جاننا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جب تک کسی چیز کی صحیح معرفت اور پہچان حاصل نہ ہو تب تک اُس کی پوری قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوتا اور جب تک قدر و قیمت کا اندازہ نہ ہو اُس چیز سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ابتدا اپنے وجود سے بھرپور استفادہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو جاننا بہت ضروری ہے۔

خود شناسی ایک سفر ہے جس کی بے شمار جہتیں ہیں۔ یہاں سرف تین جہتوں کے حوالے سے بات درجاری ہے۔ موضوع کی مناسبت سے ان تین جہتوں سے ہی انسان کا اپنے آپ کو جان لینا جانی ہے۔ وہ تین جہتیں یہ ہیں:

(۱) خدا اور انسان کا تعلق (۲) انسان دورہ کائنات کا تعلق

(۳) سفرِ زیست میں انسان کی حیثیت

(۱) خدا اور انسان کا تعلق

اللہ رب العزت نے اس رنگ برنگی کائنات میں بے شمار مخلوقات پیدا کی ہیں جن میں نباتات، جمادات، حیوانات، زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے وغیرہ شامل ہیں۔ مگر تمام انہی روح اور فیاضی روح مخلوقات میں سے انسان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو تعلق ہے وہ کائنات کی کسی اور چیز کے ساتھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے اندر اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی تخلیق کا شاہکار (Master Piece) قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

وَالَّذِينَ وَالزَّيْتُونَ ۝ وَطُورِ سِينِينَ ۝ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي

(۳۷) أَحْسَنُ تَقْوِيمٍ ۝

”قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی۔ اور طور سینا کی۔ اور اس امن والے شہر (مکہ) کی۔ بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔“

یہاں چار قسمیں کھانے کے بعد جو بات بتائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی تخلیق بہترین اور منفرد انداز میں کی گئی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ظاہری و باطنی خاص تعلق قائم کیا جو دوسری کسی بھی مخلوق سے نہیں ہے۔ چنانچہ انسان کے ساتھ اپنی خصوصی باطنی نسبت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

(۳۸) وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي.

”اور میں نے اس میں اپنی رُوح پھونکی۔“

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو رُوح پھونکی اُس کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ لیکن انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کے اندر پھونکی جانے والی رُوح کی نسبت اپنی طرف نہیں فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دیگر مخلوقات میں پھونکی جانے والی رُوح عام ہے مگر وہ رُوح جو انسان میں پھونکی گئی وہ عام نہیں ہے بلکہ اُس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے۔ یہ تو باطنی نسبت تھی اس کے ساتھ ساتھ اُس کے ساتھ ظاہری نسبت قائم فرمائی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ظاہری نسبت اور مشابہت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

(۳۹) إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ.

”بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔“

اور ان سب پر مستزاد یہ کہ دنیا میں انسان کو اپنی خلافت و نیابت کے منصب پر فائز فرمایا۔ سمجھنے والی بات یہ ہے کہ جو کسی کا نائب اور جانشین ہوتا ہے تو اُس کے اندر اصل کے اختیارات کی جھلک کسی نہ کسی درجے میں دکھائی دیتی ہے، اس اعتبار سے انسان کے اندر بھی خدا کا خلیفہ ہونے کے ناطے سے کسی نہ کسی درجے میں خدائی اوصاف کی جھلک دکھائی دینی چاہیے۔

علامہ اقبالؒ نے انسان کے اسی مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے (۳۰)

دوسرے مقام پر فرمایا۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تہنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سماں بھی ہے (۳۱)

مندرجہ بالا حقائق پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ وجود جسے انسان کہا جاتا ہے وہ کوئی معمولی وجود نہیں ہے بلکہ اس کائنات کی انمول ترین چیز ہے جس کی قدر کرنی چاہیے اور بھرپور طریقے سے اسے اعلیٰ درجے کے استعمال میں لانا چاہیے۔

(۲) انسان اور کائنات کا تعلق

خود شناسی کے ضمن میں دوسری اہم بات جاننے والی یہ ہے کہ انسان اور کائنات کا تعلق کیا ہے؟ اس حوالے سے جان لینا چاہیے کہ کائنات اور اس کی تمام اشیاء انسان کے لیے ہی بنائی گئی ہیں۔ اور صرف بنائی ہی نہیں گئیں بلکہ انسان کے لیے مسخر بھی کر دی گئی ہیں یعنی انسان کے قابو میں دے دی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے حسبِ منشاء کام لے کر اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ گویا انسان کے علاوہ اس کائنات میں جو کچھ بھی دکھائی دے رہا ہے وہ صرف انسان کے لیے ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے (۳۲)

دنیا کو اگر ایک سٹیج فرض کر لیا جائے تو انسان اس سٹیج کا ہیرو ہے اور باقی ساری چیزیں مختلف کردار ہیں جو ہیرو کے گرد گھوم رہے ہیں۔ سارے سکرپٹ (Script) کا مرکزی کردار انسان ہی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ

❖ کائنات خادم ہے اور انسان مخدوم ❖

- کائنات طالب ہے اور انسان مطلوب
- کائنات قاصد ہے اور انسان مقصود

اس بات کو یوں ہی سمجھا جا سکتا ہے کہ کائنات سواری ہے اور انسان سوار۔ سواری سوار کے لیے ہوتی ہے نہ کہ سوار سواری کے لیے۔ چنانچہ کائنات کی ساری چیزیں انسان کی سواری ہیں۔ یہ اس لیے نہیں ہیں کہ انسان ان کو اپنے سر پر سوار کر لے۔ اس سے بڑا ظلم انسانی زندگی میں اور کیا ہو سکتا ہے کہ جن چیزوں کا مقصود انسان تھا ان کو خود انسان نے اپنا مطلوب و مقصود بنا کر ان کی پوجا شروع کر دی۔ عربی زبان میں ظلم کی تعریف یہی کی گئی ہے کہ کسی چیز کو اُس کے حقیقی مقام سے اٹھا کر کسی اور جگہ پر رکھ دینا۔

الظلم وضع الشيء في غير محله. (۴۳)

”ظلم یہ ہے کہ کسی چیز کو اُس کے مقام کے علاوہ کسی اور جگہ رکھنا۔“

وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے اس لیے بنائی تھیں کہ انسان اُن کو باوقار طریقے سے استعمال میں لاکر اپنی زندگی کے سفر کو خوشگوار بنائے اور اپنے مقصدِ حیات کی طرف رواں دواں رہے، وہی چیزیں آج ہمارے پاؤں کی زنجیریں بن چکی ہیں اور ہمیں ہمارے اصلی مقام کی طرف بڑھنے نہیں دے رہیں۔ حضرت واسف علی و اسف اتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”لوگوں نے سامان کو پکڑ رکھا ہے اور سامان نے لوگوں کو“ (۴۴)

یہ سب کچھ جہالت اور لاعلمی سے ہوتا ہے۔ انسان کے اندر جب اپنے مقام اور مرتبے کا شعور بیدار ہوتا ہے تو ان چیزوں کی وہ اہمیت زندگی میں نہیں رہ جاتی جو پہلے تھی۔ داناؤں کا کہنا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو پہچان لے وہ اللہ سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور جو شخص دنیا کو پہچان لے وہ دنیا سے نفرت کیے بغیر نہیں کہہ سکتا۔ ایک طرف تو اپنے مقام و مرتبے سے لاعلمی اور دوسری طرف دنیا کی چیزوں کی حقیقت اور اصلیت سے لاعلمی ہے جو ہمیں دنیا کے ان کھلونوں کیساتھ کھینے پر مجبور کر رہی ہے۔ اسکی مثال اس طرح ہے جیسے ایک بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو وہ بڑے شوق کے ساتھ کھلونوں سے کھیلتا ہے اور انہیں اپنی کل کائنات اور اصل پونجی سمجھتا ہے لیکن جوان ہونے کے بعد اُسے اپنے مقام و مرتبے سے آگہی اور کھلونوں کی حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے تو پھر اُن کی جانب متوجہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسان کا شعور جب پروان (Develop) چڑھتا ہے تو پھر اُس کے بعد دنیا کی ظاہری چیزوں اور ساز و سامان کی وہ اہمیت

اس کی نظروں میں نہیں رو جاتی جو پہلے تھی۔ قرآن مجید لوگوں کو دنیا کی حیثیت سے باخبر کرنے کے لیے جا بجا دنیا کی زندگی کی حقیقت کو ان پر آشکار کرتا ہے۔

وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۴۵)

”اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور تماشہ۔ اور آخرت کا گھر ہی اصل زندگی کی جگہ ہے۔ کاش کہ وہ لوگ جانتے۔“

فَأَلْهَمْنَا سَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ وَمِنْ مَجْدِ رَبِّكَ بَاطِنًا وَالسُّبْحَانَ لِلَّهِ أَكْبَرُ مَا نَعْبُدُهُ إِنَّكَ تَعْلَمُ الْغُيُوبَ (۴۶)

”کہہ دیا ہم تم کو بتادیں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ضائع ہو گئی اور وہ سمجھتے رہے کہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔“

لہذا انسان اور کائنات کے تعلق کے حوالے سے یہ بات جان لینی چاہیے کہ کائنات اور اس کے جملہ لوازمات انسان کے لیے زندگی کے سفر کو ممکن، آسان اور خوشگوار بنانے کے لیے زاہد راہ کے طور پر ہیں۔ انہیں زاہد راہ کے طور پر ہی لینا چاہیے، منزل نہیں بنالینا چاہیے۔

(۳) سفرِ زیست میں انسان کی حیثیت

تیسری بات جاننے والی یہ ہے کہ زندگی کے سفر میں انسان کی حیثیت گاڑی کے ڈرائیور کی ہے نہ کہ سواری کی، جو ڈرائیور کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کارگاہِ حیات میں فاعل بنا کر بھیجا ہے نہ کہ مفعول۔ اسے دنیا کی صورت گری کرنا ہے نہ کہ دنیا کے سانچے میں ڈھلنا ہے۔ اسے حالات کا رخ موڑنا ہے نہ کہ حالات کے دھارے میں بے بس تلوں کی مانند بہنا ہے۔ اسے تاریخ کا عامل بننا ہے نہ کہ وہ معمول بن کر رہ جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک طرف تو اس کے اپنے وجود کے اندر تمام ضروری طاقتیں، صلاحیتیں اور استعدادیں رکھ دی ہیں اور دوسری طرف باہر کی کائنات کو اس کے لیے حد درجہ موافق بنا دیا گیا ہے۔ اب انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت کو جانے اور اسے اپنے

اس مقام و مرتبے کا شعور حاصل ہو، ورنہ وہ لاعلمی کے اندر ہی مارا جائے گا اور حالات کی صورت گزی کرنے کی بجائے حالات کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ جائے گا۔

انگریزی زبان میں ایک مقولہ ہے۔

Some people drive the situation and some driven by the situation.

”کچھ لوگ حالات کو کنٹرول کرتے ہیں اور کچھ لوگوں کو حالات کنٹرول کرتے ہیں۔“

قرآن مجید نے جگہ جگہ انسان کے اندر اس ذمہ داری کا احساس اُجاگر کیا ہے اور اُسے بتایا ہے کہ وہ اپنے اچھے بُرے اعمال کا خود ہی ذمہ دار ہے، کوئی اور نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِۦٓ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (۴۷)

”جس شخص نے اچھے عمل کیے تو وہ اُس کے اپنے ہی لیے ہیں اور جس نے برائی کو تو اُس کا وبال بھی اُسی پر ہے اور تمہارا رب بندوں کے ساتھ ظلم نہیں کرتا۔“

دوسرے مقام پر فرمایا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ. (۴۸)

”اُس (برئیس) کے لیے بدلہ ہے جو اُس نے (نیک عمل) کمایا اور اُسی کے اوپر (وبال) ہے جو اُس نے (گناہ) کمایا۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ. (۴۹)

”اور جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی (کا بدلہ) ہے۔“

اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس بات کو جاننے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں کہ وہ اپنی زندگی کے اور اپنے اچھے بُرے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی اصلاح کرنے اور اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے صحیح خطوط پر جہد و جہد کرنے کی بجائے ماحول اور معاشرہ کو الزام دیتے رہتے ہیں اور زندگی کو ضائع کرتے چلے جاتے ہیں۔ پھر بہت سارے لوگ اپنے حالات کو درست

کرنے کے لیے کسی مسیحا کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور اس طرح وقت ضائع ہوتا رہتا ہے۔ داناؤں کا قول ہے۔

”عقلند آدمی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہیں۔“ (۵۰)

اسکا مطلب یہ ہے کہ ایک عقلند آدمی ہمیشہ اپنے وجود اور اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرتا ہے، نہ کہ بیرونی حالات کی سازگاری کو دیکھتا ہے۔ جب تک انسان اس بات کو جان اور مان نہیں لیتا کہ وہ اپنے اچھے بُرے اعمال کا خود ہی ذمہ دار ہے اور اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کرنا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ تب تک وہ قسمت، ماحول، معاشرہ وغیرہ کو الزام دیتا رہے گا جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کبھی بھی اُس کے اعمال اور حالات بہتر نہیں ہوں گے اور وہ دنیا کی سٹیج پر اپنا کردار ادا نہیں کر سکے گا۔ بیسویں صدی میں علم نفسیات کی ایک اہم دریافت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی اور حالات کا ذمہ دار خود ہی ہے اور وہ خود ہی اُسے بدلنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اپنے آپ کو بدلنے کے لیے جس واحد چیز کی ضرورت ہے وہ ہے ایک مصمم ارادہ جو قدرت نے ہر انسان کے اندر رکھا ہے یہ الگ بات ہے کہ کوئی اُسے استعمال کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ محض خواہش اور تمنا سے حالات نہیں بدلا کرتے۔ یہ ارادہ ہے جو سیلاب بن کر حالات کا رخ موڑ دیتا ہے اور اپنے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو بہالے جاتا ہے اور ارادے کے پیچھے یہی خود شناسی کا جوہر ہوتا ہے جس کے ذریعے انسان کو یقین اور وثوق ہوتا ہے کہ وہ اپنے حالات کو بدل سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ. (۵۱)

”اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو اُس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلے۔“

مولانا ظفر علی خاں نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ جو جس کو خود خیال اپنی حالت کے بدلنے کا (۵۲)

اور انگریزی زبان میں بھی اسی بات کو یوں کہا گیا ہے۔

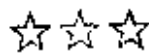
God helps those who help themselves.

”خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرتے ہیں“

چنانچہ انسان مندرجہ بالا تین جہتوں سے اپنے آپ کو پہچان لے تو اُمید واثق ہے کہ اُسے اپنی زندگی کی قدر و منزلت اور اپنے مقام و مرتبہ کا شعور حاصل ہو جائے گا جس کے نتیجے میں زندگی پست جذبات کی تسکین، سُفلی خواہشات کی تکمیل اور منصبِ انسانیت سے گرے ہوئے اعمال و افعال میں مشغول ہونے کی بجائے اعلیٰ و ارفع مقاصد کے حصول کے لیے مصروف عمل ہو جائے گی۔ (انشاء اللہ العزیز)

خلاصہ کلام

انسانی زندگی بہت ہی قیمتی ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ ہر انسان کو زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور اسی زندگی کے اوپر اگلی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی (Inclless Life) کے سنورنے اور بگڑنے کا دار و مدار ہے۔ لہذا انسان کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ اس معاملے میں حد درجہ سنجیدہ ہو اور لا پرواہی اور غفلت کا شکار ہو کر اس انتہائی قیمتی موقع کو ضائع کر کے ہمیشہ کے لیے گھاٹے اور خسارے کا خریدار نہ بن جائے۔ اوپر جو تین اصول بیان کیے گئے ہیں، انہیں اگر بار بار پڑھ کر اور ان پر غور و فکر کر کے دل و زبان میں نقش کر لیا جائے اور پھر عمل کے سانچے میں ڈال کر ان پر مداومت اختیار کر لی جائے تو انشاء اللہ العزیز زندگی فکری گمراہیوں سے محفوظ ہو کر کامیابی و کامرانی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گی اور دنیوی زندگی کے خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ آخرت کی سعادتیں اور بھلائیاں بھی حاصل ہو جائیں گی۔ (انشاء اللہ العزیز)



حواشی

- ۱- میر ولی الدین، ڈاکٹر، قرآن اور تعمیر سیرت، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۲
- ۲- العلق، ۱:۹۶
- ۳- الزمر، ۹:۳۹
- ۳- المجادلہ، ۱۱:۵۸
- ۵- قاطر، ۲۸:۳۵
- ۶- ابن ماجہ، السنن، رقم: ۲۲۳، ۸۱/۱
- ۷- حاجی خلیفہ مصطفیٰ بن عبداللہ الحنفی - کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون - دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ، ۵۱/۱
- ۸- ابن ماجہ، السنن، رقم: ۲۵۰، ۹۲/۱
- ۹- یس، ۳۶:۳۶
- ۱۰- تعمیر حیات، ص ۱۱
- ۱۱- وحید الدین خاں، مولانا، کتاب زندگی، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱
- ۱۲- How To Stop Worrying And Start Living; p83 Dale Carnegie.
- ۱۳- الزمر، ۵۳:۳۹
- ۱۴- البقرہ، ۱۸۵:۴
- ۱۵- الرحمن، ۱۶:۵۵
- ۱۶- النحل، ۱۱۳:۱۶
- ۱۷- ابراہیم، ۷:۱۴
- ۱۸- الزمر، ۱۰:۳۹
- ۱۹- البقرہ، ۱۵۳:۴
- ۲۰- مسلم، الصحیح، رقم: ۱۷۳۲، ۳/۱۲۵۸

- ۲۱۔ بخاری، الصحیح، رقم: ۵۰۶۱۲۵، ۲۲۸۰/۵
- ۲۲۔ مسلم، الصحیح، رقم: ۲، ۱۳۶۹، ۱۰۹۱/۲
- ۲۳۔ حاکم، المستدرک علی الصحیحین، رقم: ۱، ۱۸۱۷، ۶۷۰/۱
- ۲۴۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم: ۳، ۷۶۹۹، ۳۵۶/۳
- ۲۵۔ مناوی، عبدالرؤف بن تاج العارفین بن علی بن زین العابدین (۹۵۲-۱۰۳۱ھ / ۱۵۳۵-۱۶۲۱ء)۔ فیض القدریہ شرح الجامع الصغیر۔ مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر، ۱۳۵۶ھ، ۳/۳۸۵
- ۲۶۔ البقرہ، ۲: ۸۰
- ۲۷۔ النبی، ۵۱
- ۲۸۔ البقرہ، ۲: ۲۰۳
- ۲۹۔ الحجرات، ۶: ۴۹
- ۳۰۔ مسلم، الصحیح، رقم: ۱، ۱۰/۱، ۵
- ۳۱۔ نیولین بل، ڈاکٹر، فلسفہ کمرانی اور کامیاب زندگی کے اصول (مترجم)، کلشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۸۱
- ۳۲۔ بخاری، الصحیح، رقم: ۵، ۵۷۱۵، ۲۲۵۲/۵
- ۳۳۔ سخا لوی، محمد انور، ابو العرفان، فقہ حنفی کے اساسی قواعد، مکتبہ زاویہ، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۶۶
- ۳۴۔ ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح، ۱، ۲۳۶/۱
- ۳۵۔ فتح البیہود، ۵۳: ۴۱
- ۳۶۔ الذاریات، ۲۱: ۵۱
- ۳۷۔ آئین، ۱: ۹۵
- ۳۸۔ الحج، ۲۹: ۱۵
- ۳۹۔ مسلم، الصحیح، رقم: ۳، ۲۶۱۴، ۳۰۱۷/۳
- ۴۰۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۹۹
- ۴۱۔ ایضاً، ص ۲۲۰
- ۴۲۔ ایضاً، ص ۳۷۹
- ۴۳۔ اسفہانی، ابو قاسم حسین بن محمد راغب (م ۵۵۰۲)۔ المفردات۔ دار المعرفۃ، لبنان، ص: ۳۱۵

۴۴۔ واصف، واصف علی، بات سے بات، ص ۵۵

۴۵۔ العنکبوت، ۲۳:۲۹

۴۶۔ الکہف، ۱۲:۱۳:۱۸

۴۷۔ خم السجدہ، ۳۶:۳۲

۴۸۔ البقرہ، ۲۸۶:۲

۴۹۔ الشوریٰ، ۳۰:۳۲

۵۰۔ قرآن اور تعمیر سیرت، ص ۱۵۷

۵۱۔ الرعد، ۱۱:۱۳

۵۲۔ ظفر علی خان، مولانا کلیات۔ ص ۱۸۲

عملی گمراہیوں کا علاج

اللہ رب العزت اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اس نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے اس میں انواع و اقسام کی مخلوقات اور بیشمار حسین و جمیل نظارے پیدا فرمائے ہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات، سورج، چاند، ستارے اور دیگر بے شمار مظاہر فطرت خالق کی صنائی کا پتہ دے رہے ہیں اور ہر رنگ کے اندر اسی کے رنگ اور ہر جلوے کے اندر اسی کے جلوے چھلکتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں تاہم مخلوقات کی جملہ اقسام میں سے انسان وہ منفرد مخلوق ہے جسے اللہ رب العزت نے خاص اہمیت و حیثیت اور مقام و مرتبہ سے نواز کر کائنات میں بھیجا ہے۔

کائنات کو اگر ایک شیخ فرض کر لیا جائے تو انسان اس شیخ کا ہیرو ہے جس کے گرد بقیہ سارے کردار گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود ہے اور بقیہ ساری کائنات کی بزم انسان ہی کے لیے بنائی اور سجائی گئی ہے۔ قرآن مجید میں بہت ساری آیات اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جن کا ذکر سابقہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ساری کائنات کا مقصود انسان ہے اور انسان کو دیگر تمام مخلوقات کے مقابلے میں نمایاں حیثیت و فضیلت دی گئی ہے۔ تو خود انسان کا مقصود کیا ہے اور اسے کس لیے تخلیق فرمایا اور دنیا میں بھیجا گیا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. (۱)

"اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے تخلیق کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔"

روح المعانی میں ليعبدون کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے

أَيْ لِيَعْرِفُونِ. (۲)

"یعنی تاکہ وہ میری معرفت حاصل کریں۔"

پھر اس عبادت و معرفت کا مقصود بقول قرآن مجید انسان کا خدائی اخلاق و صفات کو پہچان کر اپنے آپ کو ان سے متصف کر لینا ہے۔

صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً (۳)

”اللہ کا رنگ (اپنانا چاہیے) اور اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ اور کون سا ہو سکتا ہے۔“

یہاں اللہ کے رنگ کی تشریح کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا۔

تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ (۴)

”اپنے آپ کو اللہ کے اخلاق سے متصف کر لو۔“

پھر اخلاق البیہ کا سب سے کامل عملی نمونہ (Role model) حضور ﷺ کی ذات مبارکہ کو قرار دیا گیا اور خود حضور ﷺ نے اخلاق حسنہ کی تکمیل کو اپنی بعثت مبارکہ کا مقصد قرار دیتے ہوئے فرمایا:

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ (۵)

”بے شک میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔“

گویا حضور ﷺ کی تشریف آوری کا مقصد ہی لوگوں کی شخصیتوں کو اچھے اخلاق سے آراستہ و پیراستہ کرنا ہے۔ قرآن مجید میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا۔

مندرجہ بالا ساری گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں ایک خاص مدت کے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ وہ یہاں رہ کر ایمان اور اعمال صالح کی روش کو اپنا کر اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کرے اور اسے اخلاق حسنہ سے آراستہ و پیراستہ کرے تاکہ وہ مرنے کے بعد جنت کی انتہائی نفیس و لطیف فضاؤں میں بسنے کے قابل ہو سکے۔ تمام انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا۔ اسلام کے دامن میں جتنی بھی عبادتیں ہیں ان سب کا مقصد بھی یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام عبادت کے ساتھ ساتھ اخلاق پر زور دیتا ہے بلکہ دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے ایک کی عدم موجودگی میں دوسرے کی موجودگی کو ناقص خیال کرتا ہے۔

سطور بالا سے جب یہ چیز واضح ہو گئی کہ انسان دنیا میں اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے لیے آیا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت جو انسان کا خالق و مالک ہے اور حد درجہ مہربان بھی ہے اور

نے یقیناً انسان کو اس مقصد کے لیے تمام ضروری لوازمات دے کر بھیجا ہے اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دن سے ہی انسان فطرت میں اقرارِ الوہیت کی صورت میں تمام حسنا ت کے حصول کے بیج رکھ دیئے ہیں۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ
أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ (۶)

"اور جب تیرے رب نے آدم کی اولاد کو ان کی پشت سے نکالا اور انہیں ان کے نفوس پر گواہ بنایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں وہ بولے کیوں نہیں (تو ہمارا رب ہے)۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی باقاعدہ جسمانی تخلیق سے بھی پہلے اس کی روح اللہ رب العزت کی ربوبیت اور اس کے خالق و مالک ہونے کا اعتراف کر چکی ہے۔ دوسری طرف حضور ﷺ نے فرمایا:

كل مولود يولد على الفطرة (۷)

"ہر بچہ فطرت (سلیمہ) پر پیدا ہوتا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اللہ رب العزت نے یہ فرمایا کہ عقل کی صورت میں اسے ایک قیمتی جوہر سے نوازا جو حقائق کا تجزیہ کر کے نتائج کو اخذ کر سکتی ہے اور کھونے کو کھرے سے جدا کر سکتی ہے۔ پھر عقل کی رہنمائی کے لیے وحی کی روشنی مہیا فرمادی تاکہ عقل کے لیے بھٹکنے کے امکانات ختم ہو جائیں۔ چنانچہ ہر زمانے میں انبیاء و رسل دنیا میں تشریف لاتے رہے اور لوگوں کو خدائی تعلیمات سے آشنا کرتے ہوئے انہیں اللہ رب العزت کی مرضی سے آگاہ فرماتے رہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے متعلق فرمایا گیا کہ

إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (۸)

"بے شک یہ ایک یاد دہانی ہے پس جس کا دل چاہے (اس کے ذریعے سے) اپنے رب تک پہنچنے کا راستہ پالے۔"

سوال یہ ہے کہ جب سب کچھ واضح ہے تو پھر انسان بار بار کیوں بہک جاتا ہے اور لوگوں کی اکثریت تعمیر کو چھوڑ کر تخریب کی طرف کیوں چل پڑتی ہے؟ اس کے جواب میں بہت سی باتیں کہی جاسکتی

ہیں۔ لیکن بڑی وجوہات دو ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ علم کی کمی

۲۔ ضبط نفس کا فقدان

بہت مرتبہ لوگوں کی گمراہیوں کی وجہ علم صحیح کا نہ ہونا ہے یعنی انہیں علم نہیں ہوتا کہ فلاں معاملے میں کون سی روش درست ہے اور کون سی غلط؟ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز؟ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟ علم کے اس فقدان کی وجہ سے بیشتر لوگ فکری گمراہیوں اور لغزشوں کا شکار ہو کر نفس اور شیطان کی پیروی کرتے ہوئے غلط راستے پر چل پڑتے ہیں اور اپنی شخصیت کو مسخ کر لیتے ہیں۔ اس کا حل گذشتہ فصل میں دیئے گئے صحیح فکر کے اصولوں کو اپنانا ہے۔ اس لائحہ عمل کو اپنانے کے نتیجے میں انسان بہت ساری فکری گمراہیوں اور لغزشوں سے بچ جاتا ہے اور جب فکر صحیح ہو جائے تو عمل کی بہت ساری جہتیں بھی خود بخود درست ہو جاتی ہیں۔

انسان کے تعمیر کو چھوڑ کر تخریب کے راستوں کی طرف چل پڑنے کی دوسری بڑی وجہ ضبط نفس کا فقدان ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان کے من کی دنیا میں ہر وقت طرح طرح کی تمنائیں، آرزوئیں، خواہشات، رغبتیں، جذبات اور میلانات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں سے کچھ اچھے ہوتے ہیں اور کچھ برے۔ انسان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ عقل اور وحی کی روشنی میں ان تقاضوں کا جائزہ لے لے اور جو صحیح ہوں ان کی تکمیل کے لیے کوشش کرے لیکن جو غلط ہوں ان سے اپنے آپ کو روک لے۔ لیکن مسئلہ یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو غلط تقاضوں کی تکمیل سے روکنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا اپنی طبیعت پر مکمل قبضہ ہو۔ یعنی اس کی طبیعت عقل کے تابع ہوتا کہ عقل وحی سے ملنے والی رہنمائی کی روشنی میں اسے صحیح راستے پر چلا سکے۔ لیکن اگر اس کی طبیعت میں ضبط نہ ہو تو پھر خواہشات اور جذبات کی آندھیاں انسان کو بے بس تنکے کی مانند اڑائے پھرتی ہیں۔ اور وہ اپنے اندرونی تقاضوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہ چاہتے ہوئے بھی بہت سے نہ کرنے والے کاموں کو کرنے اور بہت سے کرنے والے کاموں کو نہ کر سکنے کے معاملے میں اپنے آپ کو بے بس اور مجبور پاتا ہے۔ ضبط نفس کی مثال گھوڑے کی لگام کی سی ہے۔ جو گھوڑا سدھایا ہوا ہو اور اس کی لگام سوار کے ہاتھ میں ہو تو وہ سوار کی مرضی کے مطابق اسے منزل مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔ مگر ضبط نفس سے محروم آدمی کی مثال اس سوار کی سی ہے جو کسی سرکش گھوڑے پر سوار ہو اور اس پر لگام بھی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہاں نہ سوار کی خیر ہے اور نہ

سواری کی۔

بہ نظر غائر دیکھا جائے تو آج کے انسان کا اصل مسئلہ علم کی کمی نہیں ہے بلکہ ضبطِ نفس کی کمی ہے۔ جدید دور کی سہولتوں نے آج مختلف شکلوں میں علم کے اتنے انبار لگا دیئے ہیں کہ علم کسی کی دسترس سے باہر نہیں رہا۔ لیکن جوں جوں علم بڑھتا جا رہا ہے عمل گھٹتا جا رہا ہے اور علم و عمل کے درمیان عدم توازن نے ہی انسانی زندگی کی کوکانٹوں کی تیج بنا دیا ہے۔ بے شمار پریشانیوں، محرومیاں اور بد حالیوں انسانی زندگی میں محض علم اور عمل کے درمیانی فاصلوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں۔ زندگی آوارہ اور پراگندہ ہے اور بیشتر زندگیاں بے سکونی کی صلیب پر لٹکی ہوئی ہیں۔ لہذا آج کے انسان کے ساتھ سب سے بڑی نیکی یہی ہو سکتی ہے کہ اُسے کوئی طریقہ اور لائحہ عمل بتا دیا جائے جس پر چل کر زندگی کی طنائیں اس کے ہاتھ میں آجائیں اور وہ نفس کے سرکش گھوڑے پر بے بس اور مجبور سوار کی بجائے اُسے اپنی مرضی کے مطابق چلا سکے۔ یا بالفاظِ دیگر وہ زندگی کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر خود اپنی منزل اور راستوں کا تعین کر سکے۔

تصوف کی ساری تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں صوفیائے کرام کے ہاں یہی بات مرکزی حیثیت کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ اُن کا سارا زور ہی اسی نکتے پر رہا ہے کہ انسان کو کسی طرح سے اندرونی طور پر اتنا مضبوط بنا دیا جائے کہ وہ اپنے اندرونی جذبات اور خواہشات کے منہ زور ریلے میں بے بس تنکوں کی مانند بننے کی بجائے چٹانوں کی طرح مضبوط اور ثابت قدم رہے۔ اور اپنے اندر پیدا ہونے والی تمام خواہشات، تمناؤں، رغبتوں، چاہتوں، اور ارمانوں کو عقل کے تابع کر کے زندگی کو شریعت کی راہنمائی سے ملنے والی روشنی میں استوار کرے تاکہ وہ دنیا و آخرت کی فلاح اور سعادت کا مستحق بن سکے۔ چنانچہ صوفیائے کرام کے تمام مجاہدات اور ریاضتیں اسی ایک نکتہ کے گرد گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ضبطِ نفس کے حصول کا سہ نکاتی لائحہ عمل

صوفیائے کرام نے اس حوالے سے جو ضابطے تشکیل دیئے اور جتنی کڑی شرائط اور سخت ریاضات و مجاہدات ترتیب دیئے وہ اپنی جگہ بجا ہیں لیکن آج کے دور میں بننے والے انسان کے لیے اُن پر عمل پیرا ہونا تقریباً ناممکن یا کم از کم محال ہے۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک تو اب صحت کا معیار

روہ نہیں رہ گیا جو سخت مجاہدات کا مشتمل ہو سکے اور دوسرا ہمتیں پست ہو چکی ہیں اور آسانی اور سہل پسندی کی طرف مائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ کی احیاء العلوم الدین، حضرت علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف اور دیگر صوفیاء کی کتابیں آج بڑے بڑے علماء کی لائبریریوں کی زینت بنی تو دکھائی دیتی ہیں لیکن عملی زندگی میں ان کا عمل دخل (الاماشاء اللہ) بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ لہذا آج کے ایک عام انسان کو توحیط نفس کا کوئی نسبتاً آسان فارمولہ دینا ہوگا جو اس کے لیے قابل عمل بھی ہو سکے۔ اگلے صفحات اسی مقصد کے لیے مختص کیے جا رہے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ اصول ہمیشہ دائمی ہوتے ہیں۔ ہاں ان کی شکلیں چینیج ہوتی رہتی ہیں۔ بالفاظ دیگر شراب تو وہی پرانی ہے مگر برتن نئے ہیں۔

راقم کے خیال میں اسیویں صدی کے انسان کے لیے ایسا لائحہ عمل جو توحیط نفس کی کیفیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی آوارگیوں کو کم کر کے اُسے مخصوص ڈگر پر ڈال کر عروج کی جانب رواں دواں کر دے مندرجہ ذیل تین چیزوں پر مشتمل ہے۔

(i) ضبطِ طعام (ii) ضبطِ کلام (iii) اقامتِ صلوٰۃ

(i) ضَبْطِ طَعَام

قرآن مجید کے اندر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ انہوں نے کہا:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ. (۹)

"اے ہمارے رب! اور مبعوث فرما ان کے اندر میں سے ہی ایک رسول جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے (انہیں پاک کرے)۔"

یہاں تزکیہ نفس کا لفظ آخر میں آیا لیکن دوسری طرف قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے جب فرائض نبوت کو بیان کیا تو ان میں تلاوت قرآن کے بعد، تزکیہ کو پہلے رکھا اور بقیہ چیزوں کو بعد میں۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ

الکِتَابِ وَالْحِكْمَةِ. (۱۰)

"وہی ہے جس نے امی لوگوں میں ان میں سے ہی رسول بھیجا جو ان پر اُس کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

اس ترتیب میں حکمت یہ ہے کہ بقیہ تعلیمات اُسی وقت نفع بخش ہوتی ہیں جب نفس کا تزکیہ ہو چکا ہو اور وہ اخلاقی رذائل سے نجات پا چکا ہو۔

انسان کی نساری گمراہیوں، بد عملیوں اور سیاہ کاریوں کا بنیادی سبب نفس کی خواہشات و میلانات کی اندھا دھند پیروی ہے، جو انسان کو راہِ حق سے دور کر دیتی ہے اور جس کے نتیجے میں انسان خدا کا بندہ بننے کی بجائے نفس کا بندہ بن جاتا ہے۔ اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا کہ

أَفْرَاءَ يُتُّ مِنَ اتَّخَذَ اللَّهُ هُوَاهُ. (۱۱)

"کیا تو نے ایسے شخص کو دیکھا جس نے اپنے نفس کی خواہشات کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔"

چنانچہ قرآن مجید نے خواہشاتِ نفس کی پیروی سے سختی سے منع فرمایا ہے:

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ. (۱۲)

"پس نفس کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔"

نیز قرآن مجید نے انسان کی سعادت کا دار و مدار نفس کے تزکیہ پر اور اس کی شقاوت کا دار و مدار نفس کے عدم تزکیہ پر رکھا ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا ۝ (۱۳)

"بے شک فلاح پا گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا اور تباہ ہو گیا وہ جس نے اسے گناہوں میں دبا دیا۔"

دوسری طرف یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نفس کی تمام خواہشات و شہوات کی بنیاد انسان کا معدہ ہے۔ جتنا زیادہ انسان معدہ کو رنگ برنگے کھانوں سے بھرتا چلا جائے گا اور وقتاً فوقتاً کھاتا رہے گا

اُتنا ہی زیادہ دیگر خواہشات و شہوات بھی سر اٹھائیں گی اور انسان اپنے آپ کو اُن کے سامنے بے بس محسوس کرے گا۔ اُس کا اپنی ذات پر ضبط ختم ہوتا چلا جائے گا، علم اور عمل کے فاصلے بڑھتے چلے جائیں گے اور وہ اخلاقی رذائل اور کردار کی پستی کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کھانے پینے پر ضبط حاصل کرنا جملہ کامرانیوں کا سرچشمہ اور انسانی سیرت و کردار کی تشکیل کا نکتہ آغاز ہے۔ اور کھانے پینے میں اسراف اور بے اعتدالیاں تمام برائیوں کی جڑ اور سیرت و کردار کے بگاڑ کا نکتہ آغاز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اولیاء و صوفیائے کرام تزکیہ نفس کے لیے مجاہدہ نفس کے عناصر اربعہ میں سب سے پہلا نکتہ قلب طعام کا ہی شامل کرتے رہے ہیں۔ ابوانیس صوفی برکت علیؒ مقالات حکمت میں فرماتے ہیں۔

"باز کی بلندی اور کوئے کی پستی قد و قامت کی بدولت نہیں بلکہ رزق کی بدولت ہے۔" (۱۳)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

اے طائر لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی (۱۵)

نیز فرماتے ہیں۔

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت

فیصلہ تیرا تیرے ہاتھ میں ہے دل یا شکم (۱۶)

کھانے پینے میں حرام اور مشتبہ غذا سے پرہیز تو ضروری ہے ہی کہ یہ جہنم کے انکارے پیٹ میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

إِنَّ الدِّينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا. (۱۷)

"بے شک جو لوگ یتیموں کے مال کو ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ بھر

رہے ہیں۔"

اور حضور ﷺ کا فرمان ہے

كل لحم نبت من السحت فالنار اولیٰ به. (۱۸)

"برودہ گوشت جو حرام سے پروان چڑھے وہ آگ کا زیادہ مستحق ہے۔"

لیکن اس کے ساتھ ساتھ حلال غذا کا بھی ضرورت سے زیادہ کھانا سخت نقصان دہ ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

لا تمیتوا القلب بکثرة الطعام و الشراب فان القلب يموت كالزروع اذا کثر
عليه الماء۔ (۱۹)

"کثرت خورد و نوش سے اپنے قلب کو مردہ مت کریں کیونکہ دل بھی مردہ ہو جاتا ہے جس طرح کھیتی زائد از ضرورت پانی سے ہلاک و برباد ہو جاتی ہے۔"

انسانی افعال و اقوال کی خوبی یا خرابی کا مدار غذا پر ہے۔ حرام غذا کی صورت میں حرام کاموں کی شکل میں نکلے گا۔ کثرتِ طعام کی صورت میں فضولیات سرزد ہوں گی۔ گویا غذا بیج کی مانند ہے اور انسان کے تمام اقوال و افعال اس کا پودا ہیں۔

صوفیائے کرام اس حوالے سے قَلْبِ طعام پر زور دیتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اکیسویں صدی کے اس ماحول میں جبکہ خوراک کے اندر سے غذائیت بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے۔ صحتیں کمزور ہو چکی ہیں اور ہمتیں پست ہو چکی ہیں۔ تمام افعال کو قَلْبِ طعام کا مشورہ دینا تو مشکل ہے البتہ اُسے یہ ضرور کہا جائے گا کہ اگر کردار و شخصیت کی تعمیر کرنی ہے تو پھر کھانے پینے کو کسی نظم و ضبط کا پابند بنانا اور اُسے حد اعتدال میں لانا ضروری ہوگا۔ دوسری طرف یہ خواہش اتنی زیادہ انسان پر مسلط ہے کہ بہت مرتبہ وہ اپنے آپ کو اس خواہش کے سامنے بے بس محسوس کرتا ہے۔ اور وقت بے وقت کھا کر نیز ضرورت سے زیادہ کھا کر اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی صحت کو تباہ کرتا رہتا ہے اور نتیجہً اُس کی سیرت، کردار اور اخلاق و اطوار پر بھی منفی اثرات پڑتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کھانے پینے پر ضبط کیسے حاصل کیا جائے۔ اس حوالے سے تین ضابطے یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔

پہلا ضابطہ

کھانے پینے پر کنٹرول کے لیے اسلام نے جو بے مثال اور تیر بہدف نسخہ دیا ہے وہ روزہ ہے

جس کے متعلق قرآن نے فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ. (۲۰)

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پر ہیبت گار بن جاؤ۔"

یہاں دو باتیں قابل توجہ ہیں ایک تو یہ کہ روزہ ایک ایسی عظیم الشان عبادت ہے جو صرف اُمت محمدیہ پر ہی نہیں بلکہ پہلی اُمتوں پر بھی اللہ رب العزت کی طرف سے لازم کی جاتی رہی ہے، گو اُن کے ہاں مقدار یا کیفیت مختلف ہو سکتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روزوں کا مقصد تقویٰ بیان کیا گیا ہے جو سارے اسلام کی جملہ تعلیمات کا خلاصہ اور نچوڑ ہونے کے ساتھ ساتھ تمام اخلاقِ حسنہ کی بنیاد بھی ہے۔ تقویٰ کے اندر ضبطِ نفس کا مفہوم پائے جانے کے ساتھ ساتھ ضبطِ نفس کے مثبت استعمال کی ضمانت بھی پائی جاتی ہے اور روزہ تقویٰ کے حصول کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے روزہ کی اہمیت بیان فرماتے ہوئے مختلف مواقع پر اس کی ترغیب دی۔

ایک مقام پر نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج فانه اغض للبصر و احصن للفرج و من لم يستطع فعليه بالصوم فان له وجاء. (۲۱)

"اے نوجوانو! تم میں سے جسے نکاح کی توفیق ہو اُسے چاہیے کہ ضرور نکاح کرے کیونکہ نکاح شرم و حیاء اور شرمگاہ کی حفاظت کے لیے سب سے زیادہ مفید ہے اور جس نوجوان کو نکاح کی استطاعت نہ ہو، اُسے لازم ہے کہ وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ جنسی ہیجان کا تدارک کرتا ہے۔"

مندرجہ بالا حدیث کتنے واضح انداز میں بتا رہی ہے کہ نفس کی منہ زور قوتوں کے آگے بند باندھنے اور جذبات کے ریلے میں تنکوں کی مانند بہہ جانے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے روزہ بہترین نسخہ ہے۔

اسلام کے اندر ایک ماہ کے روزے تو فرض ہیں جو بہر صورت (بعض مستثنیات کے ساتھ) ہر

کسی کو رکھنے ہی ہیں اس کے علاوہ نفل روزوں کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ تاکہ لوگ حسبِ ضرورت اس شاندار نسخہ کو ضبطِ نفس کے حصول اور اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے استعمال کر سکیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کے حوالے سے مختلف خاص ایام میں روزے رکھنا کثیر احادیث سے ثابت ہیں۔ نیز آپ نے دوسروں کو بھی ترغیب دی کہ وہ اور دنوں میں روزہ رکھیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

اوصانی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم بثلاث صیام ثلاثة ایام من کل شهر و رکعتی الضحی و ان اوتر قبل ان انا۔ (۲۲)

"مجھے میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں کی وصیت فرمائی ہے۔ ہر مہینے تین روزے رکھنے کی، چاشت کی دو رکعتیں ادا کرنے کی اور اس بات کی کہ میں سونے سے پہلے وتر ادا کر لیا کروں۔"

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يتحرى صیام الاثنين والخمسين۔ (۲۳)

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوموار اور جمعرات کے روزوں کا قصد فرمایا کرتے تھے۔"

اسی حوالے سے حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک اور حدیث یوں مروی ہے کہ

تعرض الاعمال یوم الاثنين والخمسين فاحب ان يعرض عملی وانا صائم۔ (۲۴)

"سوموار اور جمعرات کے دن اعمال پیش کیے جاتے ہیں، اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل پیش کیا جائے تو میں روزے سے ہوں۔"

لہذا خبیثا طعام کا پہلا ضابطہ یہ ہے کہ انسان اپنی عمر، جسمانی صحت، کام کی نوعیت اور موسم کی کیفیت وغیرہ کا لحاظ رکھتے ہوئے نفل روزوں کا نسخہ ضبطِ طعام کے حصول کے لیے اختیار کرے۔

دوسرا ضابطہ

اس حوالے سے دوسری اہم بات ہے دو کھانوں کے درمیان وقفہ رکھنا۔ عام طور پر دن میں تین مرتبہ صبح، دوپہر، شام کھانا کھایا جاتا ہے۔ اس طرح دو کھانوں کے درمیان اوسطاً پانچ چھ گھنٹوں کا

وقفہ بنتا ہے۔ طب کی رو سے بھی ضروری ہے کہ دو کھانوں کے درمیان کم از کم اتنا وقفہ ہونا چاہیے تاکہ دوسرا کھانا کھانے سے پہلے پہلا کھانا اچھی طرح ہضم ہو چکا ہو ورنہ وہ صحت کی خرابی کا باعث بنے گا۔ خود حضور ﷺ نے بھی اس روش کو بیماریوں اور امراض سے حفاظت کا ایک مجرب نسخہ قرار دیا ہے۔

لہذا انسان کو یہ اصول بنانا چاہیے کہ دو کھانوں کے درمیانی وقفوں میں سوائے سادہ پانی کے حتیٰ الوسع کچھ کھانے پینے سے گریز کرے۔ ویسے بھی یہ انسانوں کا کام نہیں ہے کہ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے رہیں۔ ہر وقت جانوروں کی طرح چرتے رہنے سے انسان کی جسمانی، ذہنی اور روحانی حالت پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔

تیسرا ضابطہ

تیسرا ضابطہ یہ ہے کہ کھانے کو بڑے باوقار انداز میں ٹھہر ٹھہر کر اور چبا چبا کر کھایا جائے اس طرح کھانے کی زیادہ مقدار بھی نہیں کھائی جائے گی اور اس طرح کھانے سے جسمانی، ذہنی اور روحانی صحت پر بڑے خوشگوار اثرات بھی پڑتے ہیں۔ تیزی کے ساتھ اور جلدی سے نوالے نگلنے میں نفس اور شیطان کا اثر شامل ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک طرف تو کھانا ضرورت سے زیادہ کھالیا جاتا ہے اور دوسری طرف اسے ہضم کرنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ بندہ مومن کے ہر کام میں وقار ہونا چاہیے اور بالخصوص کھانے پینے کے معاملے میں تو اسے حد درجہ شائستگی اور سیر چشمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

(ii) ضبط کلام

ضبط طعام کے بعد جو دوسری چیز نفس کو راست روی پر قائم رکھنے والی ہے وہ ضبط کلام ہے۔ زبان بظاہر دیکھنے میں تو چھوٹی سی چیز ہے مگر اہمیت کے اعتبار سے بہت بڑی ہے۔ جیسا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جرمہ صغیر و جرمہ کبیر۔ (۲۵)

”اس کا سائز چھوٹا ہے مگر اس کا جرم بڑا ہے۔“

سر سے لے کر پاؤں تک انسانی جسم کے اعضاء کا جائزہ لیا جائے تو نیکیوں کا سب سے بڑا منبع دسر چشمہ بھی یہی زبان ہے کہ اکثر و بیشتر عبادات میں کچھ نہ کچھ پڑھنا بھی ہوتا ہے جس کا تعلق زبان

سے ہے اور دوسری طرف گناہوں کا بھی سب سے بڑا سبب زبان ہی ہے کہ اکثر بڑے بڑے گناہ مثلاً جھوٹ، غیبت، چغلی اور دوسروں کی دل آزاری وغیرہ جیسے جرائم زبان سے ہی سرز ہوتے ہیں۔ اگر بات یہاں تک ہی ہوتی تو تب بھی زبان کی بہت زیادہ اہمیت تھی جسے تعمیر شخصیت کے سفر میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا مگر اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر صورت حال یہ ہے کہ زبان بہت سارے گناہ و صواب کا براہ راست سبب ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر اعضاء کے خیر و شر میں بھی بالواسطہ طور پر ملوث ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اذا اصبح ابن ادم فان الاعضاء كلها تكفر للسان فتقول اتق الله فينا فانما نحن بك فان استقمت استقمنا و ان اعوججت اعوججنا. (۲۶)

"جب ابن آدم صبح کرتا ہے تو جسم کے تمام اعضاء زبان کی خدمت میں (زبان حال سے) درخواست کرتے ہیں پس وہ کہتے ہیں کہ ہمارے معاملے میں خدا سے ڈرنا (کیونکہ ہم تیرے رحم و کرم پر ہیں) پس اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہوگئی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔"

مندرجہ بالا حدیث کتنے واضح اور دو ٹوک انداز میں جسم کی صلاح و فساد کے حوالے سے زبان کی اہمیت کو بیان کر رہی ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا

لا يستقيم ايمان عبد حتى يستقيم قلبه ولا يستقيم قلبه حتى يستقيم لسانه. (۲۷)

"بندے کا ایمان اُس وقت تک سیدھا نہیں ہوتا جب تک اُس کا دل سیدھا نہ ہو اور دل اُس وقت تک سیدھا نہیں ہوتا جب تک اُس کی زبان سیدھی نہ ہو۔"

بڑی اہم بات ہے کہ ایمان کی درستگی کا دار و مدار دل کی راست روی پر ہے اور دل کی راست روی کا دار و مدار زبان کے راست رو ہونے پر ہے۔ گویا ایمان کی اصلاح کا دار و مدار زبان کی حالت پر ہے۔

نہ صرف ایمان بلکہ اعمال کی جہتوں کے درست ہونے کا دار و مدار بھی زبان کے درست استعمال پر ہے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید نے ارشاد فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصَلِّحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

(۲۸) ذُنُوبِكُمْ.

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور زبان سے سیدھی بات کہو۔ وہ تمہارے (آئندہ) اعمال درست کر دے گا اور (سابقہ) گناہوں کو معاف فرما دے گا۔"

یہاں ایک طرف تو تقویٰ کے ساتھ زبان سے سیدھی بات کرنے کا حکم دے کر اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ تقویٰ اور زبان کی راست روی کا گہرا تعلق ہے اور دوسری طرف ان دونوں کے نتیجے میں آئندہ اعمال کی جہتوں کے درست ہونے اور سابقہ گناہوں کی معافی ملنے کی بشارت دی جا رہی ہے۔

اسی مشہور نبی تشریح ہمیں اُس حدیث میں ملتی ہے جس میں حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو مختلف عبادات کے بجالاتے کی نصیحت فرمائی۔ آخر میں فرمایا:

اِنَّ اَخْبَرَكَ بِمَلَاكٍ ذَلِكُ كَلِمَةٍ قُلْتَ بَلِي يَا رَسُولَ اللَّهِ. فَاخْذْ بِلِسَانِهِ قَالَ كَفَّ عَلَيْكَ هَذَا. (۲۹)

"کیا میں تمہیں خبر نہ دوں اُس کی جو ان سب کی جز ہے۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ پس آپ ﷺ نے اپنی زبان پکڑ کر فرمایا اسے روک لے۔"

مذکورہ بالا حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ تمام عبادات کی درستگی اور اُن پر دوام کا دارو مدار زبان کی حفاظت پر ہے۔ اس کی وضاحت دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضور ﷺ نے حضرت ابو ذر غفاریؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا

عَلَيْكَ بِطَوْلِ الصَّمْتِ فَانَّهُ مَطْرَدَةٌ لِلشَّيْطَانِ وَ عَوْنُ لِكِ عَلِيٍّ اَمْرٍ دِينِكَ. (۳۰)

"تمہارے اوپر طویل خاموشی کو اختیار کرنا لازم ہے۔ پس بے شک یہ شیطان کو بھگانے والی اور تیرے دینی کاموں میں معاون ہے۔"

حضور ﷺ نے زبان کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ایک اور مقام پر فرمایا کہ

اِنَّ الْعَبْدَ يَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مَا يَتَّبِعُ فِيهَا يَزُلُّ بِهَا فِي النَّارِ اَبْعَدَمَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ. (۳۱)

"بے شک کبھی (ایسا ہوتا ہے کہ) بندہ ایک کلمہ زبان سے نکالتا ہے جو اُس پر واضح نہیں ہوتا (یعنی بے دھیانی میں کوئی جملہ بول دیتا ہے) اُس کی وجہ سے وہ جہنم میں اتنی مسافت سے گرے گا جو شرق اور مغرب کے درمیانی فاصلے سے بھی زیادہ ہے۔"

سوچنے والی بات یہ ہے کہ جب لا پرواہی سے زبان سے نکالا جانے والا ایک جملہ اتنا خطرناک ہو سکتا ہے تو پھر زبان کے استعمال میں کس قدر احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ

من كان يو من بالله واليوم الآخر فليقل خيراً أو ليصمت. (۳۲)

"جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر یقین رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ اچھی بات کرے یا خاموش رہے۔"

یہاں جو اصول دیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ جھوٹ، غیبت، چغلی، وعدہ خلافی، گالی گلوچ وغیرہ جیسے کبیرہ جرائم زبان سے سرزد ہوتے ہیں ان سے تو بچنا لازم ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ فضول مباح باتوں سے بھی پرہیز کرنا لازم ہے۔

فضول اور لغو باتوں سے پرہیز کیوں ضروری ہے؟ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے حضور ﷺ

نے فرمایا:

لا تكثر و الكلام بغير ذكر الله فان كثرة الكلام بغير ذكر الله قسوة للقلب وان ابعد الناس من الله القلب القاسى. (۳۳)

"اللہ کے ذکر کے علاوہ دیگر باتوں کی کثرت نہ کیا کرو۔ کیونکہ ذکر کے سوا دوسری باتوں کی کثرت دل کو سخت کر دیتی ہے اور اللہ سے زیادہ دور بھی وہی دل ہے جو زیادہ سخت ہو۔"

لہذا جو شخص بھی اپنے آپ کو اخلاقِ حسنہ سے آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتا ہو اور شخصیت و کردار کو تعمیر کرنا چاہتا ہو۔ نیز اللہ رب العزت کی محبت اور قرب کو پانا چاہتا ہو، اُس کے لیے گفتگو پر ضبط کا ہونا بہت ضروری ہے۔

ضبطِ کلام کے تین ضابطے

اکیسویں صدی کے اندر زندگی اور زندگی کے تقاضے جتنے پیچیدہ ہو چکے ہیں اور معاملاتِ حیات

جتنے الجھ چکے ہیں اُن میں ایک عام انسان سے یہ توقع رکھنی تو مشکل ہے کہ وہ زبان کے معاملے میں سخت احتیاط کرتے ہوئے ہر قسم کی زائد گفتگو سے اپنے آپ کو بچالے۔ تاہم یہاں ذیل میں تین ضابطے دیئے جا رہے ہیں جن پر عمل کر کے زبان کی آوارگیوں کو کافی کم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا ضابطہ

بیداری سے لے کر طلوع آفتاب تک اور نمازِ عشاء کی ادائیگی سے سونے تک حتی الوسع خاموشی اختیار کرے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ اول الذکر وقت سے دن کا آغاز ہوتا ہے اور مؤخر الذکر وقت پر دن کا اختتام ہوتا ہے۔ اور کسی معاملے کا آغاز اور اختتام جب صبح ہو جائے تو پھر درمیان کے صحیح ہونے کے امرکات خاصے روشن ہو جاتے ہیں۔ بعد از نمازِ عشاء خود حضور ﷺ کے حوالے سے بھی آتا ہے کہ آپ ﷺ خاموشی اختیار فرمایا کرتے تھے۔

تاہم خاموشی کا مطلب بالکل لبوں کو سی لینا نہیں ہے۔ بلکہ فضول اور زائد از ضرورت گفتگو سے مکمل اجتناب کرتے ہوئے ضروری باتوں پر اکتفا کرنا ہے۔ اس میں بھی اہل علم نے میزبان کے لیے مہمان کے ساتھ اور خاوند کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ گفتگو کی گنجائش رکھی ہے۔

دوسرا ضابطہ

سارا دن کی گفتگو میں یہ احتیاط کرے کہ گفتگو ٹھہر ٹھہر کر، تخیل کے ساتھ الفاظ کو ادا کرتے ہوئے کرے۔ اس سے انسان کی گفتگو اُس کے قابو میں رہتی ہے۔ جلدی جلدی اور تیز بولنے سے گفتگو کا حُسن بھی خراب ہو جاتا ہے اور وہ انسان کے ضبط میں بھی نہیں رہتی ہے۔ کیونکہ جلد بازی میں نفس اور شیطان کا عمل دخل بھی آ جاتا ہے۔

تیسرا ضابطہ

تیسرا ضابطہ یہ ہے کہ انسان بُری صحبتوں، سنگتوں اور مجلسوں میں جانے سے حتی الوسع احتیاط کرے۔ فضول، بے کار اور بے مقصد زندگی گزارنے والوں کے پاس بیٹھنے سے ممکن حد تک اجتناب کرے۔ کیونکہ صحبت کے اثرات مسلمہ ہیں۔ انسان جس قسم کے لوگوں کے پاس بیٹھتا ہے اسی قسم کی اُس کی اپنی طبیعت بھی بننا شروع ہو جاتی ہے۔ آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

الرجل علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل الیه. (۳۲)

"آدمی اپنے دوست کے مذہب پر ہوتا ہے۔ پس ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس قسم کے لوگوں سے دوستی لگا رہا ہے۔"

لہذا اپنے اختیار کی حد تک یہ کوشش ہونی چاہیے کہ بُری صحبتوں سے بچ کر اچھی صحبتوں میں بیٹھے تاکہ اچھی باتیں سنے اور اچھی باتیں کرنے کا موقع ملے۔ مندرجہ بالا تینوں باتوں کو اپنانے سے انشاء اللہ العزیز گفتگو پر ضبط حاصل ہونا شروع ہو جائے گا اور بے شمار لغزشوں سے بچنا ممکن ہو جائے گا۔

(iii) اقامتِ صلوة

ضبطِ نفس کو حاصل کرنے اور زندگی کی آوارگیوں کو کم کر کے مثبت، تعمیری اور صحت مند بنیادوں پر شخصیت کی تشکیل کا تیسرا نکتہ اقامتِ صلوة ہے جو اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایمان کے بعد عملی ارکان میں سے پہلا عظیم الشان رکن ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب نماز انتہائی اہم عبادت ہے تو ضبطِ نفس کے لائحہ عمل میں اسے پہلے نمبر پر ہونا چاہیے تھا۔ تیسرے نمبر پر کیوں رکھا گیا؟ جواب یہ ہے کہ پہلے دونوں چیزوں (ضبطِ طعام + ضبطِ کلام) کی حیثیت پرہیز کی ہے جب کہ اقامتِ صلوة کی حیثیت علاج (دوا) کی ہے اور یہ اصول مسلمات میں سے ہے کہ پرہیز علاج پر مقدم ہے اس لیے یہ ترتیب اپنائی گئی ہے اور ویسے بھی یہ مشاہدے کی بات ہے کہ ضبطِ طعام اور ضبطِ کلام کے دو اصولوں کو اپنائے بغیر وہ نماز پڑھی ہی نہیں جاسکتی جس کو حضور ﷺ نے مومن کی معراج اور اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔ اس لیے مذکورہ بالا ترتیب کو اپنایا گیا۔

اس نماز کی اہمیت کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کے آغاز میں ہی فرمایا گیا۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيَقِيْمُوْنَ
الضَّلُوٰةَ. (۳۵)

"اس کتاب میں کوئی شک نہیں یہ ہدایت ہے متقین کے لیے وہ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں۔"

یہاں ایمان کے فوراً بعد کسی اور عمل کا ذکر آنے سے پہلے نماز کا بیان کیا جانا واضح کرتا ہے کہ

اسلام میں نماز کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن و حدیث میں جتنی اہمیت اس عمل کی بیان کی گئی ہے اور جتنا زور اس پر دیا گیا ہے کسی اور عمل اور عبادت پر نہیں دیا گیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

لکل شیء عمود وعمود الدین الصلوة. (۳۶)

"ہر چیز کے لیے ستون ہوتا ہے اور دین (کی عمارت) کا ستون نماز ہے۔"

الصلوة عماد الدین فمن اقامها فقد اقام الدین و من ترکها فقد هدم الدین. (۳۷)

"نماز دین کا ستون ہے، پس جس نے اسے قائم کیا اُس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اسے ترک کیا اُس نے دین کو گرا دیا۔"

آخرت کے اندر بھی نجات اور بخشش کا دار و مدار نماز کے درست ہونے پر ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ

اول ما يحاسب به العبد يوم القيمة من عمله صلوته فان صلحت فقد افلح و انجح وان فسدت فقد خاب و خسر. (۳۸)

"قیامت والے دن بندہ سے سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا۔ پس اگر یہ درست ہوئی تو وہ فلاح اور نجات پا جائے گا اور اگر اس میں بگاڑ ہو تو وہ ناکام و ناکام ہو جائے گا۔"

من ترک الصلوة متعمدا فقد کفر. (۳۹)

"جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی پس اُس نے کفر کیا۔"

بین العبد و بین الکفر ترک الصلوة. (۴۰)

"بندہ مومن اور کافر کے فردر میان فرق نماز کے ترک کرنے کا ہے۔"

لا ایمان لمن لا صلوة له. (۴۱)

"جو شخص نماز نہیں پڑھتا اُس کا ایمان ہی نہیں ہے۔"

مندرجہ بالا احادیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ نماز زندگی کا مرکز و محور ہے جس کے گرد ایمانی زندگی گھوم رہی ہے۔ ایمانی زندگی کا آغاز بھی نماز سے ہوتا ہے اور اُس کے تمام صلاح و فساد کا دار و مدار بھی نماز پر ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا فاروق اعظم نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنے عمال کے نام خط میں تحریر فرمایا تھا کہ

ان اہم امورکم عندی الصلوٰۃ من حفظها او حافظ علیہا حفظ دینہ و من ضیعہا فہو لما سواہا اضیع۔ (۳۲)

"تمہارے تمام امور میں سے میرے نزدیک سب سے اہم ترین عمل نماز کا ہے جس نے اس کی حفاظت کر لی اُس نے بقیہ دین کی بھی حفاظت کر لی۔ جس نے اسے ضائع کر دیا وہ بقیہ دین کو اس سے بھی زیادہ ضائع کرنے والا ہے۔"

حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ نماز ہی ہے جو انسانی کردار کی کمزوریوں اور خامیوں پر قابو پا کر اُس کی سیرت و کردار میں ٹھوس تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ قرآن مجید کے اندر نماز کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ (۳۳)

"بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے درکتی ہے۔"

فحشا اور منکر کے دو الفاظ اتنے جامع ہیں کہ اخلاقی بگاڑ کی تقریباً جملہ صورتیں ان کے اندر آ جاتی ہیں۔ چنانچہ نماز کے اندر یہ خاصیت ہے کہ یہ انسان کے اخلاقی بگاڑ کی تمام جہتوں کو درست کر سکے اور نماز کی یہ خاصیت اتنی یقینی ہے کہ حدیث نبوی ﷺ مطابق وہ نماز، نماز ہی نہیں ہے جس پر مندرجہ بالا اثرات مرتب نہ ہو رہے ہیں۔

من لم تنہ صلواتہ عن الفحشاء و المنکر فلا صلواتہ لہ۔ (۳۴)

"جس شخص کی نماز اُسے بے حیائی اور برائی سے نہ روکے تو اُس کی نماز ہی نہیں ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ وہ صورتہ تو نماز پڑھ رہا ہے لیکن اُس کی نماز میں کوئی نہ کوئی ایسی کمی ضرور ہے جو نماز کی روح اور حقیقت کو پیدا نہیں ہونے دے رہی، اور نماز کے حقیقی ثمرات اُسے حاصل نہیں ہو رہے۔

نماز کے حوالے سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ قرآن مجید نے نماز پڑھنے کی بجائے قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس میں بطور خاص دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔

ایک تو یہ کہ اگر لفظ پڑھنے کا استعمال کیا جاتا تو اس کا مطلب یہ لیا جاسکتا تھا کہ محض ایک مرتبہ یا چند مرتبہ پڑھ لی ہے تو کافی ہے۔ لیکن قیام کا لفظ اپنے اندر ثبات اور دوام کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ یعنی نماز ایک ایسا عمل ہے جو زندگی بھر پر محیط ہے اور اسے جاری و ساری رہنا ہے۔ دوسرا فرق پڑھنے اور قائم کرنے میں یہ بیان کیا گیا کہ اگر محض پڑھنا کہا گیا ہوتا تو اس سے مراد محض پڑھنا لیا جاتا۔ جیسے بھی پڑھ لی لیکن قائم کرنے کے مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ نماز کو تمام ظاہری اور باطنی آداب، شرائط اور تقاضوں کے ساتھ ادا کرنا ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ آج ہماری نمازیں بے اثر کیوں ہو گئی ہیں۔ اور آج ہماری مسجد والی زندگی اور معاشرتی زندگی میں اتنا تضاد کیوں آ گیا ہے کہ ہم جب مسجد میں ہوتے ہیں تو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں جھک رہے ہوتے ہیں اور اُس کی بارگاہ میں پیمانِ عہد و وفا باندھ رہے ہوتے ہیں اور اُس کی بندگی کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن جب باہر آتے ہیں تو وہاں مکمل طور پر نفس کے بندے بن جاتے ہیں اور اللہ رب العزت کی رضا کو ایک طرف رکھتے ہوئے اپنے ذوق اور خواہشات پر عمل کرتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نماز کی حرکات و سکنات اور الفاظ و کلمات کو عموماً زندہ اور بیدار شعور کے ساتھ ادا نہیں کرتے بلکہ ایک رسم اور عادت کے طور پر بجا لاتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُس کے جو اثرات قلب و باطن اور شخصیت و کردار پر مرتب ہونا چاہئیں تھے وہ نہیں ہو پاتے۔

نماز کے دینی اور ایمانی پہلو سے ہٹ کر بھی دو ایسے پہلو ہیں کہ اُن جہتوں سے بھی نماز ایک عظیم الشان عمل بن جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ آج کی دنیا میں جسمانی و ذہنی صحت (Fitness) کے لیے ورزش کو ایک لازمی عنصر قرار دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مختلف افراد کے لیے اُن کی عمر، جنس اور جسمانی حالت کے مطابق مختلف قسم کی ورزشیں ترتیب دی جاتی ہیں۔ لیکن نماز کے حوالے سے یہ بات کسی بھی قسم کی مبالغہ آرائی کے بغیر کہی جاسکتی ہے کہ یہ ایک ایسی ورزش ہے جو ہر عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو نماز کے علاوہ شاید ہی دنیا کی کسی ورزش میں اس

انداز میں پائی جاتی ہو۔ دوسری بات یہ کہ آج کی دنیا میں نفسیاتی امراض کا بہت چرچا ہے اور ان کے حل کے لیے جو طریقہ ہائے علاج ہیں ان کے اندر ایک نمایاں اہمیت کا حامل مراقبہ ہے۔ مراقبہ کی بہت ساری قسمیں ہیں اور آج مغرب اور یورپ کے ممالک میں بڑی فراوانی کے ساتھ مراقبہ کو نفسیاتی امراض کے علاج کے لیے اختیار کیا جا رہا ہے۔ جب ہم نماز کا مراقبہ والی جہت سے جائزہ لیتے ہیں تو یہاں پھر مراقبہ کی تھیوری اور اس کی مختلف اقسام کو دیکھ کر ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ نماز مراقبہ کی بہترین عملی شکل ہے جو تمام افراد کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ لیکن مذکورہ بالا دونوں جہتوں سے بھی نماز کے اثرات کو مکمل طور پر حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نماز محض پڑھنے کے درجے میں نہ ہو بلکہ اقامت کے درجے میں ہو۔

اقامتِ صلوٰۃ کے تین ضابطے

نماز کے حوالے سے اب تک کی ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تعمیرِ شخصیت کے اندر نماز کے کردار کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے تعمیرِ شخصیت میں مؤثر عامل کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے اگر نماز کو صحیح معنوں میں اقامت کے درجے میں لیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کے تقاضے کیا ہیں؟ اس حوالے سے جو کچھ اولیاء و صوفیاء نے کہا اور کر کے دکھایا وہ سب کچھ تو آج کے دور کے عام انسان کے لیے کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے اور نہ اس کی توقع رکھنی چاہیے۔ تاہم Something is better than nothing کے اصول کے مطابق عام آدمی بھی نماز پر کچھ محنت کر کے اسے کافی بہتر بنا سکتا اور اس کے اثرات سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کافی مدد تو ضبطِ طعام اور ضبطِ کلام سے انسان کو مل سکتی ہے۔ اگر ان دو اصولوں کو انسان اچھی طرح سے اپنالے تو قلب و باطن میں کافی ٹھہراؤ آجاتا ہے اور ذہنی یکسوئی اور ارتکاز بڑھ جاتا ہے جس سے نماز میں دھیان کو مرکوز رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس حوالے سے مندرجہ ذیل تین ضابطوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر نماز کے معیار کو کافی بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

پہلا ضابطہ

پہلا ضابطہ یہ ہے کہ نماز کو ایک عظیم الشان عمل سمجھتے ہوئے، اسے مکمل اہمیت دیتے ہوئے حتیٰ الوسع وقت کی پابندی کے ساتھ باجماعت ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس حوالے سے خاص احتیاط یہ کی جائے کہ اذان کی آواز کان میں پڑتے ہی تمام سرگرمیوں (Activities) کو سمیٹ کر نماز کے لیے

تیاری شروع کر دی جائے۔ تاکہ ذہن آہستہ آہستہ نماز کے لیے تیار ہونا شروع ہو جائے اور نماز کے اثرات کو جذب کرنے کے قابل ہونے لگے۔ وجہ یہ ہے کہ دنیوی مصروفیات میں کھو کر اُن کے جو اثرات قلب و باطن پر مرتب ہوتے ہیں اُن سے یکدم ذہن کو خالی کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ لہذا اگر انسان بھاگم بھاگ وقت بے وقت نماز ادا کرنے جائے تو اُس کے لیے فوری طور پر ممکن ہی نہیں ہوتا کہ وہ ذہن کو تمام دنیوی خیالات سے خالی کر کے نماز کی طرف لگا دے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جسم مصلے پر ہوتا ہے اور ذہن دنیا کے دھندوں میں الجھا ہوا ہوتا ہے۔ لہذا نماز سے پہلے نماز کے لیے تیاری بہت ضروری ہے اور اُس کے لیے آخری حد اذان کی آواز ہے کہ اُسے سنتے ہی تمام مصروفیات کو چھوڑ کر نماز کی طرف رجوع کرے۔

دوسرا ضابطہ

دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ نماز کے اندر جسم کو سیدھا رکھنا اور نگاہوں کو ایک نکتے پر مرکوز رکھنا۔ یہ دونوں باتیں نماز کے اندر یکسوئی پیدا کرنے کا بہت اہم ذریعہ ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جب جسم ڈھیلا ڈھالا ہوگا یا بل جھل رہا ہوگا تو خیالات میں بھی ڈھیلا پن آجائے گا۔ اسی طرح جب نگاہیں بھی ایک نکتے پر مرکوز نہ ہوں تو خیالات کو بھی ایک نکتے پر مرکوز رکھنا بہت مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے نماز کی مختلف حالتوں میں نگاہوں کو مرکوز کرنے کے مختلف پوائنٹس مقرر کئے ہیں۔ اُن کا مقصد یہی ہے کہ نگاہوں کے ارتکاز کے ذریعے خیالات کو مرتکز کیا جائے۔ نیز نماز کے اندر خواہ مخواہ ہلنے جلنے اور بغیر کسی اشد مجبوری کے ہاتھوں کو حرکت دینے کو ناپسند کیا گیا ہے۔ اس میں فلسفہ یہی ہے کہ جتنا زیادہ جسم سکون کی حالت میں ہوگا اتنا ہی خیالات میں یکسوئی پیدا کرنا آسان ہو جائے گا۔

تیسرا ضابطہ

تیسرا ضابطہ یہ ہے کہ نماز میں پڑھے جانے والے الفاظ کے معانی یاد کیے جائیں اور الفاظ کو رٹے رٹائے انداز میں دو کے پہاڑے کی طرح پڑھنے کی بجائے معانی کی طرف دھیان کرتے ہوئے تفکر و تدبیر کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اس میں ایک خاص راز یہ بھی ہے کہ انسانی ذہن ایک ہی وقت میں دو مختلف چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا جب ذہن الفاظ اور اُن کے معانی کے متعلق سوچ رہا ہوگا تو اُس کے لیے ارد گرد کے آوارہ خیالات میں بھٹکنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا تینوں ضابطوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو نماز کا معیار بہتر ہو سکتا ہے اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات کافی بڑھ سکتے ہیں۔

خلاصہ کلام

ضبطِ نفس کے مندرجہ بالا تینوں اصول انسانی زندگی میں اخلاقی حسنہ کی عمارت کی تشکیل کے لیے بنیادوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے اوپر اچھے اخلاق کی عمارت آسانی کے ساتھ تعمیر کی جا سکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان پر عمل کرنے سے ایک طرف تو انسان کے اندر آہستہ آہستہ ضبطِ نفس بڑھتی چلی جاتی ہے جس سے وہ اندرونی و بیرونی طور پر مضبوط سے مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے لیے اپنے اندر کے منفی جذبات، خیالات اور خواہشات و رجحانات پر قابو پانا اور طبیعت کو عقل اور عقل کو وحی کے تابع کرنا آسان ہوتا چلا جاتا ہے جو کہ شریعت کا مقصود ہے۔ دوسری طرف اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے انسانی زندگی کی آوارگیاں کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں انسان کے لیے اپنی صلاحیتوں، توانائیوں اور استعدادوں کو دریافت کرنا، بہتر بنانا اور انہیں اپنی اور اپنے ماحول کی اصلاح کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کرنا آسان ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں کو نظر انداز کر کے اخلاقی تعلیمات کی حیثیت خوبصورت فلسفوں سے زیادہ نہیں رہ جاتی جو ذہنوں اور زبانوں پر تو ہوتے ہیں لیکن عمل کا حصہ نہیں بن پاتے اور زندگی قول اور فعل کے تضاد کا شکار ہو کر بے سکونی و بے اطمینانی کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔

ان اصولوں کے حوالے سے دو باتیں اہم ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں ترتیب بہت اہم ہے۔ پہلا ضابطہ دوسرے کے لیے زینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور دوسرا تیسرے کے لیے زینے کا کام دیتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے یعنی یہ تینوں آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ کسی بھی ایک پر عمل دوسروں کی تقویت کا باعث بنتا ہے۔ اور اس طرح ان تینوں کے اجتناب سے تعمیرِ شخصیت کا ایک ایسا تاج تعمیر ہوتا ہے جسے انسان اپنے سر پر سجا کر اپنی شخصیت کے حسن اور دلکشی میں اضافہ کر سکتا ہے اور اپنی دنیا و آخرت کو سنوار سکتا ہے، جو کہ اسلام اور ایمان کا مقصود ہے۔

حواشی

- ۱۔ الذاریات، ۵۶:۵۱
- ۲۔ آلوسی، روح المعانی فی سبع المثانی، ۲۵/۴۷
- ۳۔ البقرہ، ۱۳۷:۲
- ۴۔ مبارک پوری، تحفۃ الاحوذی، ۲۹/۶
- ۵۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم: ۴۰۵۷۱، ۱۰/۱۹۱
- ۶۔ الاعراف، ۱۷۲:۷
- ۷۔ بخاری، الصحيح، رقم: ۱۳۱۹، ۱/۳۶۵
- ۸۔ المزمل، ۱۹:۷۳
- ۹۔ البقرہ، ۱۲۹:۲
- ۱۰۔ الجمعہ، ۲:۶۲
- ۱۱۔ الجاثیہ، ۲۳:۴۵
- ۱۲۔ النساء، ۱۳۵:۲
- ۱۳۔ الشمس، ۱۰، ۹:۹۱
- ۱۴۔ لدھیانوی، برکت علی، ابوانیس محمد، مکشوفات منازل احسان، المعروف بہ مقالات حکمت، ۳۲۷/۱
- ۱۵۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۸۵
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶۹
- ۱۷۔ النساء، ۱۰:۳
- ۱۸۔ آزدی، ربیع بن حبیب بن عمر بصری۔ الجامع الصحیح مسند الإمام الربیع بن حبیب۔ دار الحکمة، بیروت، ۱۳۱۵ھ، رقم ۱۰۹۳۱/۱، ۳۶۳۱
- ۱۹۔ عینی، بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد بن موسیٰ بن احمد بن حسین بن یوسف بن محمود (۷۲۲-۸۵۵ھ/۱۳۶۱-۱۳۵۱ء)۔ عمدۃ القاری۔ دارالفکر، بیروت، ۱۳۹۹ھ، ۲۷/۲۱
- ۲۰۔ البقرہ، ۱۸۳:۲
- ۲۱۔ بخاری، الصحيح، رقم: ۴۷۷۸، ۵/۱۹۵۰
- ۲۲۔ ایضاً، رقم: ۱۱۲۳، ۱/۳۹۵

- ۲۳۔ ابن حبان، الصحيح، رقم: ۳۶۴۳، ۸/۲۰۴
- ۲۴۔ ترمذی، السنن، رقم: ۴۴۷، ۳/۱۲۲
- ۲۵۔ سلا علی قاری، مرقاة المفاتیح، ۵۳/۹
- ۲۶۔ ہندی، حسام الدین، کنز العمال، رقم: ۴۸۴۴، ۳/۲۱۹
- ۲۷۔ ہیثمی، مجمع الذوائد، ۵۳/۱
- ۲۸۔ الاحزاب، ۳۳: ۴۰، ۴۱
- ۲۹۔ نسائی، احمد بن شعیب (۲۱۵-۲۱۰/۸۳۰-۸۳۰/۸۳۰-۸۳۰)، السنن الکبریٰ۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۱ھ، رقم: ۱۱۳۹۴، ۶/۳۸۲
- ۳۰۔ ہندی، حسام الدین، کنز العمال، رقم: ۴۳۴۶۵، ۱۵/۳۶۷
- ۳۱۔ بخاری، الصحيح، رقم: ۶۱۱۲، ۵/۲۳۷۷
- ۳۲۔ ایضاً، رقم: ۵۶۷۳، ۵/۲۲۴۰
- ۳۳۔ ترمذی، السنن، رقم: ۲۳۱۱، ۲/۶۰۷
- ۳۴۔ ابو داؤد، السنن، رقم: ۴۸۴۳، ۲/۲۵۹
- ۳۵۔ البقرہ، ۲: ۲
- ۳۶۔ ہندی، حسام الدین، کنز العمال، رقم: ۱۸۸۹۰، ۷/۱۱۵
- ۳۷۔ عینی، عمدۃ القاری، ۶/۵
- ۳۸۔ حاکم، المستدرک علی الصحیحین، رقم: ۹۶۵، ۱/۳۹۴
- ۳۹۔ طبرانی، المعجم الاوسط، رقم: ۳۳۴۸، ۳/۳۴۳
- ۴۰۔ ابو داؤد، السنن، رقم: ۴۶۷۸، ۳/۲۱۹
- ۴۱۔ آزدی، مسند الربیع، رقم: ۹۱، ۱/۵۳
- ۴۲۔ عبد الرزاق، ابو بکر بن ہمام بن نافع صنعانی (۱۲۶-۱۲۱/۵۲۱-۵۲۱/۵۲۱)، المصنف۔
- المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ھ، رقم: ۲۰۳۰، ۱/۵۳۶
- ۴۳۔ العنکبوت، ۲۹: ۲۵
- ۴۴۔ آزدی، مسند الربیع، رقم: ۹۵۴، ۱/۳۶۷

اطراف الآیات

نمبر شمار	آیات	سورت	آیت نمبر	صفحہ
۱	اهدنا الصراط المستقیم	الفاتحہ	۵	۳۱۴، ۸۵
۲	هدی للمتقین	البقرہ	۲	۳۱۵
۳	الذین یؤمنون بالغیب	//	۳	۳۲۸
۴	قالوا لن تمسنا النار	//	۱۸	۳۱۴
۵	صمى بكم عمى	//	۲۶	۲۰۳
۶	ان الله لا يستحی	//	۲۹	۲۲۰
۷	هو الذى خلق لكم	//	۳۰	۵۸
۸	اذ قال ربك للملكة	//	۳۱	۵۸
۹	وعلم ادم الاسماء كلها	//	۳۸	۲۸۵
۱۰	فاما ياتينكم منى هدى	//	۸۰	۱۵
۱۱	يا ايها الذين امنوا لا تقولوا	//	۱۰۴	۲۰۵
۱۲	يعرفونه كما يعرفون	//	۱۳۷	۲۴۷، ۸۶
۱۳	وكذلك جعلنكم	//	۱۴۳	۲۶۸
۱۴	صبغة الله و من احسن	//	۱۴۶	۳۳۳
۱۵	ربنا و ابعث فيهم رسولا	//	۱۴۹	۳۳۷
۱۶	ان الله مع الصابرين	//	۱۵۳	۳۰۹

۲۸	۱۵۵	البقرہ	ولنبلونکم بشیء من الخوف	۱۷
۱۰۳	۱۶۵	//	ومن الناس من يتخذ	۱۸
۳۳۱	۱۸۳	//	يا ايها الذين امنوا كتب	۱۹
۳۰۷	۱۸۵	//	يريد الله بكم اليسر	۲۰
۹۲	۱۸۷	//	هن لباس لکم	۲۱
۵۵	۱۹۳	//	وقاتلوهم حتى لا تكون	۲۲
۲۷۱	۲۳۷	//	زاده بسطة في العلم	۲۳
۲۳۰	۲۵۳	//	تلك الرسل فضلنا	۲۴
۵۰	۲۸۶	//	لا يكلف الله نفساً	۲۵
۳۲۶، ۵۲	۲۸۶	//	لها ما كسبت و عليها	۲۶
۱۰۳	۱۳	ال عمران	زين للناس حب الشهوات	۲۷
۲۳۶	۶۳	//	قل يا اهل الكتب تعالوا	۲۸
۲۳۶	۱۰۳	//	واعتصموا بحبل الله جميعا	۲۹
۳۰	۱۳۳	//	والكاظمين الغيظ	۳۰
۳۳	۱۳۹	//	لا تهنوا ولا تحزنوا	۳۱
۲۱۶	۱۵۹	//	فيما رحمة من الله	۳۲
۳۹	۱۹۹	//	خذوا لعفو و امر بالعرف	۳۳
۹۳	۵	انشاء	والا توترو السفهاء امرالکم	۳۴
۳۳۹	۱۰	//	ان الذين يا كلون اموال	۳۵

۳۲	۳۲	النساء	لا تتمنوا ما فضل الله	۳۶
۶۱	۱۲۳	//	ليس بامانيكم ولا امانى	۳۷
۳۳۸	۱۳۵	المائدہ	فلا تتبعوا الهوى	۳۸
۲۳۵	۲	//	وتعاونوا على البر والتقوى	۳۹
۲۳۷	۹۱	//	انما يريد الشيطان ان يوقع	۴۰
۱۶	۳۸	//	ما فرطنا في الكتاب	۴۱
۱۵	۵۹	//	لا رطب ولا يابس	۴۲
۱۰۴	۷۹	الانعام	انى وجهت وجهى للذى	۴۳
۷۹	۱۱۶	//	وان تطع اكثر من	۴۴
۱۰۵	۱۶۲	//	قل ان صلواتى ونسكى	۴۵
۳۳۴	۱۷۲	الاعراف	واذا اخذ ربك من بنى ادم	۴۶
۲۰۴	۱۷۹	//	لهم قلوب لا يفقهون بها	۴۷
۴۸	۱۷۹	//	اولئك كالا نعام بل هم اضل	۴۸
۲۳۲	۶۴	الانفال	يا ايها النبى حسبك الله	۴۹
۷۳	۶۷	//	تريدون عرض الدنيا	۵۰
۱۰۳	۲۴	التوبة	قل ان كان اباءكم وابناءكم	۵۱
۴۰	۲۷	يونس	جزاء سيئة سيئة مثلها	۵۲
۳۲۷، ۱۵۰، ۶۰	//	الزمر	ان الله لا يغير ما بقوم	۵۳
۳۰۸	۷	ابراهيم	لئن شكرتم لازيدنكم	۵۴

۵۹	۲۰	الحجر	ولقد مکنکم فی الارض	۵۵
۳۲۲، ۲۹۲	۲۹	//	فاذا سویتہ و نفخت	۵۶
۳۰۸	۱۱۳	النحل	واشکرو انعمۃ اللہ	۵۷
۲۱۵	۱۲۵	//	ادع الی سبیل ربک	۵۸
۷۲	//	بنی اسرائیل	کان الا نسان عجولا	۵۹
۲۰۳	۳۶	//	ان السمع والبصر والفؤاد	۶۰
۲۹۰	۷۰	//	ولقد کرمنابنی ادم	۶۱
۸۳	۸۳	//	قل کل یعمل علی	۶۲
۳۲۵	۱۳، ۱۳	الکہف	قل هل ننبئکم بالاحسرين	۶۳
۸۰	۲۸	//	والا تطع من اغفلنا قلبه	۶۴
۲۲۳	۹۶	مریم	ان الذین امنوا و عملوا	۶۵
۲۱۷	۳۳	طہ	فقولا له قولا لينا	۶۶
۱۹۰	۱۰۷	الانبياء	وما ارسلناک الا رحمة	۶۷
۲۰۳	۳۶	الحج	فانہا لا تعمی الابصار	۶۸
۱۷۱	۸	المومنون	والذین ہم لاماناتہم	۶۹
۱۶۵	۲۶	النور	الخبیثون للخبیثت والطیون	۷۰
۱۴۰	۷۲	الفرقان	واذا مروا باللغو مروا	۷۱
۲۷۱، ۱۸۶	۲۶	القصص	ان خیر من استاجرت	۷۲
۳۵۰، ۲۶	۳۵	العنکبوت	ان الصلوة تنہی	۷۳

۳۲۵	۶۳	العتکبوت	وما هذه الحیوة الدینا	۷۴
۹۲	۲۱	الروم	لتسکنوا الیها	۷۵
۵۸	۲۰	لقمان	و سخر لکم ما فی السموات	۷۶
۵۹، ۱۶	۲۱	ب	لقد کان لکم فی رسول اللہ	۷۷
۳۲۲	۷۱، ۷۰	//	یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ	۷۸
۴۷	۷۲	//	انا عرضنا الا مائة علی السموات	۷۹
۳۰۳	۲۸	الفاطر	انما بخش اللہ من	۸۰
۳۰۲	۴۶	یس	سبحن الذی خلق الأزواج	۸۱
۵۷	۷۵	ص	خلقت بیدی	۸۲
۳۰۳	۹	الزمر	قل هل یتوی الذین	۸۳
۳۰۹	۱۰	//	انما یوفی الصابرون	۸۴
۳۰۷	۵۳	//	لا تقنطوا من رحمة اللہ	۸۵
۱۴۰	۳	المومنون	والذین ہم عن اللغو	۸۶
۵۰	۲۴	//	وافوض امری الی اللہ	۸۷
۳۲۶	۲۶	حم السجدة	من عمل صالحا فلنفسه	۸۸
۳۲۰	۵۳	//	سنریہم ایتنا فی الافاق	۸۹
۴۰	۱۳۳	//	لا تستوی الحسنہ ولا السینة	۹۰
۳۲۶	۳۰	الشوری	وما اصابکم من مصیبة	۹۱
۲۴۰	۳۲	الزخرف	نحن قسمنا بینہم معیشتهم	۹۲

۳۳۸	۲۳	الحلیۃ	افراء یت من اتخذ	۹۳
۱۷۷	۲۹	الفتح	محمد رسول الله والذین	۹۴
۳۱۵	۶	الحجرات	یا ایہا الذین امنوا ان جاءکم	۹۵
۱۶۱	۱۰	//	انما المؤمنون اخوة	۹۶
۲۹۰	۱۳	//	ان اکرمکم عند الله اتقکم	۹۷
۳۲۰	۲۱	الذاریات	و فی انفسکم افلاتبصرون	۹۸
۳۳۲، ۱۱۱	۵۶	//	وما خلقت الجن والانس	۹۹
۷۹	۲۳	النجم	ان یتبعون الا الظن	۱۰۰
۱۳۹، ۶۰	۳۹	//	لیس للانسان الا ما سعی	۱۰۱
۳۰۸	۱۶	الرحمن	فبای الا ربکما تکذبن	۱۰۲
۱۰۷	۲۶	//	کل من علیہا فان	۱۰۳
۲۳۸	۲۹	//	کل یوم هو فی شان	۱۰۴
۳۹	۳۲	الحمد	لکیلاتا سوا علی ما فاتکم	۱۰۵
۳۰۳، ۲۸۵	۱۱	الحجرات	یرفع الله الذین امنوا	۱۰۶
۷۵	۱۸	الحشر	یا ایہا الذین امنوا تقوا الله	۱۰۷
۱۶۱	۳	الصف	ان الله یحب الذین یقاتلون	۱۰۸
۳۳۷	۲	الجمعة	هو الذی بعث فی الامیین	۱۰۹
۱۰۶	۱۴	التغابن	یا ایہا الذین امنوا ان من	۱۱۰
۹۵	۱۵	//	انسا اموالکم و اولادکم	۱۱۱

۴۳	۷	الطواق	سیجعل الله بعد عسر يسراً	۱۱۲
۵۱	۲	التريم	يا ايها الذين امنوا عليكم	۱۱۳
۲۰۵	۳	التد	وانك لعلى خلق عظيم	۱۱۴
۳۳۳	۱۹	التد	ان هذه تذكرة فمن	۱۱۵
۴۶	۱۴	التد	بل الا انسان على نفسه بصيرد	۱۱۶
۲۸۱	۹	التد	وجعلنا نومكم سباتا	۱۱۷
۱۵۰	۲۱، ۲۰	التد	واما من خاف مقام	۱۱۸
۱۴۹	۶	الاشراق	يا ايها الانسان انك كادح	۱۱۹
۷۲	۱۶	الاشراق	بل توثرون الحيوۃ الدنيا	۱۲۰
۲۹۴	۳۰-۲۷	الاشراق	يايتها النفس المطمئنة	۱۲۱
۱۳۹	۴	الاشراق	لقد خلقنا الانسان في كبد	۱۲۲
۴۶	۸	الاشراق	فالهيميا فجوهرها وتقوٰها	۱۲۳
۳۳۸	۱۰، ۹	//	قد افلح من زكها	۱۲۴
۲۶۹	۴	الاشراق	وللاخرة خير لك من الاولى	۱۲۵
۴۳	۶، ۵	الاشراق	فان مع العسر يسرا	۱۲۶
۳۲۱	۴، ۳، ۲، ۱	الاشراق	والتين والزيتون	۱۲۷
۵۷	۴	//	لقد خلقنا الانسان في	۱۲۸
۳۰۳	۱	الاشراق	اقرب اسم ربك الذي	۱۲۹
۱۱۱	۵	الاشراق	وما امر و الا ليعبدوا	۱۳۰

۹۴	۸	الغدیرت	وانه لحب الخیر لشدید	۱۳۱
۱۳۴	۲۴۱	العصر	والعصر ان الانسان	۱۳۲
۱۸۴	۶	الکفرون	لکم دینکم ولی دین	۱۳۳

اطراف الاحادیث

صفحہ	احادیث	نمبر شمار
۲۳۳	اختلاف امتی رحمة	۱
۱۱۷	اخلاص دینک یکفک	۲
۳۱۱	أدعو الله وانتم	۳
۳۲۳	إذا أصبح ابن آدم	۴
۳۱۰، ۳۲	إذا نظر أحدكم إلى من	۵
۳۰۳	اطلبوا العلم من المهد	۶
۲۸۵	اطلبوا العلم ولو	۷
۲۱۹	اعطيت جوامع الكلم	۸
۱۳۳	اغتنم خمسا قبل خمس	۹
۲۳	افضل العبادۃ انتظار	۱۰
۲۹۰	اکرموا اولادکم واحسنوا	۱۱
۳۲۵	الا اخبرک بملاک ذلك	۱۲
۸۳	الا ان فی الجسد	۱۳
۸۲	الانابة من الله	۱۴
۱۳۵	الا یام صحائف اعمارکم	۱۵
۱۲۱	الحلال بین والحرام	۱۶
۸۳	التقویٰ ههنا	۱۷
۲۸۸	التودد الی الناس	۱۸

۱۵۱	الدنيا سجن المؤمن	۱۹
۱۷۷	الدين النصيحة	۲۰
۳۳۷	الرجل على دين	۲۱
۸۲	السمت الحسن والتودة	۲۲
۳۳۹	الصلوة عماد الدين	۲۳
۲۳۷، ۸۶	الكبر بظن الحق	۲۳
۶۱	الكيس من دان نفسه	۲۵
۱۹۷، ۸۶	اللهم ارنا الاشياء كما	۲۶
۱۳۵	اللهم انا نسئلك صلاح	۲۷
۳۰۳	اللهم انى اعوذ بك من علم	۲۸
۱۳۵	اللهم لا تدعنا فى غمرة	۲۹
۷۳	اللهم لا عيش الا	۳۰
۲۷۰	المومن القوى احب	۳۱
۲۳۸	المومن للمومن كالبنیان	۳۲
۱۶۲	المومن مالف ولا تخير	۳۳
۲۱۵	المومن مرءة المومن	۳۳
۲۱۸	امرت ان اتجوز	۳۵
۱۶۹	امرنا ان نكلم الناس	۳۶
۷۳	ان الدنيا مزرعة	۳۷
۳۳۵	ان العبد يتكلم بالكلمة	۳۸
۳۲۲	ان الله تعالى خلق آدم	۳۹

۲۱۶	ان الله رقيق و يحب الرفق	۴۰
۱۵۱	ان الله عز وجل يحب معالي	۴۱
۳۵۰	ان اهم امور كم عندى	۴۲
۸۱	ان فيك لخصلتين	۴۳
۹۵	ان لكل امة فتنه	۴۴
۱۱۶	انما الا اعمال بالنيات	۴۵
۳۳۳	انما بعثت لا تتم	۴۶
۲۳۶	انصر اخاك ظالماً	۴۷
۳۳۲	اوصاني خليلي	۴۸
۳۳۹	اول ما يحاسب به العبد	۴۹
۱۵۱	اياك والتنعيم فان	۵۰
۱۵۱	اية المنافق ثلاث	۵۱
۳۰۹	بشروا ولا تنفروا	۵۲
۳۳۹	بين العبد وبين الكفر	۵۳
۱۵۱	تحفة المؤمن الموت	۵۴
۳۳۳	تخلقوا باخلاق الله	۵۵
۱۶	تركت فيكم امرين	۵۶
۳۳۲	تعرض الاعمال يوم الاثنين	۵۷
۲۰۵	تفكر ساعة خير	۵۸
۳۳۳	جرمه صغير وجرمه	۵۹
۱۵۰	حجبت النار بالشهوات	۶۰

۳۱۲	حسن الظن من العبادۃ	۶۱
۳۶۸، ۲۱۹	خیر الامور اوسطها	۶۲
۱۲۲	دع ما یریبک	۶۳
۱۷۶	امراة اصابت ورجل اخطاء	۶۴
۲۰	صل من قطعک	۶۵
۳۰۳	طلب العلم فریضة	۶۶
۳۱۲	ظنوا المؤمنین خیرا	۶۷
۳۹	عجبا لا مر المومن	۶۸
۶۶	علیک بالصوم فانه	۶۹
۳۲۵	علیک بطول الصمت	۷۰
۴۱	فانا احب ان اکون	۷۱
۲۱۸	کان رسول الله لیحدث	۷۲
۳۲۲	کان رسول ﷺ یتحرى	۷۳
۲۱۸	کان رسول الله یعید	۷۴
۲۱۷	کان کلام رسول الله	۷۵
۳۱۵	کفی بالمرء کذباً	۷۶
۱۷۲	کلکم راع وکلکم	۷۷
۳۳۹	کل لحم نبت	۷۸
۳۳۲	کل مولود یولد	۷۹
۱۱۳	کل میسر لما خلق	۸۰
۱۸	کلمة الحکمة ضالة المومن	۸۱

۳۳۹	لا ایمان لمن لا صلوة له	۸۲
۳۱۱	لا باس علیک طهوراً	۸۳
۴۶	لا تغضب	۸۳
۳۳۶	لا تکثروا الکلام بغير	۸۵
۳۳۰	لا تمیتوا القلب	۸۶
۱۷۱، ۶۷	لا دین لمن لا عهد له	۸۷
۹۹	لا رهبانية فی الاسلام	۸۸
۸۰	لا طاعة لمخلوق	۸۹
۴۶	لا یبلغنی احدکم عن	۹۰
۳۳۳	لا یتقیم ایمان عبد	۹۱
۳۱۰	لا یفرق مومن مومنة	۹۲
۱۸۱، ۱۸۲	لا یومن احدکم حتی یحب	۹۳
۳۱۸	لست منهم	۹۳
۳۳۹	لکل شیء عمود	۹۵
۱۶	لوضاع لی عقال	۹۶
۴۲	ما عاقبت لمن	۹۷
۲۱۷	ماکان رسول الله یرتد	۹۸
۲۷۶	مامن وعاء ملا	۹۹
۲۰۹	مثل المومنین فی توآدهم	۱۰۰
۷۳	من احب دنیا ه اضر	۱۰۱
۱۰۵	من احب لله وابغض لله	۱۰۲

۱۳۳	من استطاع ان يعمل	۱۰۳
۸۸	من استوی یوماہ	۱۰۴
۷۵	من اکیس الناس	۱۰۵
۳۳۹	من ترک الصلوۃ متعمداً	۱۰۶
۱۷۶	من تواضع لله	۱۰۷
۱۱۹	من حسن اسلام المرء	۱۰۸
۳۲۰	من عرف نفسه	۱۰۹
۱۷۰	من قضی لا حد من امتی	۱۱۰
۱۰۷	من کان لله	۱۱۱
۳۲۶	من کان یومن باللہ والیوم الاخو	۱۱۲
۲۳۷	من لا یهتم بامر المسلمین	۱۱۳
۳۵۰	من لم تنه صلواته	۱۱۴
۴	من لم یشکر الناس	۱۱۵
۲۷۱	نعمتان مغبون فیہما	۱۱۶
۴۱	وما انتقم رسول اللہ	۱۱۷
۱۳۵	یا ابن آدم انما انت	۱۱۸
۱۸۸	یا عبادی لو ان اولکم	۱۱۹
۳۳۱	یامعشر الشباب من استطاع	۱۲۰

مصادر و مراجع

- ۱- القرآن الکریم
- ۲- آلبی، ابو الفضل شہاب الدین السید محمود (م ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء)۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی۔ دار احیاء التراث العربی، بیروت، س ن۔
- ۳- ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان کوفی (۱۵۹-۲۳۵ھ/۷۷۶-۸۴۹ء)۔ المصنف۔ مکتبہ الرشید، الرياض، ۱۴۰۹ھ۔
- ۴- ابن حبان، ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان (۲۷۰-۳۵۴ھ/۸۸۳-۹۶۵ء)۔ الصحیح۔ موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۴ھ۔
- ۵- ابن عساکر، ابو قاسم علی بن حسن بن ہبۃ اللہ بن عبد اللہ بن حسین دمشقی (۳۹۹-۵۷۱ھ/۱۱۰۵-۱۱۷۶ء)۔ تاریخ مدینۃ دمشق۔ دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۵ء۔
- ۶- ابن ماجہ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۰۹-۲۷۳ھ/۸۲۴-۸۸۷ء)۔ السنن۔ دار الفکر، بیروت، س ن۔
- ۷- ابوداؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی (۲۰۲-۲۷۵ھ/۸۱۷-۸۸۹ء)۔ السنن۔ دار الفکر، بیروت۔
- ۸- احمد بن حنبل، ابو عبد اللہ بن محمد (۱۶۴-۲۴۱ھ/۷۸۰-۸۵۵ء)۔ المسند۔ موسسۃ قرطب، مصر۔
- ۹- احمد رفیق اختر، پروفیسر، مجموعہ پروفیسر احمد رفیق اختر، سگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء۔
- ۱۰- ارشد جاوید، پروفیسر، کامیاب شخصیت، کیلیفورنیا انسٹیٹیوٹ آف سائیکالوجی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء۔
- ۱۱- اصغہانی، ابو قاسم حسین بن محمد راغب (م ۵۰۲ھ)۔ المفردات۔ دار المعرفۃ، لبنان۔
- ۱۲- ازدی، ربیع بن حبیب بن عمر بصری۔ الجامع الصحیح مسند الإمام الربیع بن حبیب۔ دار الحکمتہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ۔
- ۱۳- الازہری، محمد کرم شاہ، پیر، ضیاء النبی a، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۳ھ۔

- ۱۴۔ بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۳-۲۵۶ھ/۸۱۰-۸۷۰ء)۔ الصحیح۔ دار ابن کثیر الیمامہ، بیروت، ۱۴۰۷ھ۔
- ۱۵۔ بزار، ابو بکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق بصری (۲۱۰-۲۹۲ھ/۸۲۵-۹۰۵ء)۔ المسند۔ موسسۃ علوم القرآن، بیروت، ۱۴۰۹ھ۔
- ۱۶۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۳-۴۵۸ھ/۹۹۳-۱۰۶۶ء)۔ السنن الکبریٰ۔ مکتبہ دارالباز، مکتبہ المکرمۃ، ۱۴۱۳ھ۔
- ۱۷۔ پھلواڑی، شاہ محمد جعفر، ندوی، مولانا، مقالات، مکتبہ امتیاز، راولپنڈی، ۲۰۰۷ء۔
- ۱۸۔ ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمیٰ (۲۱۰-۲۷۹ھ/۸۲۵-۸۹۲ء)۔ السنن۔ دار احیاء التراث العربی، بیروت، س ن۔
- ۱۹۔ ثناء اللہ محمود، مفتی، رسول اکرم a کا اندازِ تربیت، دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۵ء۔
- ۲۰۔ جامی، عبدالرحمن، مولانا، www.iqbal.com.pk/nigahimustafa/?tag=%25D8%25AC%25D8%25A7%25D9%2585%25DB%25BC%258C,26/12/13
- ۲۱۔ حاتمی خلیفہ، مصطفیٰ بن عبد اللہ الحنفی۔ کشف الظنون عن اسامی الکتب والفتون۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ۔
- ۲۲۔ حاکم، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن محمد (۳۲۱-۴۰۵ھ/۹۳۳-۱۰۱۳ء)۔ المستدرک علی الصحیحین۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۱ھ۔
- ۲۳۔ حقی، شان الحق، آکسفورڈ انکشاف اردو ڈکشنری، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، پاکستان، ۲۰۰۷ء۔
- ۲۴۔ خطیب تبریزی، ولی الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ (م ۷۳۱ھ)۔ مشکوٰۃ المصابیح۔ المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۸۵ء۔
- ۲۵۔ رامے، محمد حنیف، اسلام کی روحانی قدریں موت نہیں زندگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

- ۲۶۔ زیدی، علی جواد، انیس کے سلام، (مرتبہ) قومی کونسل برائے فروغِ اُردو، نئو دہلی، ۱۹۹۷ء۔
- ۲۷۔ سعیدی، غلام رسول، علامہ، تذکرۃ المجدِ شین، فرید بک شال، لاہور، ۱۳۹۷ھ، ص ۲۸۶۔
- ۲۸۔ سیوہاروری، محمد حفظ الرحمن، مولانا، اخلاق اور فلسفہٴ اخلاق، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ۱۹۷۶ء۔
- ۲۹۔ طبرانی، سلیمان بن احمد (۲۶۰-۳۶۰ھ/۸۷۳-۹۷۱ء)۔ المعجم الاوسط۔ دار الحرمین، قاہرہ، ۱۴۱۵ھ۔
- ۳۰۔ طبرانی، سلیمان بن احمد (۲۶۰-۳۶۰ھ/۸۷۳-۹۷۱ء)۔ المعجم الصغیر۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۳ھ۔
- ۳۱۔ ظفر علی خاں، مولانا، کلیاتِ مولانا ظفر علی خاں، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۷ء۔
- ۳۲۔ عباسی، ابن الحسن، متاعِ وقت اور کاروانِ علم، مکتبہ عمر فاروق، کراچی، ۱۴۲۲ھ۔
- ۳۳۔ عبد الرزاق، ابو بکر بن ہمام بن نافع صنعانی (۱۲۶-۲۱۱ھ/۷۴۴-۸۲۶ء)۔ المصنف۔ المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ھ۔
- ۳۴۔ عسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳-۸۵۲ھ/۱۳۷۲-۱۴۴۹ء)۔ فتح الباری۔ دار المعرفہ، بیروت، س ن۔
- ۳۵۔ عینی، بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد بن موسیٰ بن احمد بن حسین بن یوسف بن محمود (۷۶۲-۸۵۵ھ/۱۳۶۱-۱۴۵۱ء)۔ عمدۃ القاری۔ دار الفکر، بیروت، ۱۳۹۹ھ۔
- ۳۶۔ غالب، اسد اللہ خان، مرزا، دیوانِ غالب کامل، مرتبہ گپتا رضا کالی داس، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۶ء۔
- ۳۷۔ غزالی، حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد الغزالی (۵۰۵ھ)۔ احیاء علوم الدین۔ (مترجم) مولانا محمد حسنین نانوتوی، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن۔
- ۳۸۔ فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، فرید بک ڈپولمیٹرز، دہلی، ۱۹۸۷ء۔
- ۳۹۔ لدھیانوی، برکت علی، ابو انیس محمد، مکشوفاتِ منازلِ احسان، المعروف بہ مقالاتِ حکمت، دار الاحسان، سالار والا، ۱۳۹۴ھ۔

- ۴۰۔ ماہنامہ دختران اسلام، چیف ایڈیٹر قرۃ العین فاطمہ، دسمبر ۲۰۰۳ء۔
- ۴۱۔ مبارک پوری، ابو العلاء محمد عبد الرحمن بن عبد الرحیم (۱۲۸۳-۱۳۵۳ھ)۔ تحفۃ الاحوذی۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت۔
- ۴۲۔ مسین فاطمہ، پروفیسر ڈاکٹر، غذا اور غذائیت، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۷ء۔
- ۴۳۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۵ء۔
- ۴۴۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۹۰ء۔
- ۴۵۔ محمد طاہر القادری، پروفیسر، ڈاکٹر، خطاب بعنوان ”بے ارادتی اور حقیقت توکل“، آڈیو کیسٹ نمبر ۵۸-۸۰M مئی ۱۹۸۷ء۔
- ۴۶۔ محمد طاہر القادری، پروفیسر، ڈاکٹر، خطاب بعنوان ”آداب طریقت“ (حسن خلق، تقویٰ، مجاہدہ، ترکِ شہوات)، آڈیو کیسٹ نمبر ۲۸/۲-۳ دسمبر ۱۹۸۵ء۔
- ۴۷۔ مسلم، ابن الحجاج قشیری (۲۰۶-۲۶۱ھ/۸۲۱-۸۷۵ء)۔ الصحیح۔ داراحیاء التراث العربی، بیروت، سن۔
- ۴۸۔ مگھالوی، محمد انور، ابو العرفان فقہ حنفی کے اساسی قواعد، مکتبہ زاویہ، لاہور، ۲۰۰۳ء۔
- ۴۹۔ ملا علی قاری، نور الدین بن سلطان محمد ہروی حنفی (م ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۶ء)۔ مرقاۃ المفاتیح۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۲۲ھ۔
- ۵۰۔ ملک غلام مرتضیٰ، ڈاکٹر، خطبات حرم، ملک سنز پبلشرز و بک سیلرز، لاہور، سن۔
- ۵۱۔ میر ولی الدین، ڈاکٹر، قرآن اور تعمیر سیرت، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء۔
- ۵۲۔ مناوی، عبدالرؤف بن تاج العارفین بن علی بن زین العابدین (۹۵۲-۱۰۳۱ھ/۱۵۴۵-۱۶۲۱ء)۔ فیض القدر شرح الجامع الصغیر۔ مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر، ۱۳۵۶ھ۔
- ۵۳۔ نیولین بل، ڈاکٹر، فلسفہ کامرانی اور کامیاب زندگی کے اصول (مترجم)، فلکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۱ء۔
- ۵۴۔ نسائی، احمد بن شعیب (۲۱۵-۳۰۳ھ/۸۳۰-۹۱۵ء)۔ السنن الکبریٰ۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت،

- ۱۴۱۱ھ

- ۵۵۔ نقشبندی، ذوالفقار احمد، پیر، خطبات فقیر، مکتبہ الفقیر، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء، ۱۵/۲۳۲۔
- ۵۶۔ واصف، واصف علی، بات سے بات، کاشف پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء۔
- ۵۷۔ واصف، واصف علی، کرن کرن سورج، کاشف پبلیکیشنز، لاہور۔
- ۵۸۔ واصف، واصف علی، گفتگو، کاشف پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء۔
- ۵۹۔ وحید الدین خاں، مولانا، کتاب زندگی، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۳ء۔
- ۶۰۔ وحید الدین خاں، مولانا، تعمیر حیات، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۳ء۔
- ۶۱۔ وحید الدین خاں، مولانا، اقوال حکمت، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۵ء۔
- ۶۲۔ ہندی، حسام الدین، علاء الدین علی متقی (م ۹۷۵ھ)۔ کنز العمال۔ دارالکتب والعلوم، بیروت،

- ۱۴۱۹ھ

- ۶۳۔ بیٹھی، نور الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر بن سلیمان (۷۳۵-۸۰۷/۱۳۳۵-۱۴۰۵ء)۔ مجمع الزوائد۔ دارالریان للتراث، بیروت، ۱۴۰۷ھ۔

64- Baig, Mirza Ghulam Muhammad, Professor, Current English Dictionary, Ch. Ghulam asool & Sons, Lahore.

65- Dale Carnegie, How To Stop Worrying And Start Living, (Net Book)

<http://esnips.com/UserProfileAction.aspx?id=ebd4ae62-b650-4f30-99a4-376c4d184226>

66- Dale Carnegie, How To Win Friends And Influence People, e-book,

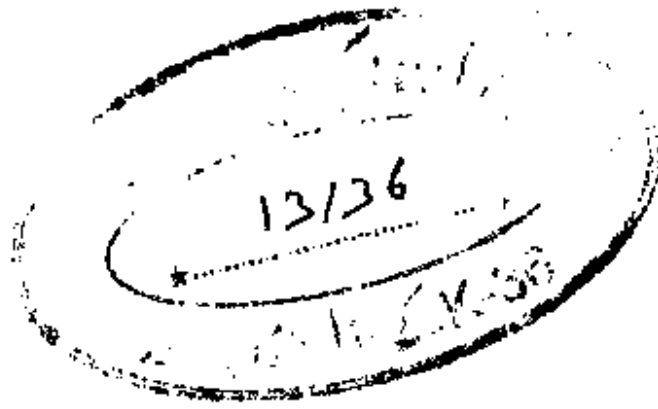
ISBN-0-671-42517-X.

67- Napoleon hill, the law of success in sixteen lessons, the Ralston university press Meriden, conn , 1928.

68- R.N.Munshi, World Famous Quations, Goodwill Publishing House, New Delhi.

69-Sean Covey, The 7 Habits of Highly Effective Teenagers, Simon & Schuster, UK, 2004.

70- Stephen R. Covey, The 7 Habits of Highly Effective People, Simon & Schuster, New York, first edition, 1990.



”الحق لله وحده“
”الحق لله وحده“

عالمی شہرت یافتہ کتب کے مترجم

250/-	اوشو	اُڑان بغیر پروں کے	1
200/-	اوشو	ذہن کی غلامی سے نجات	2
400/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	با اصول لیڈر شپ (سٹیفن آر۔ کووے)	3
300/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	اعتماد کی قوت (سٹیفن آر۔ کووے)	4
250/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	اہم کام پہلے (سٹیفن آر۔ کووے)	5
250/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	کامیابی اور روحانی مسرت (ڈورس پوزی)	6
250/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	الفاظ کا جادو (جے۔ وی۔ سرنی)	7
200/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	ٹال مٹول کی عادات سے نجات (ریٹا ایمٹ)	8
300/-	قیصر چوہان	چارلی چپلن کی آپ بیتی	9
150/-	کینتھ گریگ مترجم: مسعود مفتی	مینار کی پکار	10
150/-	اے۔ پی۔ پریا مترجم: اسد جاوید	کامیابی 30 دنوں میں	11
150/-	امجد جاوید	دنیا پر حکمرانی کیسے کی جاتی ہے	12
500/-	مترجم: احسن بٹ	تم جیت سکتے ہو	13
200/-	مسعود مفتی	کامیابی کے 24 اصول	14
400/-	مترجم: مسعود مفتی	خوابوں کی ڈکشنری	15
240/-	مترجم: مسعود مفتی	شادی اور خوشی	16
300/-	مترجم: مسعود مفتی	موٹاپے سے نجات اور زندگی میں فٹ رہیں	17
300/-	مقصود شیخ	عقلوں کا نچوڑ	18

علم و فن پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور۔

فون: 37352332، 37232336، فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com